مغرب اور عالمِ اسلام

ایک مطالعہ

خرّم مراد

منشورات

مغرب اور عالمِ اسلام

ایک مُطَالعہ

خُرّم مُراد

منشورات

نام کتاب : مغرب اور عالم اسلام: ایک مطالعہ

مصنف : خرم مراد

مرتب : سلیم منصور خالد

طبع اوّل : ۲۰۰۶ء

تعداد : ۱۰۰۰

کوڈ : 00111

ناشر : منشورات، منصورہ، ملتان روڈ، لاہور۔۵۴۷۹۰

فون: 543 4909 - 542 5356

فیکس: 042 - 543 2194

ای میل: manshurat@hotmail.com

مطبع : عرفان افضل پرنٹر، لاہور۔

قیمت : ۱۹۴ روپے

ترتیب

گزارشات

اس وقت کرہ ارضی پر ایک ہمہ پہلو کش مکش برپا ہے۔ مغرب کے موثر طبقوں نے اس کش مکش کو پوری دنیا میں پھیلا دیا ہے۔ آج کا 'مغرب' محض گوری اقوام یا عیسائیت و یہودیت کے پیروکاروں سے تشکیل نہیں پاتا' بلکہ اس میں آسٹریلیا' نیوزی لینڈ اور متعدد ایشیائی اور افریقی اقوام اور ان اقوام کے مغرب زدہ حکمران طبقے بھی شامل ہیں۔ وقت گزرنے کے ساتھ ان کی ترجیحات میں تبدیلیاں آتی رہی ہیں۔ موجودہ کش مکش کی جڑیں بہت گہری ہیں' اور اس کا ہدف فی الحقیقت اسلام اور مسلمان ہیں۔

مسلم دنیا میں بجاطور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ مغرب کی سیاسی' فکری اور عسکری قوتیں انھیں مغلوب رکھنے' محکوم بنانے اور ان کے وسائل پر قبضہ جمانے ساتھ ہی ساتھ ان کے عقیدے کو اپنی یلغار کا نشانہ بنا رہی ہیں۔ اخلاقیات اور روحانیت کے بحران نے بھی مغربی دنیا کو ایک خلا میں دھکیل دیا ہے' جس سے نکلنے کی دعوت صرف اسلام کے پاس ہے۔ آج کے مغربی معاشروں کی جانب مسلم آبادیوں کی نقل مکانی سے انھیں یہ خطرہ لاحق ہوگیا ہے کہ آنے والے کل میں یورپی علاقے بھی کہیں مسلم دنیا میں نہ تبدیل ہوجائیں۔ ان گوناگوں مسائل و خدشات کے پیش نظر بھی مغربی دنیا مسلمانوں کے خلاف 'پیشگی حملوں' کے لیے نئے نئے

بہانے تراشنے اور پھر ظلم و زیادتی کے مختلف حربے بروئے کار لانے کے لیے متحرک نظر آتی ہے۔

اس بحرانی کیفیت' بلکہ مسلط کردہ جنگی صورت حال پر مسلم اور غیر مسلم دنیا کے متعدد اہلِ علم نے اظہار خیال کیا ہے۔ ان اہلِ علم اور اصحابِ قلم میں ایک نمایاں نام جناب خرم مراد کا ہے جنھوں نے زیر بحث مسئلے کو سمجھنے اور سمجھانے کے لیے بیسویں صدی کے آخری عشرے کے دوران میں متعدد گراں قدر مقالات تحریر کیے۔

خرم مراد مرحوم و مغفور کی حساس طبیعت' ظلم کو کسی شکل میں برداشت کرنے کے لیے کبھی تیار نہ تھی' اور یہ چیز انھیں قرآن سے تعلق' سیرت سے والہانہ وابستگی' تاریخ و تہذیب کے گہرے مطالعے اور عقل و عمل کے مطلوب تقاضوں کو پورا کرنے کی کوششوں سے حاصل ہوئی تھی۔ قارئین ان کے زیر نظر مقالات میں دینی اسپرٹ' سماجی شعور اور تجزیاتی گہرائی کی چاشنی محسوس کریں گے۔

جناب خرم مراد نے موجود' معلوم اور میسر معلومات پر اکتفا کرنے کے بجائے کھوج لگانے اور تفکر و تدبر کے مشکل راستے کو منتخب کیا۔ انھوں نے مغرب اور اسلامی دنیا کے درمیان مخاصمت یا رقابت کا تجزیہ کیا ہے اور ساتھ ہی اس شاہراہ مستقیم کی نشان دہی بھی کی ہے کہ جس پر چل کر مغربی دنیا پرسکون اور مسلم دنیا پُروقار زندگی کا انتخاب کر سکتی ہے۔

مذکورہ بالا مباحث و موضوعات پر جناب خرم مراد کے زیر نظر مضامین ان شاء اللہ علم' معلومات اور فکر و شعور کے کچھ نئے دریچے کھولنے کا ذریعہ ثابت ہوں گے۔

--- سلیم منصور خالد

مغرب اور اسلام میں کش مکش: فیصلہ کن مسئلہ

آج ___ جب کہ مغرب' مسلسل اسلام اور مسلمانوں کے خلاف طبل جنگ بجا رہا ہے' اور دنیا کو مستقبل میں اسلام اور مغرب کے درمیان ایک زبردست تہذیبی معرکہ برپا ہونے کی خبر دے رہا ہے۔ ساتھ ہی وہ اپنی طرف سے اس جنگ کے لیے پوری تیاریاں بھی کر رہا ہے' اور جو کچھ پیش قدمی اس وقت کرنا ممکن ہیں' وہ بھی کر رہا ہے ___ مسلمانوں کے لیے یہ سمجھنا بڑا اہم اور ضروری ہے کہ وہ اصل مسئلہ کیا ہے جس کے گرد یہ تہذیبی جنگ لڑی جارہی ہے؟ اور اس جنگ میں فیصلہ کن حیثیت کس ایشو اور کس مسئلے کو حاصل ہے؟ اس سوال کا صحیح جواب' صحیح سوچ' حکمت عملی اور ترجیحات اختیار کرنے کے لیے ناگزیر ہے۔

کش مکش کا محرک

شاید کم ہی لوگ ہوں گے جنھیں اس بات کا ادراک ہو' یا جو اسے آسانی سے تسلیم کرلیں' لیکن ہمیں اس بات میں کوئی شبہہ نہیں کہ اصل اور فیصلہ کن ایشو اور مسئلہ رسالت محمدیؐ کی صداقت کا ایشو اور مسئلہ ہے: ''کیا محمد صلی اللہ علیہ وسلم' اللہ کے رسول ہیں؟''

غار حرا میں پہلی وحی آنے کے بعد' روز اول سے یہی سوال نزاع و جدل کا اصل موضوع

تھا' اور آج بھی یہی ہے۔ اس وقت بھی انسان اسی بات کے ماننے اور نہ ماننے پر دو کیمپوں میں تقسیم ہو گئے تھے' اور ان کے جواب نے قوموں کے مقدر اور تاریخ و تہذیب کے رخ کا فیصلہ کر دیا تھا' آج بھی اسی سوال پر مستقبل کا مدار ہے۔ یہ کش مکش تو ازلی و ابدی ہے:

ستیزہ کار رہا ہے ازل سے تا امروز
چراغِ مصطفویؐ سے شرارِ بولہبی

مغرب کے معاشی' سیاسی اور اسٹرے ٹیجک مفادات کا مسئلہ بھی یقیناً اہم ہے' تیل کے چشمے بھی اہم ہیں۔ اسی لیے مغربی قیادت نے عالمِ اسلام کے قلب میں اسرائیل کا خنجر گھونپا ہے' مسلمان حکمرانوں کو اپنا باج گزار بنایا ہے اور شرق اوسط میں فوجی اڈوں کا جال بچھا لیا ہے۔ مسلمان ملکوں کو کمزور اور بے طاقت کر رہا ہے' یا جن سے سرتابی کا شبہ ہے ان کے گلے میں پھندا کس رہا ہے۔ لیکن مفادات کے تنازعات تو امریکا' یورپ' جاپان' چین اور روس کے درمیان بھی ہیں' ان کی بنا پر ان کے درمیان مستقل دشمنی اور ایک دوسرے کی بربادی کے مشورے اور منصوبے نہیں۔ دراصل مسئلہ مفادات کا نہیں بلکہ یہ ہے کہ یہ مفادات ان لوگوں اور علاقوں میں واقع ہیں جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے نام لیوا ہیں' اور آپؐ کے دین کے لیے مرنے کو زندگی سے زیادہ محبوب رکھتے ہیں۔

تہذیبی ایشوز کا معاملہ بھی بہت اہم ہے۔ اسی لیے انسانی حقوق کی دہائی ہے' عورتوں کے مقام' ان کی خود اختیاری (empowerment) اور آزادی (liberation) پر اصرار ہے' اسلامی قوانین اور حدود کے خلاف دباؤ ہے اور جمہوریت دشمن ہونے کا الزام ہے۔ لیکن دنیا میں بڑی بڑی آبادیاں اور بھی ہیں' جو مسلمانوں سے کئی گنا زیادہ ان ساری مزعومہ تہذیبی اقدار کی خلاف ورزی کی مجرم ہیں اور ان 'تحائف' کی مستحق۔

ظاہر ہے کہ اصل لڑائی ان تہذیبی ایشوز پر بھی نہیں' بلکہ یہ ایشوز تو اس تہذیب کی بربادی کے لیے لاٹھی کا کام کر رہے ہیں' جس کی تشکیل و ترکیب اور ترتیب و تکوین' رسالت

محمدیؐ کے دم سے ہے۔

مغرب کو اچھی طرح معلوم ہے' مسلمان آج اتنے کمزور ہیں کہ سیاسی' معاشی اور فوجی لحاظ سے کسی طرح بھی وہ ان کا عشرِ عشیر بھی نہیں۔ اہل مغرب کو یہ بھی معلوم ہے کہ اگر مسلمان اپنے نظام معاشرت و سیاست اور جرم و سزا کی تشکیل اسلام کے مطابق کریں' حجاب اختیار کریں یا حدود نافذ کریں' تو بھی مغربی تہذیب کو کوئی گزند نہیں پہنچتا۔ لیکن وہ اس بات کی مسلسل رٹ لگائے جا رہا ہے: "اسلام کا احیا اور مسلمان ــــــ (اس کے الفاظ میں فنڈامنٹلزم یا بنیاد پرستی) ــــــ دراصل مغرب کی تہذیب' اس کے طرز زندگی' اس کی اقدار اور اس کی آج تک کی حاصل کردہ تہذیبی ترقی کے لیے سب سے بڑا خطرہ ہے" ــــــ ایسا کیوں ہے؟ رسالت محمدیؐ کی وجہ سے!

جانتا ہوں میں کہ مشرق کی اندھیری رات میں
بے ید بیضا ہے پیران حرم کی آستیں
عصرِ حاضر کے تقاضاؤں سے ہے لیکن یہ خوف
ہو نہ جائے آشکارا شرع پیغمبرؐ کہیں
الحذر آئین پیغمبرؐ سے سو بار الحذر
حافظ ناموس زن' مرد آزما' مرد آفریں

عام مسلمان اگر تہذیبی جنگ کی اس حقیقت سے بے خبر ہیں' تو کوئی تعجب کی بات نہیں۔ تعجب کی بات یہ ہے کہ وہ جو احیائے اسلام کے علم بردار ہیں' وہ بھی اس حقیقت کا پورا ادراک اور احساس نہیں رکھتے۔ اسی لیے رسالت محمدیؐ کا ان کے ایجنڈے پر وہ مقام نہیں' جو ہونا چاہیے۔ حالانکہ تہذیبی جنگ' دل اور زندگی جیتنے کی جنگ ہے۔ دل پہلے بھی خاتم الانبیا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت سے مجتمع اور توانا ہوئے تھے' آج بھی اسی محبت سے ایمان' اتحاد اور قوتِ عمل سے سرشار ہوں گے۔ اس کے باوجود رسالت محمدیؐ کے لیے انسانوں کے دل اور ان کی

زندگیاں مسخر کرنے کے لیے جو کچھ کرنا چاہیے' افسوس صد افسوس کہ وہ نہیں کیا جا رہا۔ یہی کچھ کرنے کا احساس اور جذبہ و فکر پیدا کرنا آج ملت اسلامیہ کی سب سے بڑی ضرورت ہے۔

اس تصادم کا تاریخی سفر

رسالت محمدیؐ کے خلاف یورپ کی یہ جنگ کوئی نئی جنگ نہیں ہے۔

جب سے اسلام اور عیسائیت کا آمنا سامنا ہوا ہے' اس وقت سے عیسائیت اور یورپ نے اسلام کے خلاف اپنی جنگ کا مرکز و ہدف ذات محمدیؐ اور رسالت محمدی کو بنایا ہے۔ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے نام لیوا اچانک صحرائے عرب سے نمودار ہوئے' اور پلک جھپکتے میں انھوں نے شام' فلسطین' مصر' لیبیا' تیونس اور الجیریا ___ جو عیسائیت کے گڑھ تھے ___ کی زمام کار سنبھال لی۔ نہ صرف انھیں اپنے انتظام میں لیا' بلکہ آبادیوں کی آبادیاں بہ رضا و رغبت' رسالت محمدیؐ کی تابع بن گئیں۔ یہی نہیں' ہزار سال تک اس کا سورج نصف النہار پر چمکتا رہا' اور مسیحی پادریوں کی ہزار بددعاؤں' خواہشوں اور ان کے حکمرانوں کی عملی کوششوں کے باوجود' وہ ڈھلنے پر نہ آیا۔

وہ متحیر' شکست خوردہ اور غیظ و غضب کا شکار تھے۔ مزید غصے کی بات یہ تھی کہ ان کی کرسٹالوجی (سیدنا مسیح کی ابنیت / ولدیت اور مصلوبیت) اور شریعت کی عدم پابندی کے علاوہ دین اسلام میں کوئی چیز ان کی عیسائیت سے خاص مختلف نہ تھی' بلکہ دونوں میں بڑی یکسانیت تھی۔ وہ حیران و ششدر تھے کہ اس غیر معمولی واقعے کی توجیہہ کیا اور کیسے کریں؟ اس کا مقابلہ کیسے کریں؟ عیسائیوں کو مسلمان بننے سے کیسے روکیں؟

ان کو یہی نظر آیا کہ اس سارے "فتنے (نعوذ باللہ) کی جڑ' اور ان کی ساری مصیبت کا سبب' محمدؐ کی رسالت ہے۔ مسلمانوں کی قوت و شکست کا راز حضورؐ پر ایمان و یقین اور آپؐ کی ذات سے والہانہ محبت اور وابستگی ہے۔ چنانچہ انھوں نے اپنا سارا زور یہ بات ثابت کرنے پر لگا دیا کہ: (نعوذ باللہ) حضورؐ کا دعویٰ رسالت درست نہیں تھا اور قرآن آپؐ کی تصنیف کردہ

کتاب ہے‘ وہ بھی عیسائیوں اور یہودیوں سے مانگ تانگ کر اور مدد لے کر‘ اور اپنے مضامین و اسلوب اور بے ربطی و تکرار کی وجہ سے کلام الٰہی کہلانے کی مستحق نہیں۔ یا کوئی سنجیدہ‘ علمی مہم بھی نہ تھی۔ مغرب کا دورِ ظلمت (dark ages) ہو یا ازمنہ وسطیٰ (medieval ages) یا روشن خیالی (enlightenment)‘ ان کے ہاں اس مقصد کے لیے حضورؐ کے کردار پر انتہائی رکیک الزامات گھڑے گئے اور غلیظ الزامات لگائے گئے۔ آپؐ کی زندگی کے ہر واقعے کو بدترین معنی پہنائے گئے اور اسے مسخ کر کے پیش کیا گیا۔ یہ الزام لگایا گیا کہ تلوار‘ خون ریزی اور قتل و غارت کے ذریعے‘ اور لوٹ مار اور دنیاوی لذائذ سے لطف اندوزی کی کھلی چھوٹ کا لالچ دے کر‘ آپؐ نے اپنے گرد پیروکار جمع کیے‘ اور ان کے ذریعے دنیا کو فتح کیا۔ یہ سب کچھ کہنے اور لکھنے کے لیے اہلِ مغرب کی جانب سے زبان بھی انتہائی غلیظ استعمال کی گئی۔ اتنی غلیظ کہ اس کا نقل کرنا بھی ممکن نہیں۔ ہم نے اُوپر جو کچھ لکھا ہے‘ یا آگے نقل کریں گے‘ وہ دل پر انتہائی جبر کر کے‘ اس لیے کہ نقل کفر کفر نہ باشد۔ انھیں نقل کرتے ہوئے ہمارا قلم کانپتا اور روح لرزہ براندام ہوتی ہے‘ مگر صرف اس لیے یہ جسارت کر رہے ہیں کہ مسئلے کو سمجھنا ممکن ہو اور خود قرآن نے بھی مخالفین کے الزامات نقل کیے ہیں۔

سینٹ جان آف دمشق [م: ۷۵۳ء]‘ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ [م: ۷۲۰ء] سے قبل اموی دربار میں اعلیٰ عہدے پر فائز تھا اور اسلام سے ناواقف نہیں تھا۔ وہ الزام تراشی کرتے ہوئے لکھتا ہے: ”بنی اسماعیل کی اولاد میں‘ محمدؐ کے نام سے [معاذاللہ] جھوٹے نبی نمودار ہوئے۔ وہ تورات و انجیل سے واقف تھے۔ ایک عیسائی راہب سے بھی تعلیم حاصل کی۔ ان کچی پکی معلومات کے بل پر انھوں نے عیسائیت کی ایک تحریف کردہ شکل وضع کر کے پیش کر دی۔ پھر لوگوں سے تسلیم کرا لیا کہ وہ خداترس انسان ہیں۔ پھر یہ افواہ پھیلا دی کہ ان پر آسمان سے کتاب مقدس نازل ہو رہی ہے۔ عیسیٰؑ اور موسیٰؑ کی طرح‘ وہ اپنی وحی کی صداقت پر کوئی گواہ پیش نہ کر سکے‘ نہ کوئی معجزہ۔ ایسے شخص کی بات پر کیسے اعتماد کیا جا سکتا ہے جس نے منہ

بوئے بیٹے زید کی بیوی زینب سے شادی [۵ ھ] کر لی۔'

انھی خطوط پر' خلیفہ مامون [۳۳-۸۱۳ء] کے ایک درباری [ابن اسحاق - م: ۸۷۰ء] نے عبدالمسیح الکندی کا قلمی نام اختیار کر کے الرسالہ کے نام سے ایک فرضی مکالمہ لکھا' اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں ہرزہ سرائی کرتے ہوئے کہا: 'محمد کس طرح سچے نبی ہو سکتے ہیں' جب کہ آپ نے خوں ریزی کی' اپنی نبوت کی تائید میں کوئی معجزات پیش نہ کیے۔ جہاں تک قرآن کا تعلق ہے تو وہ سارا سنی سنائی باتوں پر مشتمل ہے' کتاب الٰہی کس طرح ہو سکتا ہے؟'

سینٹ جان آف دمشق اور عبدالمسیح الکندی کے الرسالہ نے' بیسویں صدی کے آغاز تک' محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں اہلِ یورپ کے رویے اور فکر کی تشکیل میں فیصلہ کن کردار ادا کیا ہے۔ بارھویں صدی میں الرسالہ کا لاطینی ترجمہ اسپین میں شائع ہوا' پندرھویں صدی میں سوئٹزرلینڈ میں' یہاں تک کہ انیسویں صدی میں ولیم میور [م: ۱۹۰۵ء] نے اس کا انگریزی ترجمہ لندن سے شائع کرنا ضروری سمجھا۔ ایک ہزار سال کے اس طویل عرصے میں پادریوں اور یورپی دانش وروں نے رسالت محمدیؐ کے بارے میں جو کچھ کہا ہے' وہ بنیادی طور پر مسیح الکندی اور سینٹ جان آف دمشق ہی کی اس یاوہ گوئی کو دہراتے رہتے ہیں:

۱- قرآن' یہودیوں اور عیسائیوں سے سیکھ کر وضع کیا گیا' متضاد اور الجھی ہوئی باتوں کا مجموعہ ہے۔ ۲- اخلاقی الزامات ۳- سیاست دانوں اور حکمرانوں کی طرح موقع پرستی اور مکر و فریب کی کارروائیاں' اعاذنا اللہ من ذلک ونشھد ان محمدا عبدہ ورسولہ۔

ان چیزوں کو نقل کرنا' اس لیے ضروری تھا تاکہ یہ بتایا جا سکے کہ آج جب ایک طویل زمانہ گزر چکا ہے اور اب اہلِ مغرب کا مسلمانوں سے روز کا ربط ہے۔ اہلِ مغرب کے ہاں

1- *Encounters and Clashes: Islam and Christianity in History*. Rome, 1990.

سائنٹی فک اندازِ فکر' علمیت اور غیر جانب داری کے نعرے بھی ہیں' بلکہ ہمدردانہ اور منصفانہ معاملے کے دعوے بھی ـــــ لیکن اہلِ یورپ کی روش اور سوچ میں کوئی بنیادی تبدیلی نہیں آئی ہے۔ یہاں تک کہ ان لوگوں میں پروفیسر منٹگمری واٹ' کینتھ کریگ (Kenneth Cragg) اور ویٹی کن [اٹلی میں واقع رومن کیتھولک چرچ کا ہیڈ کوارٹر' جسے ۱۹۲۹ء سے ریاست کا درجہ حاصل ہے] کی سوچ اور روش میں بھی' جو ڈائیلاگ' مکالمے' فیاضی اور مراعات کی روش کے دعوے دار ہیں' ان کے ہاں تال اور سر بدلے ہیں' مگر راگ وہی ہیں۔ بظاہر ان کے الفاظ ''مہذب'' ہوگئے ہیں لیکن الزامات وہی ہیں' دشنام طرازی بھی وہی ہے' مگر ''تہذیب'' کے جامے میں ہے۔ زبان اور تعبیرات وہ ہیں جو آج کے زمانے میں قابلِ قبول ہوں' مگر تہ میں بات وہی ہے۔ چنانچہ نتیجہ وہی ڈھاک کے تین پات ہیں۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور قرآن کے متعلق قرونِ وسطیٰ میں غیر مسلموں کی طرف سے اس طرح کی سخت مجہول اور بے تکی باتیں کی جاتی تھیں کہ: 'قرآن ایک بیل کے سینگوں پر رکھ کر لائے' فاختہ کے کان میں وحی ڈال جانے کا ڈھونگ رچایا' مرگی کے دورے پڑتے تھے' جادوگر تھے اور لوگوں پر جادو کر دیا تھا' جنوں اور شیطانوں نے قابو پالیا تھا' کوئی مرتد عیسائی پادری تھا جو مسلسل سکھاتا پڑھاتا تھا' وغیرہ وغیرہ۔

لیکن اب ان توجیہات کی جگہ ایسے نفسیاتی' سماجی' معاشی اور سیاسی عوامل نے لے لی ہے' جن سے جدید ذہن زیادہ آشنا ہے۔ مثلاً راڈنسن' سگمنڈ فرائڈ [م: ۱۹۳۹ء] کی رہنمائی میں' حضورؐ کی نفسیاتی تحلیل کرتا ہے اور اپنی دانست میں قرآن و رسالت کا سراغ پیش کرتا ہے۔ پروفیسر منٹگمری واٹ' سوشیالوجی (سماجیات) کے اوزار سے لیس' اس سرچشمے کا سراغ عرب کی ریگستانی اور بدویانہ زندگی میں' جاہلیت کی خرابیوں میں' مکہ میں عیسائی اور یہودی تعلیمات و اثرات میں' اور اہلِ عرب کی سیاسی ضرورت میں پاتا ہے۔ کینتھ کریگ یہ سوال اٹھاتا ہے کہ ''رسالت نے کہاں جنم لیا؟'' اور خود ہی جواب دیتا ہے: ''محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی اس جستجو اور

آرزو میں کہ عرب متحد ہوں' اور اس یقین میں' کہ ایک کتاب الٰہی ہی' ایک عربی قرآن ہی' ان کو اتحاد و تشخص دے سکتا ہے"۔ یہ ایقان کیوں کر پیدا ہوا: "عیسائیوں اور یہودیوں کو دیکھ کر' کہ وہ بھی اہل کتاب تھے"۔

پھر کوئی بھی "ہمدردانہ" تحریر ایسی نہیں' جو (نعوذ باللہ) وحی الٰہی میں خارجی مداخلت ثابت کرنے کے لیے شیطانی ہفوات کے واقعے' سیاسی مفاد اور دنیاداری کے ثبوت کے لیے نخلہ کے واقعے[۲] [رجب ۲ھ/ جنوری ۶۲۴ء]' خون آشامی کی شہادت کے طور پر بنوقریظہ کے قتل کے واقعے[۳] [شوال ۵ ہجری] اور اخلاقی سطح کو زیر بحث لانے کے لیے حضرت زینبؓ کے ساتھ نکاح کے واقعے سے خالی ہو۔

۲- رسولؐ اللہ نے حضرت عبداللہ بن جحشؓ کی زیر قیادت بارہ صحابہؓ کا ایک دستہ مکہ کی جانب روانہ کیا اور فرمایا: مکہ اور طائف کے درمیان نخلہ میں اترنا' جہاں سے قریش کے قافلے کے بارے میں خبروں کا پتہ لگانا۔ ان صحابہ کو آپؐ نے لڑنے کے لیے نہیں بھیجا تھا۔ تاہم جب قریش کا قافلہ قریب سے گزرا تو حرمت کے مہینے رجب کی آخری تاریخ تھی۔ اس کے باوجود صحابہؓ نے ان پر حملہ کر دیا' جس میں ایک فرد مارا گیا' ایک فرار ہو گیا اور دو افراد کو گرفتار کر کے' مع مال و اسباب' صحابہ انھیں مدینہ لے آئے۔ جس پر رسولؐ اللہ نے ان کی اس حرکت پر سخت سرزنش کی۔ اس موقع پر سورہ بقرہ (آیت ۲۱۷) نازل ہوئی۔ رسول کریمؐ نے دونوں قیدیوں کو آزاد کر دیا' مقتول کے اولیا کو خون بہا ادا کیا اور تمام مال واپس کر دیا۔ (صفی الرحمٰن مبارک پوری: الرحیق المختوم' المکتبہ السلفیہ' لاہور' طبع نہم ۱۹۹۴ء' ص ۲۳۰-۲۳۲)

۳- غزوۂ احزاب (خندق) سے ایک سال قبل مدینہ کے معاہد یہود نے عہد شکنی کرتے ہوئے' مسلمانوں کے خلاف سازشیں جاری رکھیں' اور قریش مکہ سے مل کر رسولؐ اللہ اور صحابہ کو نقصان پہنچانے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہ جانے دیا۔ اسی دوران جنگ خندق کا چیلنج درپیش ہوا۔ قریش مکہ دس ہزار کا لشکر لے کر مدینہ پر چڑھ دوڑے۔ تب موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے بنوقریظہ (یہود مدینہ) نے مسلمانوں کے خلاف اپنی معاندانہ سرگرمیاں تیز تر کر دیں۔ جنگ خندق سے فارغ ہو کر رسول اکرمؐ اپنے گھر تشریف لائے تو اسی روز اللہ تعالیٰ نے انھیں بنوقریظہ کے فتنے سے نبٹنے کی ہدایت فرمائی۔ جس کے نتیجے میں ان کے تقریباً چھ سو مرد کیفر کردار کو پہنچے۔ اس طرح غدر و خیانت کے مرتکب اور عہد و پیمان کو توڑنے والے گروہ کا استیصال ہوا۔ اس موقع پر سورہ احزاب کی آیات نازل ہوئیں' جن میں مومنین و منافقین کے حالات پر تبصرہ ہے۔ اور اہل کتاب کی بدعہدی کے نتائج پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ (ایضاً' ص ۴۸۹-۵۱۷)

جو لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مخاطب تھے' وہ ان کے سخت دشمن اور رسالت کے منکر تھے۔ جو آپؐ کے خلاف ہجو کہتے پھرتے تھے' وہ بھی اخلاق سے اتنے عاری نہ تھے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر کوئی اخلاقی الزامات لگائیں۔ اگرچہ' جاہلیت عرب کا انکار' جاہلیت جدیدہ کے انکار رسالت سے کچھ بھی مختلف نہ تھا۔ وہی الزامات' وہی اعتراضات نعوذباللہ: شاعر ہیں' کاہن ہیں' جن آ گئے ہیں' جادوگر ہیں' خود کلام گھڑتے ہیں' اور اسے اللہ کی طرف منسوب کر دیتے ہیں وغیرہ۔ یہ کہ:

وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اِنْ هٰذَآ اِلَّآ اِفْكُ ۨ افْتَرٰىهُ وَاَعَانَهٗ عَلَيْهِ قَوْمٌ اٰخَرُوْنَ ۛ فَقَدْ جَاۗءُوْ ظُلْمًا وَّزُوْرًا ○ وَقَالُوْٓا اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ اكْتَتَبَهَا فَهِيَ تُمْلٰى عَلَيْهِ بُكْرَةً وَّاَصِيْلًا ○ (الفرقان ۲۵:۴-۵)

ایک جھوٹ ہے جو انھوں نے گھڑ لیا ہے' اور اس میں دوسرے لوگوں نے ان کی مدد کی ہے۔ یہ گزرے ہوئے لوگوں کے قصے ہیں جن کو انھوں نے لکھ لیا ہے' اور یہ ان کو صبح و شام لکھوائے جاتے ہیں۔

وَلَقَدْ نَعْلَمُ اَنَّهُمْ يَقُوْلُوْنَ اِنَّمَا يُعَلِّمُهٗ بَشَرٌ ۭ لِسَانُ الَّذِيْ يُلْحِدُوْنَ اِلَيْهِ اَعْجَمِيٌّ وَّهٰذَا لِسَانٌ عَرَبِيٌّ مُّبِيْنٌ ○ (النحل ۱۶:۱۰۳)

کہتے ہیں کہ ان کو تو یہ سب کچھ ایک آدمی سکھاتا ہے' لیکن یہ جس کی طرف اشارہ کرتے ہیں اس کی زبان عجمی ہے اور یہ عربی مبین ہے۔

یورپ کی ہزار سالہ مخالفت پر نظر ڈالیں تو بے اختیار نگاہوں کے سامنے یہ تصویر آتی ہے:

كَذٰلِكَ مَآ اَتَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ مِّنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا قَالُوْا سَاحِرٌ اَوْ مَجْنُوْنٌ ○ اَتَوَاصَوْا بِهٖ ۚ بَلْ هُمْ قَوْمٌ طَاغُوْنَ ○ (الذاریات ۵۱:۵۲-۵۳)

یوں ہی ہوتا رہا ہے' ان سے پہلے کی قوموں کے پاس بھی کوئی رسول ایسا نہیں آیا

جسے انھوں نے یہ نہ کہا ہو کہ یہ ساحر ہے یا مجنون۔ کیا ان سب نے آپس میں اس پر کوئی سمجھوتہ کرلیا ہے؟ نہیں، بلکہ یہ سب سرکش لوگ ہیں۔

اس بات کو نارمن ڈینیل (Norman Daniel) نے یوں لکھا ہے: ''ہم انتہائی غیر جانب دار اسکالر کی تحریر بھی پڑھیں، تو ہمیں یاد رکھنا چاہیے کہ قدیم عیسائیت نے (اسلام اور محمدؐ) کے بارے میں کیا انداز فکر و گفتگو اختیار کیا تھا۔ وہ انداز ہمیشہ ہر اس مغربی ذہن کا لازمی جزو رہا ہے، اور آج بھی ہے، جو اس موضوع پر سوچتا اور بات کرتا ہے۔''[4]

رسولؐ اللہ سے دشمنی کے اسباب

محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، قرآن مجید اور رسالت کے خلاف عیسائیت اور اہلِ مغرب کی اس شدید دشمنی کے اسباب کیا ہیں؟

چند تاریخی، سیاسی اور نفسیاتی اسباب کی طرف ہم اشارہ کر چکے ہیں۔ ان کی نظر میں، ان پر اسلام کی صورت میں جو تباہ کن آفت نازل ہوئی تھی، اس کی حیرت انگیز قوت و شوکت اور غلبے کا راز رسالت محمدیؐ پر ایمان اور حضورؐ کی ذات سے محبّت و وابستگی میں مضمر تھا۔ اس سے مقابلے کا راستہ اس کے علاوہ اور کچھ نہ تھا کہ قوت اور زندگی کے اس منبع کو ختم کیا جائے۔ اس کو ختم کرنے کا طریقہ اس کے سوا کچھ نہیں کہ حضورؐ کو نعوذ باللہ جھوٹا نبی، قرآن کو آپؐ کی خودساختہ تصنیف، اور آپؐ کے کردار کو غیر معیاری ثابت کیا جائے، خواہ اس جھوٹ کے لیے تہذیب و معقولیت کی ہر حد پھلانگنا پڑے۔

آج یہ بات کھلم کھلا تو نہیں کہی جا رہی، لیکن اس کا واضح اعتراف موجود ہے۔ ہفت روزہ اکانومسٹ، لندن نے لکھا ہے:

۴- نارمن ڈینیل: *Islam and The West: The Making of an Image*، ناشر: ایڈنبرگ یونی ورسٹی پریس، ۱۹۶۰ء، ص ۳۰۱

دنیا کی قیادت کے لیے مغربی تہذیب کا حریف ایک ہی ہوسکتا ہے: وہ ہے اسلام۔
اس سے مغرب کا تصادم ہوسکتا ہے۔ اس لیے کہ اسلام ایک آئیڈیا ہے' آج کی دنیا
میں اپنی نوعیت کا واحد آئیڈیا۔ یہ آئیڈیا انسانی تجربے اور مشاہدے سے ماوراحق
کے وجود پر یقین کا مدعی ہے! اس کے نزدیک یہ وہ حق ہے جو چودہ سو سال پہلے
محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) پر نازل ہوا' اور قرآن کی صورت میں محفوظ و موجود ہے۔
ایک تہذیب کی قوت اور غلبے کے لیے ایسے الحق پر یقین کی قوت کے برابر کوئی
قوت نہیں۔ اسی لیے اہلِ یورپ اسلام اور مسلمانوں سے خائف ہیں۔ انھیں خطرہ
ہے کہ ایک نئی سرد جنگ آرہی ہے' جو غالباً ''سرد'' نہ رہے گی۔

اسی لیے آج بھی رسالت محمدیؐ' مغرب کے حملوں کا سب سے بڑا ہدف ہے۔ جہاں
موقع ملے' ذات گرامیؐ پر بھی گندگی ڈالنے سے اجتناب نہیں' لیکن اب یہ کام بالعموم مسلمان
گھرانوں میں پیدا ہونے والے گنتی کے چند سلمان رشدی [بھارتی نژاد شاتم رسول] اور تسلیمہ
نسرین [بنگالی نژاد دریدہ دہن] قسم کے لوگوں کے سپرد کر دیا گیا ہے۔ اپنا اسلوب بدل دیا گیا
ہے۔ اب کچھ لوگ حضورؐ کو پیغمبر تسلیم کرنے کے دعوے دار ہیں' لیکن تورات کے اسرائیلی انبیا
کی طرح کا پیغمبر (جن کی تاریخ خود انھوں نے داغ دار کی ہے)۔ کچھ لوگ وحی کی حقیقت اور
نوعیت ہی کو ___ مکالمہ ___ اور مفاہمت کے نام پر ___ بدلنے کی دعوت دے رہے ہیں۔
کچھ سینٹ پال [م: ۶۴ء] کی طرح کے ''مصلح'' کے ورود [از قسم' مرزا غلام احمد قادیانی۔
م: ۱۹۰۸ء] کے متمنی ہیں جو اسلامی شریعت سے نجات دے۔

کچھ چاہتے ہیں کہ قرآن کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا جائے: ایک حصہ' عقائد و اخلاق
کی تعلیم پر مبنی' اس کو کلامِ الٰہی مان لیا جائے۔ دوسرا حصہ' زندگی بسر کرنے کے ضوابط پر مشتمل' ان
کو حضورؐ کی تصنیف قرار دیا جائے' جو قابلِ تغیّر و تبدل ہے۔

اسی ذیل میں کچھ ''دُور اندیش'' عناصر کسی دینی بحث میں نہیں پڑنا چاہتے' لیکن وہ

انسانی حقوق' عورت کے مقام اور جمہوریت کے قیام کے نام پر وہ چیزیں دل و دماغ میں اتار رہے ہیں' اور اُمت محمدیؐ کی زندگی اور عمل کو ایسے سانچے میں ڈھال رہے ہیں' جو رسالت پر ایمان اور ناقابل تغیّر و تبدل حق پر یقین کو خود بخود بے معنی اور غیر مؤثر کر کے رکھ دے۔

ہفت روزہ اکانومسٹ لندن نے صحیح لفظوں میں اعتراف کیا: ''آج رسالت محمدیؐ پر یقین و ایمان ہی مغربی تہذیب کے لیے واحد حریف اور سب سے بڑا خطرہ ہے' اور یہی ایمان مسلمانوں کے لیے بے پناہ قوت کا سرچشمہ''۔

آیئے' مختصراً دیکھیں کہ کس طرح؟

۱- مغربی تہذیب اور جدیدیت (modernism) کی بنیاد یہ ہے' کہ انسان اب بالغ ہو چکا ہے۔ کسی ماورائے انسان وجود یا ذریعے سے علم اور رہنمائی لینے کا محتاج نہیں۔ وہ مستغنی ہے' خصوصاً خدا اور وحی جیسے ان ذرائع و تصورات سے' جن کو اس نے اپنے عہد طفولیت میں اپنے سہارے اور تسلی کے لیے گھڑ لیا تھا۔ رسالت محمدیؐ اس کے برعکس' یہ علم اور یقین بخشتی ہے کہ خالق کا وجود حقیقی ہے۔ وہ علوم کا رشتہ بھی اس کے نام سے جوڑتی ہے' زندگی کا بھی۔ وہی خالق حقیقی کھانا بھی کھلاتا ہے' شفا بھی بخشتا ہے' اختیار و قدرت بھی صرف اس کو حاصل ہے' زندگی بسر کرنے کا صحیح راستہ بھی وہی دکھاتا ہے۔ انسان ہر لحاظ سے اس کا محتاج' فقیر اور غلام و بندہ ہے۔

۲- مغربی تہذیب کے فلسفہ علم (epistemology) کی بنیاد یہ ہے' کہ علم کا ذریعہ صرف: انسانی حواس اور عقل ہے' تجربہ و مشاہدہ ہے' سائنسی طریقہ ہے مگر یہ سارا علم بھی ظنی ہے جو آج صحیح ہے وہ کل غلط ہو سکتا ہے' بلکہ غلط ثابت ہونے کا امکان نہ ہو تو وہ علم ہے ہی نہیں' ایک عقیدہ ہے۔ قطعی اور یقینی علم کے نام کی کوئی چیز دنیا میں پائی ہی نہیں جاتی' جو معیار حق ہو' جس کے آگے لوگ سر تسلیم خم کریں' جس کے لیے کوئی کسی سے مطالبہ کر سکے کہ اس کو مانو اور اس پر چلو۔ اس کے برعکس' رسالت محمدیؐ

اس شعور سے معمور کرتی ہے کہ علم یقینی کا وجود ہے اور اس کا سرچشمہ وحی الٰہی اور حضورؐ کی رسالت ہے۔ زبردستی کسی پر نہیں کی جاسکتی' لیکن جو مان لیں انھیں اس علم کے آگے سرِتسلیم خم کرنا چاہیے' جہاں اختیار ہو' وہاں اس علم کے مطابق چلنا اور چلانا چاہیے۔ مغرب نے حق اور باطل کے الفاظ کو متروک بنا دیا ہے' اور ان کا استعمال تہذیب و فیشن کے خلاف۔ رسالت محمدیؐ کے ماننے والوں کے لیے یہ الفاظ آج بھی سچائی اور زندگی سے بھرپور ہیں' اور ہمیشہ رہیں گے۔

۳- مغرب کے نزدیک اخلاق و اقدار ہوں یا قوانین وضوابط' ہر چیز اچھی ہے یا بری' مفید ہے یا مضر' جیسا اپنا اپنا احساس ہو' نقطۂ نظر ہو' پسند و ناپسند ہو۔ حقیقت کا انحصار دیکھنے والوں کی پوزیشن پر ہے۔ چنانچہ ہر چیز اضافی (relative) طور پر صحیح یا غلط ہوتی ہے' کوئی چیز فی نفسہٖ حق اور باطل نہیں ہوسکتی۔ رسالت محمدیؐ کے ماننے والوں کے نزدیک ان چیزوں کی جو حقیقت وحی نے طے کردی ہے' اسے کسی کی رائے' پسند و ناپسند یا تجربے و دلیل سے بدلا نہیں جاسکتا: لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِ اللّٰهِ [الانعام ۶:۳۴] 'اللہ کی باتوں کو بدلنے کی طاقت کسی میں نہیں ہے'۔

۴- مغربی تہذیب کے نزدیک علوم غیبی ___ اللہ' فرشتے' وحی' زندگی بعد موت کے نام کی کوئی چیز کوئی حقیقت نہیں رکھتی۔ اس کے برعکس رسالت محمدیؐ کے ماننے والوں کے نزدیک' زندگی کے معنی و مقصد اور انسان کی حقیقت کا علم صرف علوم غیبی ہی سے ہوسکتا ہے۔ اس کے نزدیک یہ حقائق ___ جن کی تعلیم رسالت محمدیؐ نے دی ہے ___ جیتے جاگتے حقائق ہیں: يُؤْمِنُوْنَ بِالْغَيْبِ [البقرہ ۲:۳] 'وہ غیب پر ایمان رکھتے ہیں'۔

۵- دنیا اور دنیا کی زندگی سے رسالت محمدیؐ کے ماننے والوں کو اتنی ہی گہری اور بھرپور دلچسپی ہے جتنی اہلِ مغرب کو۔ لیکن مغرب کی دلچسپی کا ہدف یہیں دنیا میں انسان کی

خوشی' راحت' لذت اور زندگی کی کیفیت و معیار ہے' کہ وہی مقصود ہیں۔ اس کے برعکس' رسالت محمدیؐ کے ماننے والوں کی دلچسپی دنیا میں اہلِ دنیا کی بھلائی اور آخرت میں اپنی بھلائی کے لیے ہے۔ اس کے نتیجے میں دو بالکل مختلف قسم کی شخصیتیں اور معاشرے وجود میں آتے ہیں: لَا يَسْتَوِيٓ اَصْحٰبُ النَّارِ وَاَصْحٰبُ الْجَنَّةِ ؕ [الحشر ۵۹:۲۰] 'دوزخ میں جانے والے اور جنت میں جانے والے کبھی یکساں نہیں ہو سکتے'۔

رسالت پر ایمان کا ایجنڈا

آج کے تہذیبی معرکے میں رسالت محمدیؐ کے مسئلے کو جو فیصلہ کن حیثیت حاصل ہے' اس کا پورا ادراک ان سب کو ہونا چاہیے' جو دین سے محبت رکھتے ہیں' جو غلبۂ دین کی تمنا رکھتے ہیں یا اس کے لیے جدوجہد کر رہے ہیں۔ اس ادراک کی روشنی میں انھیں اپنی ترجیحات پر بھی نظر ڈالنا چاہیے' اور حکمت عملی پر بھی۔ اس لیے:

۱- یہ سمجھنا ضروری ہے کہ' ہمارا یہ زمانہ اگرچہ عہد نبویؐ سے چودہ صدیوں کے فاصلے پر ہے' اور ہم جن تمدنی حالات میں اسلامی زندگی اور اس کے غلبے کے لیے کوشاں ہیں' وہ اس عہد سے بہت مختلف ہیں' لیکن یہ ہے اسی عہد نبوی کا حصہ اور تسلسل۔ کیونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کسی قوم کی طرف نہیں' ساری انسانیت کی طرف مبعوث فرمائے گئے ہیں' اور آپؐ کے بعد کوئی نبی آنے والا نہیں ہے' اس لیے آپؐ ہماری اکیسویں صدی کے لیے بھی اسی طرح رسول ہیں جس طرح چھٹی صدی کے لیے تھے' اور آج کے سارے انسان اسی طرح آپؐ کی ''قوم'' ہیں اور آپؐ کے مخاطب' جس طرح اس وقت کا اہلِ عرب اور ساری دنیا والے تھے۔ اس سیدھی سادی بات کے دُوررس مضمرات ہیں۔ چنانچہ آج کے زمانے اور لوگوں تک آپؐ کی رسالت

کی دعوت اس طرح پہنچنا اور پہنچانا ان کا حق ہے جس طرح آپؐ نے پہنچائی۔

۲- یہ سمجھنا ضروری ہے کہ بہ حیثیت رسولؐ اللہ آپ ہمارے درمیان موجود ہیں۔ کیونکہ آپؐ کی لائی ہوئی کتاب موجود ہے' آپؐ کی سیرت اور اسوہ موجود ہے' آپ کا دین موجود ہے' اور ان امانتوں کی حامل' آپؐ کی اُمت موجود ہے۔ گویا اپنی رسالت کی طرف دعوت دینے کا جو مشن بہ حیثیت رسول آپؐ نے ادا کیا' اب اسے ادا کرنے کے لیے اُمت ذمہ دار ہے۔

۳- یہ سمجھنا ضروری ہے کہ رسول کی موجودگی میں دعوت اور اسلام و جاہلیّت کے درمیان جو تہذیبی کش مکش برپا ہوتی ہے' اس میں رسالت کی طرف دعوت کو اوّلین اور فیصلہ کن مقام حاصل ہوتا ہے۔ درجے کے لحاظ سے' ایمان باللہ' اسلامی زندگی کا مرکز اور روح ہے' اسے سب سے اعلیٰ مقام حاصل ہے' رسالت کا مدعا وہی ہے۔ لیکن ترتیب کے لحاظ سے ایمان بالرسالت کی حیثیت اولین اور فیصلہ کن ہے۔ انسان' محمدؐ کو اللہ کا رسولؐ مانتا ہے' تب ہی وہ اللہ اور ہر دوسری چیز تک پہنچتا ہے۔ ایمان باللہ' وہی حق اور معتبر ہے جس کی تعلیم حضوؐر نے دی' اور اس لیے ہے کہ آپؐ اللہ کے سچے رسول ہیں۔ قرآن اسی لیے بلاشک و شبہہ کلامِ الٰہی ہے کہ رسالت محمدیؐ ہر شک و شبہہ سے بالاتر ہے۔ حلال و حرام' واجبات و منہیات اور عذاب و ثواب کے لیے کوئی عقلی یا تجربی دلیل' سند ناطق نہیں سوائے حکم نبویؐ کے۔ پھر عمل کے لحاظ سے تو ایمان و اتباع رسالت' عین اطاعتِ الٰہی اور قربِ الٰہی کے مترادف ہے: مَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ [النساء۴:۸۰۔ جس نے رسول کی اطاعت کی اس نے دراصل خدا کی اطاعت کی۔] اور: قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِي يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ [آل عمرٰن ۳:۳۱۔ اے نبیؐ، لوگوں سے کہہ دو کہ اگر تم حقیقت میں اللہ سے محبت رکھتے ہو تو میری پیروی اختیار کرو' اللہ تم سے

محبت کرے گا۔]

۴- یہ سمجھنا ضروری ہے کہ آج کی ضرورت یہ ہے کہ دعوت و جہاد میں رسالت کی طرف دعوت کو یہی مقام حاصل ہو۔ اس کے بغیر اللہ کا اقرار بھی کوئی معنی نہیں رکھتا' کجا کہ جمہوریت اور انسانی حقوق جیسی سماجی اقدار پر اتفاق و اقرار۔ ورنہ یہودی توحیدِ الٰہی کا عقیدہ رکھتے تھے' عیسائیوں کو موحد ہونے کا دعویٰ تھا' اور ان کی عبادات و اخلاقی فضائل کی تعریف خود قرآن نے فرمائی ہے۔ مگر وہ مغضوب اور ضال ٹھیرے کہ ایمان بالرسالت سے انکاری تھے۔

۵- یہ سمجھنا ضروری ہے کہ ایمان بالرسالت اس معنی میں بھی فیصلہ کن ہے کہ اللہ کی طرف سے نصرت' نجات اور غلبے کا وعدہ' رسولوں سے اور ان لوگوں سے ہے جو رسول مبعوث پر حقیقی معنوں میں ایمان لائیں' تن من دھن سے اس کے پیچھے چلیں' اور اس کے اعوان و انصار بنیں: وَلَقَدْ سَبَقَتْ كَلِمَتُنَا لِعِبَادِنَا الْمُرْسَلِيْنَ ○ اِنَّهُمْ لَهُمُ الْمَنْصُوْرُوْنَ ○ وَاِنَّ جُنْدَنَا لَهُمُ الْغٰلِبُوْنَ ○ (الصافات ۳۷:۱۷۱-۱۷۳) "اپنے بھیجے ہوئے بندوں سے ہم پہلے ہی وعدہ کر چکے ہیں کہ یقیناً ان کی مدد کی جائے گی اور ہمارا لشکر ہی غالب ہو کر رہے گا"۔

۶- یہ سمجھنا ضروری ہے کہ ازل سے جو معرکہ چراغ مصطفویؐ اور شرار بولہبی کے درمیان برپا ہے' اور جو آج اسلام اور مغرب کے درمیان تہذیبی جنگ کی صورت اختیار کر رہا ہے' وہ دراصل انسانوں کے دل اور زندگیاں جیتنے کا معرکہ ہے۔ دل فتح ہوں گے تو غلبہ دین حاصل ہوگا۔ قوت سے زمین فتح ہو سکتی ہے' اموال فتح ہو سکتے ہیں' سیاسی اقتدار پر قبضہ ہو سکتا ہے' مگر زندگیاں فتح نہیں ہو سکتیں اور دلوں پر قبضہ نہیں ہو سکتا۔ دلیل سے موافقت اور حمایت حاصل ہو سکتی ہے' مگر یکسوئی' لگن اور جاں بازی اور سرفروشی نہیں۔ دل جیتنے کا راستہ صرف ایک ہے۔ لوگ رسالت محمدیؐ

کی صداقت پر ایمان لے آئیں' آپؐ کے ہاتھ میں اپنے ہاتھ دے دیں' اپنے دل آپ کی محبت سے بھر لیں' آپؐ کے آستانے پر سر رکھ لیں' آپ کی اطاعت و محبت اور آپؐ پر اعتماد و یقین سے سرشار ہو کر آپؐ کے پیچھے پیچھے چل پڑیں۔ پہلے بھی لوگ اور دل اسی طرح فتح ہوئے تھے' تہذیبی جنگ اسی طرح جیتی گئی تھی' آج بھی اسی طرح فتح ہوں گی' اور اسی طرح جنگ جیتی جا سکے گی۔

۷- اس بات کو سمجھنا بڑا اہم ہے۔ یقیناً ہمیں اسلام کی حقانیت اور برتری ثابت کرنا چاہیے' ہمیں بتانا چاہیے کہ سودی معیشت انسان کے لیے کتنی تباہ کن ہے' اسلام کے سیاسی' معاشی اور معاشرتی و خاندانی نظام میں کیا محاسن ہیں' اسلام کی خوبیاں کیا ہیں؟ لیکن ہمیں یہ بھی ملحوظ رکھنا چاہیے کہ ان سب کاموں کی حیثیت زمین کو نرم و ہموار اور فضا کو سازگار بنانے کی سی ہے۔ لوگ یہ سب کچھ مان بھی لیں' لیکن محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صداقت پر ایمان نہ لائیں' تو تہذیبی جنگ میں کامیابی کی راہ ہموار نہ ہوگی۔ کتنے لوگ ہیں جو اسلام کی تعریف کرتے ہیں' اس کے آرٹ اور فنِ تعمیر کی داد دیتے ہیں' اس کی روحانیت اور تصوف کے ثنا خواں ہیں' لیکن وہ محمد رسولؐ اللہ کو اللہ کا رسول مان کر آپؐ کا اتباع کرنے کے لیے تیار نہیں۔ اس لیے وہ رسالت کے مشن کے اعوان و انصار نہیں بن سکتے۔

۸- اسی طرح اگر ہم یہ ثابت بھی کر دیں اور ہمیں یہ ثابت ضرور کرنا چاہیے' لیکن اس مشق کے محدود نتائج کو سامنے رکھتے ہوئے ـــــ کہ اسلام میں بھی جمہوریت ہے۔ اسلام دوسروں سے بڑھ کر حقوقِ انسانی کی ضمانت دیتا ہے۔ اسلام نے عورتوں کو وہ مقام دیا ہے جو آج تک مغرب نے بھی نہیں دیا ہے۔ اسلامی حدود ظالمانہ نہیں بلکہ منصفانہ اور زیادہ رحم دلانہ ہیں' تو اس سے بھی دلوں کے جیتنے کے امکانات روشن نہ ہوں گے۔ اس کے لیے عقلی اتفاق سے زیادہ رسولؐ پر اعتماد و محبت درکار ہے۔

چنانچہ ہمارے کرنے کا سب سے بڑا کام یہ ہے کہ ہم دعوت الی الرسالت کو اپنے ایجنڈے پر سرفہرست مقام دیں۔

رسول اللہؐ کی طرف دعوت کا طریقہ

ہمارا مطلب یہ نہیں کہ ہم غیر مسلموں کے سامنے بے ڈھنگے طریقے سے' صرف یہ کہنا اور لکھنا شروع کر دیں اور اسی کو اتمامِ حجت سمجھ بیٹھیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سچے رسول تھے' حضورؐ پر ایمان لاؤ' یا کفر کے فتوے جاری کرنے شروع کر دیں۔ نہیں' بلکہ ہمارا مطلب یہ ہے کہ:

- اوّل: ہم ہر ممکن طریقے سے' تحریر و تقریر سے' جدید ذرائع ابلاغ سے' لوگوں کو آپؐ کی شخصیت کے بے مثال حسن' آپؐ کے خلقِ عظیم کے جمال' آپؐ کی رحمت' رافت' شفقت اور انسانیت کے عدیم المثال کردار سے آگاہ کریں' بار بار کریں' بہ کثرت کریں' نئے نئے اسلوب سے کریں' خصوصاً ان کے سامنے کریں' اور ان کی زبانوں میں کریں۔ وہ جو آپؐ کے سب سے بڑے دشمن تھے' اگر آپؐ سے چمٹ کر رہ گئے تو آپؐ کی نرمی اور محبت کی وجہ سے' دشمن آ کر اگر آپؐ کے بے دام غلام بن گئے تو آپؐ کے اخلاق حسنہ کی وجہ سے۔
- دوم: ہم ــــ وہ بھی جو داعیانِ حق ہیں' اور وہ بھی جو عام مسلمان ہیں ــــ اپنے برتاؤ' سلوک اور گفتگو کو جتنا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق و کردار کا نمونہ بنا سکیں' بنائیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھنے کے لیے صرف کتابیں' تقریریں اور ویڈیو نہ ہوں' بلکہ ہماری اپنی زندگیوں میں بھی لوگوں کو آپؐ کی کوئی نہ کوئی کرن اور جھلک نظر آ سکے۔ ہمارے گھر' ہماری پبلک سرگرمیاں' ہماری مساجد' حضورؐ کی زندگی اور پیغام کا نور پھیلائیں' مسجدیں نہ ماننے والوں کا اسی طرح استقبال کریں جس طرح حضورؐ نے نجران اور ثقیف کے وفود کا خیر مقدم فرمایا۔ یہ اسی وقت ممکن ہے' جب ہماری حالت کسی

بھی درجے میں، اقبال [م:۲۱ اپریل ۱۹۳۸ء] کے اس شعر کی مصداق بن جائے:

نوائے او بہ ہر دل سازگار است
کہ در ہر سینہ قاشے از دل اوست [5]

- سوم: پھر یہ بھی ضروری ہے کہ ہم حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات، اخلاق حسنہ اور اسوۂ حسنہ کو پیش کرنے کا ایسا اسلوب وضع کریں کہ دشمنوں نے آپ کے خلاف جو کچھ کہا ہے، بغیر مناظرہ بازی کے اس کا ازالہ ہو جائے۔ بات کرنے والا اچھی طرح جانتا ہو کہ فساد کی جڑ کیا ہے، اور کسی بحث ونزاع کے بغیر وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات اقدس کو اس طرح متعارف کرائے کہ اس فساد کی جڑ خود بخود کٹ جائے۔
- چہارم: حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے دین اور پیغام کو عمل کا جامہ پہنانے کی جدوجہد تو بہر حال اصل کام ہے۔

امام مسلم [م: ۸۷۰ء] روایت درج کرتے ہیں کہ حضورؐ نے فرمایا: 'اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں محمدؐ کی جان ہے، اس اُمت میں سے جو میرے بارے میں سنے، یہودی ہو یا عیسائی، پھر وہ جو میں لایا ہوں اس پر ایمان لائے بغیر مر جائے، وہ آگ میں جائے گا'____ امام محی الدین نوویؒ [م: ۶۷۶ھ] کہتے ہیں کہ اس اُمت سے مراد ایک داعی اُمت ہے، یعنی آپؐ کی رسالت سے لے کر قیامت تک تمام اہلِ زمین کے لیے۔ لیکن امام غزالیؒ [م: ۱۱۱۱ء] بڑی اہم بحث اٹھاتے ہیں: ''سننے'' کا کیا مطلب ہے؟ کیا صرف کانوں سے نام سن لینا؟____ نہیں، وہ کہتے ہیں، اس سے حضورؐ کی زندگی اور پیغام کے بارے میں اس طرح سننا مراد ہے، جو دل و دماغ کے ماننے کے لیے ضروری ہے۔ ورنہ جن پر سنانے کی ذمہ داری ہے، وہ زیادہ آگ کے مستحق ہو سکتے ہیں۔ آج تو نہ ماننے والوں کی عظیم اکثریت نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا

۵- یعنی اس کی آواز ہر دل کے لیے سازگار ہے۔ ہر سینے میں اس کے دل کا ایک ٹکڑا ہے۔

نام ہی سنا ہے' سنا ہے تو سرسری طور پر یا مخالفانہ انداز میں۔ جن لوگوں کو کما حقہ سنایا گیا ہے' وہ بھی برائے نام ہیں۔ پھر اربوں انسانوں کے اپنے رسول اور آخری رسول پر ایمان نہ لانے کے لیے مسئول' ذمہ دار اور جواب دہ کون ہے؟ کیا ہم نہیں؟

جس طرح آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک ایک ملک میں اپنے ترجمان اور نمایندے بھیجے تھے' آج ایک ارب سے زائد مسلمان دنیا کے گوشے گوشے میں آپؐ کے ترجمان اور نمایندے ہیں۔ ان کے ہاتھ میں آپؐ کا خط ہے۔ جس کو بھی اپنی اس پوزیشن اور ذمہ داری کا احساس ہوا سے تڑپ کر کھڑا ہو جانا چاہیے۔ سلیقے سے' حکمت سے' موعظہ حسنہ سے' انسانوں کو حضورؐ سے قریب لانا چاہیے۔ جتنا زور ہم آپؐ کا دین پیش کرنے پر لگاتے ہیں' اتنا ہی اہتمام ہمیں آپؐ کی ذات' شخصیت' کردار' اسوۂ حسنہ اور زندگی کو پیش کرنے پر لگانا چاہیے۔ جو سراج منیر سے جتنا قریب آئے گا' اس کا دل کھلا ہوگا' وہ حضورؐ کی روشنی اور حرارت میں سے حصہ پائے گا۔ جتنے لوگ حضورؐ کی رسالت پر ایمان لاتے جائیں گے' آپؐ کے آستانے سے وابستہ ہوتے جائیں گے' اتنا ہی تہذیبی جنگ میں حضورؐ کے پیغام کی فتح کے امکانات بڑھتے جائیں گے۔

یہ ایک قرض ہے جو ہم سب پر ہے' اور ہم میں سے ہر ایک کو اسے ادا کرنے اور اپنا حصّہ ڈالنے کے لیے آگے بڑھنا چاہیے۔[جولائی ۱۹۹۶ء' مارچ ۲۰۰۶ء]

❑❑❑

قانون توہینِ رسالتؐ کی مخالفت کا جائزہ

توہینِ رسالتؐ کا حالیہ مقدمہ[1]، معمول کے مطابق محض جرم وسزا کا ایک مقدمہ ہوتا تو کوئی بات نہ تھی۔ اگر دونوں ملزم بے گناہ تھے' یا ان کا جرم شرعی معیار شہادت کے مطابق ثابت نہ ہوسکا تھا' یا اس میں کوئی ادنیٰ سا بھی شبہہ تھا' تو حق وانصاف کا تقاضا یہی تھا کہ ان کو بری کردیا جاتا۔ اس حق وانصاف اور رحم ودرگزر کا' جس کی تعلیم ہمیں اسی صلی اللہ علیہ وسلم نے دی ہے' جس کی توہین کا یہ مقدمہ تھا' جس نے بدترین دشمن کے ساتھ بھی عدل ورحم کا برتاؤ کیا ہے' اور ہر قیمت پر عدل کرنے کا حکم دیا ہے' اور یہ تو ہمارے معاہد اور برابر کے شہری تھے۔

مقدمے میں دلچسپی کیوں؟

مگر پورے مقدمہ کے دوران جس طرح اور جس پیمانے پر طاقت ور بیرونی اور اندرونی قوتیں اثر انداز ہوتی رہیں' اس نے مذکورہ مقدمے کو ایک غیر معمولی نوعیت دے دی

۱۔ ۱۹۹۳ء میں' گوجرانوالہ کے نواحی شہر قلعہ دیدار سنگھ میں' مبینہ طور پر دو عیسائی نوجوانوں نے رسولؐ اللہ کی شان میں گستاخی پر مبنی مواد پھیلایا' جس پر ان کے خلاف توہینِ رسالتؐ کا مقدمہ چلا اور ڈسٹرکٹ سیشن کورٹ نے انھیں سزائے موت سنائی' مگر ہائی کورٹ میں وہ بری ہوگئے۔

ہے۔ اس نے توہینِ رسالتؐ کے معاملے کو ہمارے مقدر کا' ہمارے حال اور مستقبل کا ایک آئینہ بنا دیا ہے۔ اس کی وجہ سے ملزمان کی برأت بھی مشتبہ ہوگئی ہے' جو یقیناً ان کے ساتھ ایک بے انصافی ہوئی ہے۔

اس آئینے میں وہ ساری کھلی اور چھپی صورتیں بالکل بے نقاب ہوگئی ہیں' جو آج ہمارے مستقبل کی نقشہ گری اور ہمارے مقدر کے بنانے اور بگاڑنے میں کلیدی کردار ادا کر رہی ہیں۔ ان صورتوں میں' اندرونی بھی ہیں اور بیرونی بھی' تہذیبی بھی ہیں اور سیاسی بھی' فکری بھی ہیں اور ابلاغی بھی۔ اس آئینے میں ہم یہ بھی دیکھ سکتے ہیں کہ ہماری بربادی کے مشورے کہاں ہو رہے ہیں' جنگ کا نقشہ کیا ہے' محاذ کہاں کہاں کھولے جا رہے ہیں' مورچے کہاں کہاں بنائے گئے ہیں' چالیں کیا کیا چلی جا رہی ہیں' دُور مار توپیں کدھر کدھر سے گولہ باری کر رہی ہیں' ہتھیار کون کون سے استعمال ہو رہے ہیں' پیش قدمی کن کن راستوں سے ہو رہی ہے' اندر کون کون ایجنٹ بنے ہوئے ہیں' عزائم کیا ہیں اور اصل ہدف کیا ہے؟ ___ اور یہ بھی کہ ___ ہماری قوت کا اصل راز کیا ہے' ہم بازی کیسے پلٹ سکتے ہیں' بلکہ جیت سکتے ہیں۔

مغرب اور مغرب پرست

ایک چہرہ مغرب کا ہے' اس کے حکمرانوں' اہل کاروں اور سفارت کاروں اور ذرائع ابلاغ کے سحرکاروں کا چہرہ' جو پورے مقدمے کے دوران تیز تیز چلتے' بھاگ دوڑ کرتے نظر آتے رہے۔ یہ چہرہ اب کچھ ایسا ڈھکا چھپا بھی نہیں رہا۔ ذرا موقع نکلتا ہے' فوراً اُوپر سے تہذیب' روشن خیالی اور انسانی ہمدردی کا چھلکا اتر جاتا ہے' اور نیچے سے وہی مسلمان اور اسلام کی دشمنی کا چودہ سو سال پرانا رویہ اور پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف نفرت اور غصہ ٹپکاتا ہوا چہرہ نمودار ہو جاتا ہے۔

سیکولرازم اور انسانی حقوق کی علم بردار ریاستیں بالآخر محض ''عیسائی'' ریاستیں ثابت

ہوتی ہیں' جو ہر ملک کے ملکی قوانین کے خلاف ''عیسائی حقوق'' کے لیے سرگرم ہو جاتی ہیں۔ فلسطین ہو یا بوسنیا' کشمیر ہو یا چیچنیا' الجیریا ہو یا فرانس ـــــ چہرہ روشن' اندرون چنگیز [۹ لاکھ ۴۰ ہزار انسانوں کا قاتل تاتار حکمران۔ م: ۱۲۲۷ء] سے تاریک تر۔ مغرب کی یہ قوتیں ہمارے ہاں تہذیبی اور سیاسی غلبہ رکھتی ہیں' ہماری قسمت کے ساتھ کھیل رہی ہیں' یہاں تک کہ اب ہمارا ایک قانون اور ہمارے دو شہریوں کے خلاف' ہماری عدالت میں ایک مقدمہ بھی ان کے غلبے سے آزاد نہیں۔

ایک چہرہ مغرب کے فرزندوں کا ہے' جو برطانوی مورخ لارڈ [تھامس بابنگٹن] میکالے [م: ۱۸۵۹ء] کے خواب کی مکمل تعبیر ہے: ''خون اور رنگ کے اعتبار سے تو ہم میں سے نہیں' مگر مذاق اور رائے' الفاظ اور سمجھ کے اعتبار سے انگریز''۔ یا' لبنانی ادیب خلیل جبران [م: ۱۹۳۱ء] کے الفاظ میں: ''[جن کے جسم خواہ یہاں پیدا ہوئے ہوں' مگر] ان کی روحوں نے مغربی ہسپتالوں میں جنم لیا ہے۔ جو فصاحت و بلاغت کے دریا بہاتے ہیں' مگر ہمارے [فرنگی سامراجیوں] کے سامنے کمزور اور گونگے ہیں۔ جو آزادی کے علم بردار ہیں' مصلح ہیں' پرجوش ہیں' مگر اپنے اسٹیجوں پر' اہلِ مغرب کے سامنے اطاعت کیش اور رجعت پسند ہیں'' ـــــ یہ فرزندانِ مغرب' توہینِ رسالتؐ جیسے معاملات میں ایک سو ایک فی صد مغرب کے ہم نوا رہتے ہیں' مغرب سے بڑھ کر پیش پیش ہوتے ہیں۔

ایک چہرہ ان کا ہے' جو کسی طرح بھی لارڈ میکالے کے خواب کی مکمل تعبیر نہ بن سکے' وہ اسلام اور ملّت سے اپنا رشتہ کھرچ نہیں سکے' لیکن اس کے باوجود وہ کسی نہ کسی درجے میں فرنگی افکار کے جادو میں گرفتار ہیں۔ ان کے مزاج کے لیے بھی یہ قبول کرنا مشکل ہے کہ توہینِ رسالتؐ کی سزا موت ہو۔

وہ پوچھتے ہیں: کیا یہ سخت سزا قرآن سے ثابت ہے؟ کہیں یہ مُلا کی تنگ نظری اور شدت کا شاخسانہ تو نہیں؟ جو رحمت للعالمینؐ تھے اور جنھوں نے گالیاں کھا کر دعائیں دیں' ان

کی توہین پر ایسی سخت سزا! دنیا ہمارے بارے میں کیا کہے گی، ہمیں کیا سمجھے گی، ہم اسے کیا منہ دکھائیں گے؟

خود نگری اور مستقبل بینی کا یہ آئینہ ہمارے ہاتھوں میں اگر مسئلہ توہینِ رسالتؐ کے ذریعہ آیا، تو بالکل بجا آیا:

قوم را سرمایہ قوت ازو
حفظ سر وحدت ملّت ازو [۲]

"ماز حکم نسبت او ملتیم": آنحضورؐ کی ذات مبارک ہی ہماری قوت کا سرمایہ ہے، ہماری وحدت کا راز آپؐ سے وابستگی میں ہے، آپؐ سے نسبت ہی نے ہمیں ایک ملّت بنایا ہے بلکہ ہمارے جسد ملّی میں رسالت ہی کی جان پھونکی گئی ہے، اسی کے دم سے ہمارا دین ہے، ہمارا آئین ہے:

حق تعالیٰ پیکر ما آفرید
وز رسالت در تن ما جاں دمید
از رسالت در جہاں تکوین ما
از رسالت دین ما آئین ما [۳]

مقامِ مصطفیؐ، واضح ہدف

مغرب کا اضطراب اور شور و غوغا قابلِ فہم ہے۔ اس لیے نہیں، جیسا بعض لوگ [گستاخیِ رسولؐ کے مرتکب] سلمان رشدی کی یاوہ گوئی کے وقت سے کہہ رہے ہیں کہ وہ یہ سمجھنے

۲- قوم کی طاقت کا سرمایہ اسی [محمدؐ] سے ہے، اور قوم کی وحدت کے راز کی حفاظت بھی اسی [محمدؐ] سے ہے۔

۳- اللہ تعالیٰ نے ہمارے جسم کو پیدا کیا، اور رسالتؐ کے ذریعے ہمارے جسم میں روح پھونکی۔ دنیا میں ہماری زندگی رسالتؐ کی وجہ سے ہے، اور رسالتؐ میں ہی ہمارا دین اور ہمارا آئین ہے۔

سے قاصر ہیں کہ مسلمانوں کے نزدیک رسولؐ کا مقام کیا ہے' اور کیوں ہے۔ مغرب سے ہماری مراد سارے اہلِ مغرب نہیں' تاہم ان میں سے اکثر کے بارے میں یہ بات صحیح ہے۔ اور مغرب کے طلسم میں گرفتار سادہ دل مسلمانوں کے بارے میں بھی۔ یقیناً ان سب کو سمجھانے کی ضرورت ہے' ان کو سمجھا لینے ہی میں ہماری کامیابی پوشیدہ ہے۔ مگر جو حکمران' سفارت کار' دانش ور اور ذرائع ابلاغ کے سحر کار قانونِ توہینِ رسالتؐ کے خلاف پیش پیش ہیں' وہ اسی لیے ہیں کہ وہ جانتے ہیں کہ مسلمان ملّت کی زندگی' وحدت اور قوت و توانائی کا راز اور ان کی سربلندی کا راز بھی حضورؐ کے ساتھ وابستگی اور عشق و محبّت میں پوشیدہ ہے' ''در دلِ مسلم مقامِ مصطفیٰؐ است''۔

اسی لیے ہزار سال سے اُوپر مدت ہوگئی' ان کے نقشہ جنگ کا ہدف یہی مقام مصطفیٰؐ ہے۔ وہ جانتے ہیں کہ ملت اسلامیہ کا یہی ''قلب'' اور ''دارالحکومت'' ہے۔ اس کی شکست و ریخت' بربادی اور اس پر قبضہ کے بغیر اس ملت کو زیر کرنے کا اور کوئی نسخہ نہیں۔ اسی لیے آنحضورؐ کی ذات ان کے سارے حملوں کا اوّلین ہدف رہی ہے' اور ہے۔ اسی لیے وہ مسلسل ہر قسم کے انتہائی غلیظ وار' آپؐ کے خلاف کرتے رہے ہیں۔ اسی لیے سلمان رشدی ان کی آنکھوں کا تارا ہے' یورپ کی حکومتوں کے سفارتی تعلقات اور تجارتی مفادات اس کے خلاف ''فتویٰ'' کے محور پر گھوم رہے ہیں۔ اسی لیے تسلیمہ نسرین ان کی ہیروئن ہے۔ اسی لیے ہر وہ مسلمان جو: شریعت مصطفویؐ کو بے وقعت کرے' جو تعلیمات محمدیؐ کو مشکوک بنائے' جو مقامِ مصطفویؐ کو مجروح کرے' وہ انھیں محبوب ہے۔ اور یہ حکیمانِ مغرب کا فتویٰ ہے:

وہ فاقہ کش کہ موت سے ڈرتا نہیں ذرا
روحِ محمدؐ اس کے بدن سے نکال دو

اسی لیے مذکورہ دو افراد کے خلاف مقدمہ دائر ہوتے ہی' غیر مسلم دنیا کے ذرائع ابلاغ اور سفارت کار حرکت میں آ گئے اور یہ واقعہ عالمی شہرت کا حامل بن گیا۔ ان سب کا ہدف ملزموں کی بے گناہی ثابت کرنا نہیں' بلکہ توہینِ رسالتؐ کے قانون کی تنسیخ رہا ہے۔ آل انڈیا

ریڈیو' بی بی سی' وائس آف امریکا' وائس آف جرمنی کی نشریات' اخبارات' رسائل و جرائد میں مضامین اور خبروں کا ایک سلسلہ چل پڑا۔ انھی بیرونی لابیوں کے ساتھ پاکستان کا ہیومن رائٹس کمیشن بھی متحرک ہوگیا۔

امریکا میں پاکستانی سفیر' ملیحہ لودھی' گوجرانوالہ گئیں اور ملزموں کی ضمانت کے لیے عدالت پر زور ڈالا۔ امریکی نائب وزیر خارجہ' رابن رافیل نومبر ۱۹۹۳ء میں اسلام آباد آئیں' تو وزیراعظم پاکستان بے نظیر بھٹو کے ساتھ مذاکرات کے دوران اس کیس کو اٹھایا۔ پاکستانی سیکرٹری خارجہ نے انھیں یقین دلایا کہ ''ملزموں کو ضمانت پر رہا کر دیا جائے گا''۔ وزیراعظم بے نظیر بھٹو نے اس مقدمے میں ذاتی دلچسپی لی اور جب مجرموں کو سزا ہوئی تو انھیں ''سخت دکھ'' ہوا۔ اپریل ۱۹۹۴ء میں پاکستان کی وفاقی کابینہ نے موصوفہ کی صدارت میں' توہین رسالتؐ کے مرتکب فرد کے لیے موت کی سزا کو دس سال قید کی سزا میں تبدیل کرنے کا فیصلہ کیا۔

پھر جب ملزموں کو سیشن کورٹ سے سزا ہوگئی تو سارے بین الاقوامی' سفارتی اور ابلاغی ذرائع نے نفرت انگیز پروپیگنڈے کے ذریعے پاکستانی حکومت پر دباؤ ڈالنے کی مہم تیز تر کر دی۔ برطانوی ڈپٹی ہائی کمشنر' ملزمان سے ملاقات کے لیے جیل پہنچ گئے۔ لاہور ہائی کورٹ کے ایک بنچ نے' جو عارضی [ایڈ ہاک] ججوں پر مشتمل تھا' مسلسل روزانہ اپیل کی سماعت شروع کر دی۔ بالآخر ملزمان رہا ہوگئے اور راتوں رات ان کو جرمنی روانہ کر دیا گیا۔

عدالتوں کے فیصلے تسلیم کیے بغیر کوئی مہذب اور پُرامن معاشرہ قائم بھی نہیں ہوسکتا۔ امید کی جاسکتی ہے کہ ہائی کورٹ نے صحیح فیصلہ ہی کیا ہوگا۔ لیکن' اس مسلسل بین الاقوامی اور حکومتی دباؤ اور عدالتی کارروائی میں حیرت انگیز سرعت نے پورے فیصلے کو مشکوک بنا دیا۔ اس دباؤ کے آگے اس دباؤ کی کیا حیثیت اور کیا وزن' جو عدالتی کارروائی کے دوران اور فیصلہ کے بعد عوام نے لاہور کی سڑکوں پر نکل کر ڈالا۔ ہر تجزیہ نگار' پورا پس منظر جان بوجھ کر نظرانداز کر کے' سارا زور عوامی احتجاج کی مذمت کرنے میں لگاتا رہا۔ ہم بھی کسی عدالت پر اس طرح

عوامی دباؤ ڈالنے کو صحیح نہیں سمجھتے۔ لیکن لوگوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ دوسری طرف سے وہ لوگ زبردست دباؤ ڈال رہے تھے' جن کی مٹھی میں حکمرانوں کے اقتدار کی کنجی ہے' ڈالر ہیں' دہشت گرد قرار دینے کی لاٹھی ہے اور 'مہذب' بھی کہلاتے ہیں۔

تہذیب کے دعووں کے ساتھ اب مغرب کے لیے قرونِ وسطیٰ کی طرح دشنام طرازیاں تو ممکن نہیں' البتہ ان کی جگہ آج کے رائج الفاظ کے پردے میں توہین رسالتؐ کے قانون پر حملہ ہو رہا ہے: ''یہ قانون' انسانی اور بنیادی حقوق کے خلاف ہے' مذہبی آزادی کے خلاف ہے' اظہار رائے کی آزادی کے خلاف ہے' اقلیتوں کے خلاف تعصب اور امتیاز پر مبنی ہے' اقلیتی فرقوں کے سر پر ننگی تلوار لٹکا دی گئی ہے' فرقہ واریت اور ذاتی عناد کی بنا پر' اس قانون کا غلط استعمال ہو رہا ہے' اس سے مُلا' بنیاد پرستی' مذہبی جنون اور تنگ نظری کا زور بڑھ گیا ہے' تشدد کے واقعات میں اضافہ ہوا ہے'' وغیرہ وغیرہ۔

توہین رسالتؐ کے لیے سزا' اس مقصد کے لیے رائج الوقت قانون' اس کا استعمال اور اس بارے میں خدشات کو حالیہ مقدمہ سے الگ کر کے دیکھا جائے' تب ہی ایک منصف مزاج آدمی اس قانون کے خلاف سارے مباحث میں کسی صحیح نتیجے تک پہنچ سکتا ہے۔

توہینِ رسالتؐ، جرم ہے یا نہیں

- بنیادی اور اوّلین سوال یہ ہے: ''کیا توہینِ رسالتؐ کوئی جرم نہیں ہے' اور جرم ہے بھی تو کیا اس پر کوئی سزا نہیں ہونا چاہیے؟''

رسالت تو بڑی چیز ہے' دنیا بھر میں ہمیشہ سے کسی بھی انسان کی عزت و آبرو کو تحریری یا زبانی نقصان پہنچانا' ایک جرم قرار دیا گیا ہے' اور اسی لیے ہر معاشرے میں ہتک عزت [defamation] کے جرم کے لیے سزا کا قانون موجود رہا ہے۔ کسی کے وہم و گمان میں کبھی یہ نہیں آیا کہ کسی دوسرے انسان کی بے عزتی اور توہین کرنا' ایک فرد کا انسانی اور بنیادی حق

ہوسکتا ہے' اور اگر اس پر سزا دی جائے تو گویا ایک بنیادی انسانی حقوق کی خلاف ورزی ہوگی۔ آج مغرب میں بھی یہی تصور اور یہی قانون ہے۔ ہاں' یہ بات ضرور ہے کہ مغربی قوانین کے تحت جس کی ہتک عزت ہوئی ہو' وہ خود ہی مدعی بن سکتا ہے۔ گویا' کیونکہ رسول' یا کوئی بھی دنیا سے گزرا ہوا آدمی' اب خود مدعی نہیں بن سکتا' اس لیے اس کی جتنی توہین کرلی جائے' یہ جرم قابلِ سزا نہیں ہوسکتا۔

لیکن اس سے زیادہ بودی دلیل اور کیا ہوسکتی ہے؟___ جب ایک عام آدمی کی ہتک عزت بھی قابلِ تعزیر جرم ہو' تو اس شخص کی ہتک عزت کیوں نہ قابلِ تعزیر ہو' جو ایک ارب سے زیادہ انسانوں کو اپنی جان و مال ہی نہیں' اپنی ذات سے بڑھ کر محبوب ہے۔ جس کی عزت اور نام سے ان کی عزت اور نام وابستہ ہے۔ جس کی توہین سے ان کی اپنی ذات' ان کے نام' ان کی اپنی عزت' ان کے دین' ان کے آئین اور ان کی ملّت کی توہین ہوتی ہے۔ آنحضورؐ کا مقام تو ہر مسلمان کے لیے یہی ہے۔ ایک مسلمان کی آبرو آپؐ کے نام سے ہے: آبروے ما ز نام مصطفیٰ است۔ وہ مسلمان ہو نہیں سکتا' جب تک حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اسے اپنی جان' مال' والدین' دنیا کی ہر چیز' یہاں تک کہ اپنے نفس اور ذات سے زیادہ محبوب نہ ہوں: لَا یُؤْمِنُ اَحَدُکُمْ حَتّٰی اَکُوْنَ اَحَبَّ اِلَیْہِ مِنْ وَّلَدِہٖ وَالِدِہٖ وَالنَّاسِ اَجْمَعِیْنِ (بخاری' مسلم)

سزائے موت کیوں؟

○ دوسرا سوال یہ ہے: ''کیا اس جرم کے لیے موت کی سزا بہت سخت اور احترام آدمیت کے خلاف ہے؟''

اگر اعتراض فی نفسہٖ موت کی سزا پر ہے کہ یہ وحشیانہ ہے' تو وہ زمانہ گزر گیا جب تہذیب کے جوش میں موت کی سزا کو بالکل منسوخ کرنے کی ہوا چلی تھی۔ اب تو انتہائی ''مہذب'' اور ''انسان دوست'' ہونے کے دعوے دار ملکوں میں' ایک کے بعد ایک' یہ سزا بحال

کی جارہی ہے' بلکہ ہر ملک جہاں یہ سزا ختم کی گئی' وہاں کی بھاری اکثریت موت کی سزا کی بحالی کے حق میں ہے' نہ صرف موت کی سزا' بلکہ جسمانی سزا کے حق میں بھی۔ ۱۹۹۴ء میں جب سنگاپور میں ایک امریکی کو ۶ بید مارنے کی سزا دی گئی تو' امریکی حکومت اور چند طبقات کی مخالفت کے باوجود' امریکیوں کی اکثریت نے اس سزا کی حمایت کی تھی۔ مغرب میں بھی اس قسم کے جرم پر سخت سزاؤں کے قوانین موجود ہیں' اور پہلے تو زندہ جلایا جاتا رہا ہے۔

اگر اعتراض یہ ہو کہ یہ سزا جرم کے مقابلے میں زیادہ سخت ہے' تو اس جرم کی نوعیت کا فیصلہ تو وہی کرسکتے ہیں' جن کو اور جن کے پورے معاشرے کو اس جرم سے نقصان پہنچ رہا ہو۔ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے کردار' اخلاق' صداقت' امانت' عدالت کو مجروح کرنا دراصل دین' ایمان' آئین' ریاست اور پوری اُمت مسلمہ' سب کو مجروح کرنا ہے۔ اس لیے مسلمان ہی اس معاملے میں مناسب قانون سازی کرنے کا حق رکھتے ہیں۔ ان کی مقننہ نے یہی سزا مناسب سمجھ کر یہ قانون منظور کیا ہے' ان کی اعلیٰ عدالتوں نے اس پر مہر تصدیق ثبت کی ہے۔ یہ ایک جمہوری طریقے سے طے کردہ قانون ہے' ان کی اعلیٰ عدالتوں نے اس پر مہر تصدیق ثبت کی ہے۔ یہ ایک جمہوری طریقے سے طے کردہ قانون ہے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ عمر قید کی سزا' موت کی سزا سے زیادہ وحشیانہ اور ظالمانہ سزا ہے' لیکن کوئی پارلیمنٹ یا کانگرس اپنی حدود میں یہ سزا دینے کا قانون بنائے' تو ہم اس کا فیصلہ کیسے بدلوا سکتے ہیں؟

امتیازی قانون؟

○ تیسرا سوال یہ ہے: ''کیا یہ قانون واقعی عیسائی اور ہندو جیسے اقلیتی فرقوں کے خلاف تعصب و امتیاز پر مبنی ہے' ان کو کچلنے' دبانے اور حقوق سے محروم کرنے کے لیے بنایا گیا ہے؟''

جہاں تک قانون کا تعلق ہے' اس میں ایک حرف اور ایک نقطہ بھی ایسا نہیں بتایا جاسکتا'

جو اقلیتی فرقوں کے خلاف ہو یا ان کا کوئی حق سلب کرتا ہو۔ اس کا اطلاق کسی نام نہاد مسلمان پر بھی بالکل اسی طرح ہوگا' جس طرح غیر مسلم پر۔ تعصب و امتیاز کی بات اس وقت صحیح ہو سکتی ہے' جب یہ گمان کیا جائے کہ اقلیتی فرقوں کی باقاعدہ نیت یا پروگرام ہے کہ وہ توہینِ رسالت کریں۔ ہمیں یقین ہے کہ عمومی سطح پر ان کا ایسا کوئی ارادہ یا منصوبہ نہیں' اگرچہ باہر والے ان سے یہ حرکت کروا کے انھیں اپنے مسلمان بھائیوں سے لڑانے اور انھیں پاکستان میں اپنے مقاصد کے لیے استعمال کرنے کے منصوبے رکھتے ہوں۔ اگر اعتراض کی بنیاد یہ ہو کہ اس میں دوسرے مذاہب کے پیغمبروں کی توہین کو شامل نہیں کیا گیا ہے' تو اس اعتراض کو' اسلامی نظریاتی کونسل' (IIC) اور شریعت کورٹ کی سفارش کے مطابق' دُور کیا جانا چاہیے۔

نظرِ ثانی کی گنجایش

○ چوتھا سوال یہ ہے: ''کیا یہ قانون اس لیے منسوخ کر دیا جائے' کہ ذاتی عناد یا فرقہ واریت کی خاطر اس کا غلط استعمال ہوا ہے' یا خدشہ ہے کہ ایسا ہو سکتا ہے؟''

اگر خود قانون میں ایسی کوئی خامی' خلا یا ابہام ہے' جو غلط استعمال کا ذریعہ بن سکتا ہے' تو ہماری رائے میں ایسی ہر خامی کو دُور کیا جانا چاہیے' اور ممکنہ غلط استعمال کے خلاف ہر ممکن تحفظ فراہم کرنا چاہیے۔ یہ ایسا معاملہ نہیں ہے کہ جو باہمی گفت و شنید سے حل نہ کیا جا سکتا ہو۔ ہمیں صرف مقامِ رسالتؐ کا تحفظ مطلوب ہے' بے گناہ لوگوں کو توہینِ رسالتؐ کے نام پر سزا دلوانا تو خود توہینِ رسالتؐ کے زمرے میں آ سکتا ہے۔

لیکن اگر قانون کا غلط استعمال کسی فرد یا پولیس کے غلط کردار کی وجہ سے ہے' تو اس کا علاج قانون کی منسوخی نہیں ہے۔ اس وجہ سے تو ہر قانون کا غلط استعمال ہو رہا ہے۔ قیامِ امن کے' انسداد دہشت گردی کے' لوٹ کھسوٹ اور بدعنوانیوں کی روک تھام کے قوانین حکومتیں بے دردی کے ساتھ اپنے سیاسی مخالفین کو کچلنے کے لیے استعمال کر رہی ہیں' کیا اس وجہ سے

ان سب کو منسوخ کر دیا جائے؟ قتل کے قانون کے تحت پولیس اور با اثر لوگ بے گناہوں کو پھانستے ہیں' ان کو لوٹا جاتا ہے' بعض پھانسی پر بھی چڑھ جاتے ہیں' کیا ان کو بھی منسوخ کر دیا جائے؟ کوئی بھی معقول آدمی یہ بات نہیں کہے گا۔ ذاتی عناد کی بنا پر بھی ملک میں بے شمار مقدمات کھڑے کیے جاتے ہیں۔ اس ظلم کا کوئی خصوصی تعلق اقلیتی فرقوں سے نہیں۔

اس قانون کا اثر

○ پانچواں سوال یہ ہے: "کیا قانون توہینِ رسالتؐ کی وجہ سے فرقہ واریت میں' مذہبی جنون میں' اقلیتوں کے خلاف تشدد میں اضافہ ہوا ہے' کہ یہ قانون منسوخ کر دیا جائے؟

اگر شدت پیدا ہوئی ہے تو شیعہ سنی فرقہ وارانہ سوچ رکھنے والے محض چند جنگجو عناصر میں۔ جبکہ عام سطح پر تو شیعہ سنی ہم آہنگی پہلے کی طرح قائم ہے اور یہ بڑی خوش آیند بات ہے۔ حد سے بڑھتی ہوئی قتل و غارت اور خوں ریزی کی وجہ نسلی اور لسانی تعصبات' سیاسی جھگڑے اور انتقامی کارروائیاں ہیں۔ اس میں کوئی دخل قانون توہینِ رسالت کا نہیں' اور نہ کسی دوسرے قانون کا۔ ان کارروائیوں کا شکار اکثریتی فرقہ ہے' نہ کہ اقلیتی فرقے۔

ایک ایسے معاشرے میں جہاں روز بروز تشدد اور خوں ریزی بڑھ رہی ہے' اس معاشرے میں کیا صرف اقلیتی فرقوں کے لوگ ہی اس لہر سے بالکل محفوظ رہ سکتے ہیں؟ پھر تشدد کے ہر واقعے کو فوراً اقلیت کے خلاف ظلم قرار دینا کہاں تک قرین انصاف ہے؟ پاکستان میں آج تک کوئی فرقہ وارانہ فساد نہیں ہوا۔ ذرا بھارت کے جمہوری' سیکولر' روشن خیال ملک پر بھی ایک نظر ڈال لیجیے' جہاں کوئی مذہبی قوانین نہیں' جہاں "مُلا" کا غلبہ نہیں' لیکن وہاں پر تو فرقہ وارانہ فسادات روز کا معمول ہیں۔

یہ قانون' اجماعِ اُمت

قرآن وسنت کے دلائل سے جس طرح شاتمِ رسولؐ کی سزا ثابت ہے' اور اس پر جس طرح فقہائے اُمت کا اجماع ہے۔ جس طرح اس پر' ماسوا دورِ غلامی کے' ہر مسلمان ملک میں' ہر زمانے میں عمل درآمد ہوتا رہا ہے' اور دورِ غلامی میں بھی مسلمان جس طرح اپنا خون دے کر اسے نافذ کرتے رہے ہیں' اسے بیان کرنے کی چنداں حاجت نہیں۔ اس بارے میں عام مسلمانوں کے درمیان نہ کبھی اختلاف رہا اور نہ کوئی شک وشبہہ۔ جس کو تحقیق کا شوق ہو' اس کے لیے حسب ذیل کتب کا مطالعہ کافی ہے:

۱- محمد اسماعیل قریشی: ناموسِ رسولؐ اور قانونِ توہینِ رسالت

۲- امام ابن تیمیہ: الصارم المسلول علی شاتم الرسول

۳- تقی الدین سبکی: السیف المسلول علی من سب الرسول

۴- ابن عابدین: تنبیہ الولاۃ والحکام علی احکام شاتم خیر الانام

رحمت عالمؐ اور یہ قانون

○ لوگ چھٹا سوال یہ پوچھتے ہیں کہ: "رحمت للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم نے تو گالیاں سن کر' پتھر کھا کر' دعا دی' اب ان کو گالی دینے والے کو موت کی سزا دی جائے؟"

ایسے لوگ رحمت کے مفہوم سے آگاہ نہیں۔ رحمت کا تقاضا جہاں عفو و درگزر ہے' وہاں انصاف بھی ہے۔ رحمت للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم نے: واقعہ افک میں قذف کے مرتکبین کو کوڑے لگوائے' زنا کے مجرموں کو سنگسار کرایا' مسلح لشکر لے کر نکلے جس نے بدر کے میدان میں ستر سرداران قریش کو تہہ تیغ کر دیا' فتح مکہ کے دن جب ہر جانی دشمن کو معافی مرحمت فرما دی گئی' چھ مرتدین اور شاتمین کے قتل کا حکم صادر ہوا۔ آپؐ یہ نہ کرتے تو فساد مچتا'

اور زیادہ ظلم برپا ہوتا۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کوئی حکم اپنی ذات کی خاطر نہیں دیا' دین اور ملت کے تحفظ کی خاطر دیا۔ جب رسالتؐ ہی ایمان کی' دین کی' ملت کی بنیاد ہے' اس کی زندگی کی ضمانت ہے' تو توہینِ رسالتؐ کے مجرم کو سزا دینا عین رحمت کا تقاضا تھا۔ اسی لیے یومِ قیامت کو ــــ جس دن نیکوکاروں کو انعام سے نوازا جائے گا' مگر بدکار جہنّم جھونکے جائیں گے ــــ اللہ تعالیٰ نے اپنی رحمت' رحمانیت اور رحیمیت کا دن قرار دیا ہے۔ (الفاتحہ' الانعام)

'مولوی حضرات' ہی نہیں......

شان رسالتؐ میں گستاخی کے مرتکب فرد کے لیے موت کی سزا کے قانون کی تائید اور حمایت کچھ فقہا و علما' ملاؤں اور جنونیوں ہی کا ''جرم'' نہیں ہے' بلکہ وہ اچھے اچھے مغربی تعلیم یافتہ مسلمان حضرات' جنھوں نے روح اسلام کو ضائع نہ کیا اور مقام محمدیؐ سے آگاہ رہے' کسی بھی مداہنت کے بغیر اس ''مذہبی جنون'' کے ''جرم'' میں شریک رہے۔

غازی علم الدین شہید [۴ دسمبر ۱۹۰۸ء - ۳۱ اکتوبر ۱۹۲۹ء] نے [شانِ رسالتؐ میں گستاخی پر مبنی کتاب کے ناشر] راج پال کو قتل [۶ اپریل ۱۹۲۹ء] کیا تو اس کے مقدمہ کی پیروی قائداعظم محمد علی جناح [م: ۱۱ ستمبر ۱۹۴۸ء] نے کی[۴] علامہ محمد اقبال نے رشک کے ساتھ فرمایا:

۴- غازی علم الدین کے خاندان نے مقدمے کی پیروی سے انکار کر دیا' تو لاہور کے مشہور بیرسٹر فرخ حسین نے ذاتی طور پر عدالت میں وکالت نامہ پیش کر دیا۔ خواجہ فیروز دین' خواجہ نیاز احمد' سلیم احمد اور میاں تصدق حسین خالد نے مقدمے کی پیروی کی۔ سیشن کورٹ نے ۲۲ مئی ۱۹۲۹ء کو علم الدین کے لیے سزائے موت کا حکم سنایا۔ بعدازاں مقدمہ لاہور کورٹ پہنچا تو میاں طالع مند اور فتح محمد نے بمبئی جا کر قائداعظم مرحوم سے ملاقات کی۔ قائداعظم نے خود مقدمے کی پیروی کی اور غازی علم الدین سے ملاقاتیں بھی کیں۔ مگر چیف جسٹس شادی لال نے ۱۷ جولائی ۱۹۲۹ء کو فیصلہ سناتے ہوئے سزائے موت برقرار رکھی۔ بعدازاں بیرسٹر فرخ حسین نے اسی مہینے برطانیہ کی پریوی کونسل میں اپیل کی' جو مسترد ہوگئی' اور پھر ۳۱ اکتوبر ۱۹۲۹ء کو میانوالی جیل میں علم الدین غازی کو تختہ دار پر لٹکا دیا گیا۔

''اسیں گلاں کردے رہے تے ترکھاناں دا منڈا بازی لے گیا''۔[5] (ہم باتیں کرتے رہ گئے' اور ایک بڑھئی کا بیٹا بازی لے گیا)۔ علم الدین شہید کو اپنے ہاتھوں سے قبر میں اتارا' اور اس فضا میں یہ شعر بھی کہا:

ان شہیدوں کی دیت اہلِ کلیسا سے نہ مانگ
قدر و قیمت میں ہے جن کا خون حرم سے بڑھ کر

شان رسالتؐ میں گستاخی کے جرم میں ایک خانساماں نے ایک انگریز میجر کی بیوی کا کام تمام کر دیا۔ سر میاں محمد شفیع [م: جنوری ۱۹۳۲ء] نے' جو برطانیہ کے زیر تسلط ہندستان میں وائسرائے کی ایگزیکٹو کونسل کے رکن بھی تھے' اس کے مقدمے کی پیروی کی۔ دوران بحث ان کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔

ہائی کورٹ کے انگریز جج نے انھیں بڑی حیرت سے دیکھتے ہوئے پوچھا: ''سر شفیع' کیا آپ جیسے ٹھنڈے دل و دماغ کا بلند پایہ وکیل بھی اس طرح جذباتی ہو سکتا ہے؟''

سر میاں محمد شفیع نے رنج اور حسرت بھرے لہجے میں جواب دیا: ''جناب' آپ کو نہیں معلوم' ایک مسلمان کو اپنے پیغمبرؐ کی ذات سے کتنی گہری عقیدت اور محبت ہوتی ہے۔ سر شفیع بھی اگر اس وقت وہاں ہوتا تو وہ بھی یہی کر گزرتا جو اس ملزم نے کیا ہے''۔[6]

ہمیں خوشی ہے کہ ہمارے بعض مسیحی بھائیوں نے اس قانون کے معاملے میں حق پسندانہ اور معتدل مسلک اختیار کیا ہے۔ صوبہ بلوچستان اسمبلی کے ڈپٹی اسپیکر' آنجہانی بشیر مسیح

۵- روزگار فقر' دوم' ص ۳۰۔ اسی طرح ایک مرتبہ علامہ اقبال نے فرمایا: ''میں تو یہ بھی برداشت نہیں کر سکتا کہ کوئی شخص میرے پاس آ کر یہ کہے کہ تمھارے پیغمبرؐ نے ایک دن میلے کپڑے پہنے ہوئے تھے۔ روزگار فقر' اوّل' ص ۱۳۔

۶- [حاشیہ از مرتب] یہ ۱۹۳۳ء کا واقعہ ہے: حیدرآباد سندھ کے آریہ سماجی لیڈر نتھورام نے 'ہسٹری آف اسلام' لکھی' جس میں رسول اکرمؐ کی شان میں سخت دریدہ دہنی کا مظاہرہ کیا۔ عدالت نے اسے معمولی سزا سنائی اور

کے الفاظ ایسے ہی موقف کے آئینہ دار ہیں' انھوں نے کہا تھا:

ہم اس [قانون] کے خلاف نہیں۔ کوئی بھی سچا مسیحی' توہین رسالت کا تصور نہیں کر سکتا' اور میں سمجھتا ہوں کہ اگر واقعی کوئی اس قبیح جرم کا مرتکب ہوتا ہے تو وہ موت سے بھی سخت سزا کا حق دار ہے۔ لیکن یہ نہیں ہونا چاہیے کہ کسی بے گناہ کو اس قانون کا نشانہ بنایا جائے۔[ے]

اسی طرح ماہنامہ کلام حق میں پادری ڈاکٹر کے ایل ناصر کے بیٹے میجر ٹی ناصر کے الفاظ ہیں:

ہم مسیحی' تعزیرات پاکستان کی دفعہ ۲۹۵-سی یعنی گستاخ رسولؐ [کی سزا] کے مخالف نہیں۔ ہم صرف یہ درخواست کرتے ہیں کہ ایک خصوصی کمیشن بنایا جائے۔ غیر جانب دارانہ تحقیقات کریں اور اگر ملزم واقعی مجرم ہو تو اس کو قانون کے مطابق سزا دی جائے' ورنہ بصورت دیگر رہا کر دیا جائے۔ مقدمہ بھی خصوصی عدالت میں چلایا جائے' اور ملزم کو تمام قانونی سہولتیں بہم پہنچائی جائیں' تاکہ اقلیتوں' خاص طور پر

کمشنر کی عدالت سے اس کی ضمانت منظور ہوگئی' جس پر مسلمانوں میں شدید اشتعال پھیل گیا۔ ستمبر ۱۹۳۴ء میں جب انگریزی عدالت کراچی میں نتھو رام کی اپیل زیر سماعت تھی' تب ایک تانگہ بان عبدالقیوم' بھری عدالت میں نتھو رام پر ٹوٹ پڑا' اور اسے جہنم واصل کر دیا۔ فرار ہونے کے بجائے ہنسی خوشی اپنے آپ کو پولیس کے حوالے کر دیا۔ مقدمہ چلا تو سزائے موت کا حکم سن کر کہا: ''جج صاحب' میں آپ کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ مجھے موت کی سزا دی۔ یہ ایک جان کس گنتی میں ہے' اگر میرے پاس لاکھ جانیں بھی ہوتیں تو ناموسِ رسولؐ پر نچھاور کر دیتا''۔ مقدمے کے دوران علامہ محمد اقبالؒ' مولانا ابوالکلام آزاد' مولانا ظفر علی خاں اور سید عطاء اللہ شاہ بخاری کو بطور گواہ طلب کرنے کی درخواست عدالت نے رد کر دی۔ عبدالقیوم نے ۱۹ مارچ ۱۹۳۵ء کو شہادت پائی (اہانت رسولؐ اور آزادی رائے' از ابوالامتیاز ع' س مسلم۔ مجلس نشریات اسلام' کراچی' ۲۰۰۰ء' ص ۶۸'۶۹)

۷- عالم اسلام اور عیسائیت' انسٹی ٹیوٹ آف پالیسی اسٹڈیز' اسلام آباد' جون ۱۹۹۴ء' ص ۴

مسیحی اقلیت کو تحفظ وانصاف کا احساس ہو[8] ــــ اور یہ مطالبات بجا ہیں۔[9]

اور کچھ سادہ لوح

لیکن ہمیں افسوس ہے کہ مسیحی لیڈروں کی اکثریت' سوچے سمجھے بغیر' قانون توہینِ رسالت کی اندھی مخالفت پر تل گئی ہے۔ اس طرح وہ ایک طرف مغربی سامراجی طاقتوں کے آلہ کار بھی بن رہے ہیں' دوسری طرف پاکستان میں اسلام دشمن اور سیکولر عناصر کے دوش بدوش کھڑے ہوگئے ہیں۔

ہم پورے خلوص اور دردمندی سے ان کی خدمت میں ادب سے عرض کریں گے' کہ اگر ان کے پیش نظر اس قانون کے بارے میں خدشات کے خلاف ضروری تحفظات حاصل کرنا ہے' بلکہ پاکستان کے شہری ہونے کے ناتے پاکستان میں اپنا جائز مقام حاصل کرنا ہے' تو انھوں نے ایک غلط راستہ اختیار کیا ہے۔ نہ بیرونی طاقتوں کی مداخلت سے انھیں یہ مقام حاصل ہوسکتا ہے' نہ سیکولر عناصر کی مدد سے کچھ پاسکتے ہیں' اگرچہ وہ اقتدار میں بھی آجائیں۔

ان کے لیے درست اور معقول راستہ یہ ہے کہ وہ محبِ اسلام ممتاز شہریوں اور حق پسند علما اور دینی جماعتوں سے گفت وشنید کا آغاز کریں۔ انھیں اپنے خدشات سے آگاہ کریں' ممکن ہوتو ایک مشترک ''مسلم اینڈ کرسچین کونسل'' تشکیل دیں۔ دلیل اور شواہد کے ساتھ مسلمانوں پر زور دیں کہ وہ خاص طور پر اس قانون کے ضمن میں اسلام کے قانون عدل وشہادت کے تقاضوں کی تکمیل یقینی بنائیں۔ وہ ایسی ترامیم کرانے میں ان کی مدد کریں جو قانون کو بے اثر

۸- عالم اسلام اور عیسائیت' انسٹی ٹیوٹ آف پالیسی اسٹڈیز' اسلام آباد' جون ۱۹۹۴ء' ص ۴

۹- قانون ۲۹۵' ج: ''جو شخص بھی زبانی یا تحریری الفاظ' یا ظاہری حرکات' اتہام' نسبت' طعن آمیز اشارے یا کنائے سے بلاواسطہ طور پر نبی کریم حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے مبارک نام کی بے حرمتی کرے گا' وہ جرمانے کے علاوہ سزاے موت یا عمر قید کا مستوجب ہوگا''۔

بنائے بغیر کی جاسکتی ہیں' اور ان کے ساتھ انھی بنیادوں پر معاملہ کریں' جو حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے نجران کے عیسائیوں[10] کے ساتھ اختیار کیں۔ ہمیں یقین ہے کہ اس طرح دونوں کے تعلقات بھی خوش گوار ہو جائیں گے اور ان مسائل کا حل بھی خوش اسلوبی سے نکل آئے گا۔

اسلامی قانون' امتیازی پہلو

شاید انھیں اسلام کے قانونِ عدل کے ان تقاضوں کا علم نہیں' جن کا نفاذ ان کے خدشات کے ازالے کے لیے کافی ہو سکتا ہے:

۱- حد کی سزا صرف حکومت دے سکتی ہے' کسی مسلمان کو قانون اپنے ہاتھ میں لینے کا اختیار نہیں۔

۲- عدالت کے لیے یہ بھی ضروری ہے' کہ وہ گواہوں کی مناسب جانچ پڑتال کرے۔ اس لیے کہ "حد" کی سزا میں شہادت کا معیار' عام شہادت کے معیار سے بہت زیادہ سخت اور غیر معمولی ہے۔ ایسے گواہوں کی شہادت قبول ہوتی ہے' جو گناہ کبیرہ سے اجتناب کرتے ہوں' صادق القول اور عادل ہوں' اور مزید برآں تزکیۃ الشہود کے معیار پر بھی پورا اترتے ہوں"۔[11]

۳- جرم ثابت ہونے میں ایک شبہ بھی رہ جائے تو شک کا فائدہ بھی اسلامی قانون کی رو

۱۰- نجران (Najran)' مکہ سے یمن کی جانب ۷۳ دیہات وقصبات پر مشتمل ایک علاقہ تھا' فتح مکہ (۸ھ) کے اگلے برس جو بڑے بڑے ۱۶ وفود بارگاہ رسالتؐ میں حاضر ہوئے' ان میں ایک وفد نجران سے بھی آیا' جس میں ۱۶۰ افراد شامل تھے۔ وہ تین چار روز مذاکرات کرتے رہے۔ اس دوران مسجد نبوی میں اپنے طریقے سے عبادت کی اجازت بھی لی۔ تاہم اسلام قبول نہیں کیا اور جزیہ دینے پر رضا مند ہو گئے۔ بعد ازاں ان میں سے متعدد لوگ اور بیشتر کی اولاد مسلمان ہو گئی۔

۱۱- محمد اسماعیل قریشی ایڈووکیٹ، ناموس رسولؐ اور قانون توہینِ رسالتؐ، ص ۳۶۶

سے ملزم کو پہنچتا ہے۔ حدیث مبارک ہے: ادرؤا الحدود بالشبهات، حدود کی سزاؤں کو شبہات کی بنا پر ختم کرو۔[۱۲]

۴۔ عدالت ملزم کی نیت کا تعین بھی کرے گی' کیونکہ "نیت کے بغیر اسلامی قانون میں کوئی جرم مستوجب سزا نہیں ہوتا"۔[۱۳]

۵۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فرمان بھی اسلامی قانون کا ایک بنیادی اصول ہے کہ "ایک مجرم کو بری کر دینے کی غلطی ایک بے گناہ کو سزا دینے کی غلطی سے بہتر ہے۔"[۱۴]

۶۔ بجائے اس کے کہ ہمارے مسیحی بھائی پاکستان کی سیکولر حکومت کے وعدوں پر زندہ رہیں یا باہر کی مسیحی طاقتوں سے آس لگائیں۔ کیا یہ بہتر نہ ہوگا کہ مسلمان' عیسائی' ہندو مل کر ایک متفقہ ترمیمی بل حکومت اور پارلیمنٹ کے سامنے پیش کر دیں' جو اسلامی قانون کے مطابق بھی ہو اور اقلیتوں کے لیے انصاف اور تحفظ کا ضامن بھی۔ ہماری رائے میں علما اور دینی جماعتوں کو اس مقصد کے لیے عیسائی رہنماؤں سے مکالمہ شروع کرنا چاہیے۔

کیا کریں؟

قانون توہینِ رسالت' پر مخالفانہ ردعمل نے جو آئینہ ہمیں دیا ہے' اس میں مسلم ملت کی قوت کا اصل سرچشمہ بھی عیاں ہو رہا ہے۔

یہ سرچشمہ وہی ہے جس کے پیچھے ہمارے دشمن چودہ سو سال سے آج تک لگے ہوئے ہیں۔ ہماری قوت و توانائی کا سامان: اس اسلحہ' قرض اور امداد میں نہیں ہے جو ہمارے دشمن خود

۱۲۔ ناموس رسولؐ اور قانون توہینِ رسالت' ص ۳۶۶

۱۳۔ ایضاً' ص ۳۶۷

۱۴۔ ایضاً بحوالہ سنن البیہقی' ج ۸' ص ۱۸۴

ہمیں فراہم کر رہے ہیں۔ یہ سرچشمہ تو روزِ اوّل سے دلِ مسلم میں مقامِ مصطفیؐ ہے‘ عشقِ مصطفیؐ ہے‘ اور ملت کی پوری زندگی میں اتباع اور اطاعت مصطفیؐ سے منسوب ہے۔ ہمیں اسی چشمہ سے سیراب ہونے میں لگ جانا چاہیے۔

آج تاریخ کا اسٹیج‘ اسلام اور مغرب کے درمیان معرکے کے لیے تیار ہو رہا ہے۔ بظاہر ہمارا اور مغرب کا کیا مقابلہ؟ نہ ہمارے پاس اسلحہ‘ نہ ٹکنالوجی‘ نہ معاشی ترقی‘ نہ اتحاد‘ نہ لیڈرشپ‘ نہ منزل اور نہ مقصد۔ لیکن ان میں سے ہر چیز ہمیں حاصل ہو جائے گی‘ اگر ہم قوت اور توانائی کے اس سرچشمہ تک پہنچ جائیں:

کیمیا پیدا کن از مشت گلے
بوسہ زن بر آستان کاملے
دل ز عشق او توانا می شود
خاک ہم دوش ثریا می شود [15]

اس سے زیادہ فریب انگیز مغالطہ اور کوئی نہیں ہو سکتا‘ کہ ہم یہ فیصلہ کرنے بیٹھ جائیں: ہم کو ”ترقی پسند“ بننا ہے یا ”بنیاد پرست“۔ ہمیں نہیں معلوم بنیاد پرست کے کیا معنی ہیں۔ لیکن ہم کو یہ ضرور معلوم ہے کہ ہماری بنیاد تو حضورؐ کی ذات‘ آپؐ کی لائی ہوئی کتاب‘ آپؐ کی سنت اور آپؐ کا اسوۂ حسنہ ہے۔ ہم‘ جو اس بنیاد کے ناتے بظاہر ”بنیاد پرست“ ہیں‘ فی الحقیقت سب سے بڑھ کر ترقی پسند ہیں۔ ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ اس ضمن میں اگر امریکا کی انگلی پکڑ کر چلے تو ترقی نہیں موت اور ذلت کا گڑھا ہمارا مقدر ہے۔ اس راہ کو چھوڑ کر چلنے والے ”ترقی یافتہ“ مسلمان ممالک کے ڈھانچے ہمارے سامنے بہت موجود ہیں:

۱۵- انسان کامل کے آستانے پر سر رکھ کر بوسہ دینے ہی سے ہماری مشت خاک سونے کا ہمالہ بنے گی‘ آپؐ کے عشق سے ہی ہمارے دل توانا ہوں گے اور ہماری ترقی آسمان سے باتیں کرنے لگے گی۔

کشودم پردہ را از روئے تقدیر
مشو ناامید و راہ مصطفیٰ گیر
مقام خویش اگر خواہی دریں دیر
بحق دل بند و راہ مصطفیٰ رو [16]

دامنش از دست دادن موت است، حضورؐ کا دامن ہاتھ سے چھوٹنا پروانہ موت ہے۔

آج کل مسلمان ہر جگہ' خصوصاً وطن عزیز پاکستان میں' زندگی اور موت کی کش مکش میں مبتلا ہیں۔ لوگ پوچھتے ہیں' علاج کیا ہے' حل کیا ہے؟ علاج اور حل تو ایک ہی ہے۔ پہلے بھی' قوم زندگی از دمِ او یافت' حضورؐ کے دم سے ہی زندگی ملی تھی' اور آج بھی سب کچھ آپ کا دامن پکڑ کے' آپؐ کا مشن پورا کرنے' اور آپؐ کے پیچھے چلنے ہی سے ملے گا:

قوت عشق سے ہر پست کو بالا کر دے
دہر میں اسم محمدؐ سے اُجالا کر دے
کی محمدؐ سے وفا تو نے تو ہم تیرے ہیں
یہ جہاں چیز ہے کیا' لوح و قلم تیرے ہیں

[اپریل ۱۹۹۵ء]

□□□

۱۶- کاش ہم تقدیر کے اس راز کو پا لیتے' مستقبل بنانے کی وہ راہ پکڑ لیتے جو ترقی اور عروج کی ضامن ہے' اور دنیا میں اپنا وہ مقام بنا لیتے جو ہمارا مقدر ہے۔ وہ راہ' راہ مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا اور کوئی نہیں۔

نئی صلیبی جنگ اور دینی مدارس

یہ ۲۳ جنوری ۱۹۹۵ء کی صبح تھی' جب پاکستانی اخبارات میں چیختی چنگھاڑتی سرخیاں شائع ہوئیں۔ ان کے مطابق پاکستانی وزیراعظم بے نظیر بھٹو صاحبہ کی حکومت دینی مدارس کے خلاف اعلانِ جنگ کر رہی تھی:[1]

- دینی مدارس کی چھان بین اور نصاب تبدیل کرنے کا فیصلہ' وزرائے اعلیٰ دو ہفتے کے اندر اقدامات کی رپورٹ پیش کریں گے' وزیراعظم کا صوبائی حکومتوں کو حکم۔
- دینی مدارس براہ راست غیر ممالک سے عطیات حاصل نہ کر سکیں گے اور دینی نصاب تعلیم کو یونیورسٹی سے منسلک کر دیا جائے گا۔
- دینی مدرسوں کو حساب کتاب دینا ہو گا۔

دہشت گردی اور فرقہ واریت کے خاتمے کے نام پر' یہ فیصلے وزیراعظم کی زیر صدارت ایک اعلیٰ سطحی اجلاس میں کیے گئے' اور ساتھ ہی ان پر عمل درآمد کرنے کے لیے فوری طور پر وزارتِ داخلہ میں ایک سیل بھی قائم کر دیا گیا۔

۱۔ [بالترتیب] روزنامہ جنگ' کراچی۔ روزنامہ نوائے وقت' لاہور اور روزنامہ مساوات' لاہور

وزارتِ داخلہ نے ہدایت جاری کی: ''اس کی پیشگی اجازت کے بغیر نہ کسی نئے دینی مدرسے کو رجسٹر کیا جائے' اور نہ کسی پرانے مدرسے کی رجسٹریشن کی تجدید کی جائے''۔ پولیس نے بچوں سے جبری ''بیگار'' لیے جانے کے الزام کی تحقیق شروع کر دی۔ وزیراعظم نے اس اخباری رپورٹ پر تحقیقات کی ہدایت دی کہ ایک مدرسے میں طلبہ کو زنجیروں سے باندھ کر قرآن کریم کی تعلیم دی جاتی ہے۔

ادھر بین الاقوامی سطح پر' ایمنسٹی انٹرنیشنل نے دینی مدارس کے خلاف محاذ سنبھال لیا ہے۔ حکومتی اداروں کے تعاون سے' چند غیر معیاری اور برائے نام دینی مدارس کے سروے کو بنیاد بنا کر' اس نے جون تک ایک رپورٹ منظرعام پر لانے کا اعلان کیا۔ اس میں دکھایا جائے گا:

> پاکستان کے دینی مدارس میں طلبہ کو آج کے تقاضوں سے بے خبر رکھا جاتا ہے' انھیں مارا جاتا ہے' زنجیروں سے باندھا جاتا ہے' ان سے جبری بیگار لی جاتی ہے' ان کی خوراک' رہایش اور صفائی کا معیار ناقص ہے' انھیں مدارس میں آزادیِ رائے اور دیگر بنیادی حقوق حاصل نہیں ہیں' انھیں جان بوجھ کر ناقص رکھا جا رہا ہے تاکہ وہ قومی زندگی کے کسی شعبہ میں کھپ نہ سکیں' ان کے نام پر چندہ اکٹھا کر کے مدارس کے منتظمین کھا پی جاتے ہیں اور طلبہ کو انتہائی خستگی کی حالت میں رکھ کر خود عیش کی زندگی بسر کرتے ہیں' اور ان مدارس میں طلبہ کو اسلحے کی ٹریننگ دے کر دہشت گرد بنایا جا رہا ہے۔[۲]

سوچا سمجھا حملہ

پاکستان کی [بے نظیر] حکومت نے یہ حملہ جس سوچی سمجھی تیاری کے ساتھ شروع کیا ہے' اس کا اندازہ صرف ایک بات سے لگایا جا سکتا ہے۔ ادھر صوبائی حکومتوں کو کوائف جمع

۲- مولانا زاہد الراشدی، ماہنامہ الشریعۃ، گوجرانوالہ' جنوری ۱۹۹۵ء

کرنے کا حکم ہوا' ادھر اگلے ہی دن لاہور کے روزنامہ دی نیـــــوز [The News] نے پنجاب کے دینی مدارس کے کوائف اور ایک ایک مدرسے کو ملنے والی زکوٰۃ کی تفصیلات شائع کرنا شروع کر دیں۔ ظاہر ہے کہ یہ معلومات حکومت ہی نے فوری طور پر بہم پہنچائیں' ورنہ نامہ نگار خود ۲۴ گھنٹے میں یہ کارنامہ انجام نہ دے سکتا تھا۔ ساتھ ہی یہ سرخی بھی جمائی گئی: ''مدارس لوہے کے چنے ثابت ہوں گے جو وزیراعظم سے چبائے نہ چبیں گے''۔[۳]

اس سے اگلے روز ''دستوری ماہرین'' کی بے سروپا آرا شائع کی گئیں: ''بیرونی امداد لینا دستور کی خلاف ورزی ہے۔ ملکی قانون کے خلاف ہے' یہ خارجہ پالیسی میں مداخلت ہے۔ مدارس' تعلیمی ادارے نہیں کیونکہ وزارتِ تعلیم نے ان کی منظوری نہیں دی ہے''۔ اور حکومت کی اپنی دھمکی یہ کہ: ''زکوٰۃ فنڈ سے دی جانے والی رقوم صرف ایک انتظامی حکم کے ذریعے بند کی جاسکتی ہیں''۔

بھارت میں بھی

شاید اس پر تعجب ہو' اگرچہ تعجب کی کوئی بات نہیں ہونی چاہیے کہ' اسی انداز' انھی الفاظ اور انھی بنیادوں پر دینی مدارس کے خلاف ایک مہم بھارت میں بھی چل رہی ہے۔

۲۱ نومبر ۱۹۹۴ء کو آدھی رات کے بعد دہلی سے بھیجے گئے کمانڈوز اور پولیس نے ندوۃ العلماء' لکھنؤ کی مشہور درس گاہ پر چھاپا مارا' طلبہ پر تشدد کیا اور انھیں گرفتار کیا۔ اس سے ملتا جلتا واقعہ دارالعلوم' دیوبند کے ساتھ بھی پیش آچکا تھا۔ صورت حال کی تصویر کشی کرتے ہوئے کل ہند ملی کونسل کے تحت ایک آل انڈیا دینی مدارس کنونشن کے سامنے اپنے کلیدی خطاب میں جناب قاضی مجاہدالاسلام قاسمی [م: ۴ اپریل ۲۰۰۱ء] نے وضاحت سے بیان کیا:

۳- روزنامہ دی نیوز' لاہور' ۲۴ جنوری ۱۹۹۵ء

عین اس وقت جب ہم اپنی زبوں حالی پر آنسو بہا رہے ہیں اور مدارس اسلامیہ کی کمزوریوں کا محاسبہ کر رہے ہیں' دشمنانِ اسلام انھی مدارس کو اپنے لیے خطرے کا سب سے بڑا مرکز سمجھ رہے ہیں...... قال اللّٰہ وقال رسول اللّٰہ کے گونجنے والے نغموں میں [انھیں] اسلام کی حیاتِ نو کا خطرہ' بنیاد پرستی کی بو اور [پاکستان کی خفیہ ایجنسی] آئی ایس آئی کا ہاتھ نظر آتا ہے۔ مدارس کو بدنام کرنے کے لیے انھیں کبھی اسمگلنگ کا اڈہ بتایا جاتا ہے اور کبھی ان کی جدید تعمیرات میں غیر ملکی پیسے کا عمل دخل بتایا جاتا ہے...... تہذیب اور لباس کی تبدیلی کو بڑی گہری نظر سے واچ کیا جا رہا ہے' اسے ایک بڑا خطرہ تصور کیا جا رہا ہے۔ مدارس کو آتنک وادیوں کا اڈہ اور ہتھیاروں کا بھنڈار تصور کیا جا رہا ہے...... اصل خطرہ یہ بتایا جا رہا ہے کہ چھوٹے چھوٹے معصوم بچوں کو ایسی تعلیم دی جا رہی ہے' کہ بڑے ہو کر بنیاد پرست اور عسکریت پسند بنیں گے' اور کسی کو یہ خوف ہے کہ جو طبقہ ان مدرسوں سے نکلے گا وہ اسلامی تشخص اور اپنی مذہبی شناخت کا سخت وکیل ہوگا۔[۴]

ایسا حملہ کیوں؟

یہ خوف وخطر کچھ غلط بھی نہیں۔ مدرسوں سے جو نوجوان نکلیں گے' وہ بالعموم اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی بتائی ہوئی ''بنیادوں'' پر ایمان سے لبریز' اسلامی تشخص کے علم بردار اور احیائے اسلام کے جذبے سے سرشار ہوں گے' (اور یہی ''بنیاد پرستی'' ہے جو چبھتی ہے) خواہ وہ فی الوقت اپنے مقصد کے لیے درکار کماحقہٗ اہلیت سے تہی دامن ہوں۔ مدارس کے خلاف مغرب کی دشمنی کوئی نئی چیز بھی نہیں۔ فرانسیسی استعمار نے الجیریا و تیونس میں اور اشتراکی روس نے وسط ایشیا میں مسلمانوں کے دینی مدارس کو ختم کیا۔ ہالینڈ نے انڈونیشیا میں

۴- ماہ نامہ الفرقان' لکھنؤ' نومبر ۱۹۹۴ء' ص ۱۴

اور برطانیہ نے پاکستان اور بھارت میں ان کو ختم کرنے یا مفلس وقلاش اور بے اثر و بے وقر بنانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ لادینیت کے علم بردار ترک لیڈر مصطفیٰ کمال پاشا [م: ۱۹۳۸ء] نے بھی' جب ''مغربی'' بننے کا فیصلہ کیا' تو خلافت عثمانیہ [۱۲۹۹ء-۱۹۲۲ء] ختم کر کے پہلا وار انھی دینی مدرسوں پر کیا' اور پھر عربی رسم الخط کو لاطینی حروف تہجی سے بدل دیا' تاکہ دینی علوم سے رشتے کی کوئی سبیل ہی باقی نہ رہے۔

لیکن تاریخ کے اس مرحلے میں مغرب نے' اور مغرب کے ان باج گزار مسلمان حکمرانوں نے ___ جو مغرب کے مقاصد پورے کرنے کے لیے اگلے مورچوں پر ''دہشت گردی'' (یعنی اسلامی احیا) کے خلاف جان لڑانے کی پیشکش کر چکے ہیں ___ مدارس اور علما کے خلاف جس شدومد سے اپنی جنگ کا آغاز کیا ہے' اس کے اسباب اس خوف وخطر سے بہت زیادہ گہرے' دُوررس اور بالکل بنیادی (فنڈامینٹل) نوعیت کے ہیں۔ ان کا تعلق مغرب اور اسلام کے درمیان اس تہذیبی کش مکش سے ہے' جس کے لیے تاریخ کا میدان گرم ہو رہا ہے۔

مضحکہ خیز الزامات

رہے وہ الزامات' بظاہر جن کی بنیاد پر مدارس کے خلاف مہم کو عام انسان کی نگاہ میں جائز ٹھیرانے کی کوشش کی جارہی ہے' تو ان کے لچر' بے بنیاد اور مضحکہ خیز ہونے کا علم' ہم سے زیادہ خود الزام لگانے والوں کو ہوگا۔

بے تحاشا تعداد' کثیر مالی امداد اور اس کے غلط استعمال کا بہت ڈھنڈورا پیٹا گیا ہے۔ اس کی حقیقت کیا ہے؟

اس وقت [۱۹۹۵ء] پورے صوبہ پنجاب میں صرف تقریباً دو ہزار پانچ سو مدارس ہیں' جن میں کل دو لاکھ انیس ہزار طلبہ پڑھ رہے ہیں۔ ان میں سے' سترہ سو' یعنی پینسٹھ فی صد مدارس حکومت سے کوئی زکوٰۃ فنڈ نہیں لیتے۔ گذشتہ سال [۱۹۹۴ء] تقریباً آٹھ سو دینی مدارس کو

۷ کروڑ روپے دیے گئے' یعنی اوسطاً فی مدرسہ ۸۷ ہزار روپے سالانہ' یا ۷ ہزار روپے ماہانہ۔ اتنی رقم تو کالج کے ایک لیکچرر کی بمشکل تنخواہ بنتی ہے۔ ضلع لاہور میں گذشتہ سال ۸۶ مدارس کو ۵۳ لاکھ روپے دیے گئے' یعنی اوسطاً ۵ ہزار روپے ماہانہ۔ ان میں سے بھی اگر وہ آٹھ مدارس نکال دیے جائیں جن کو ایک لاکھ سے زائد رقم دی جا رہی ہے' تو بقیہ کا اوسط مشکل سے تین ہزار ماہانہ بنے گا۔ ۱۹۸۴ء تا ۱۹۹۳ء میں دیے ہوئے فنڈز کا اوسط بھی یہی ہے' یعنی مہنگائی اور اخراجات کئی گنا بڑھ جانے کے باوجود فنڈز میں ایک پائی نہیں بڑھی۔

بیرونی امداد اور مدرسے

بیرونی امداد بالعموم وہاں مقیم پاکستانی باشندوں سے' کسی قدر مخیر" حضرات اور اداروں سے' اور شاذ و نادر کسی حکومت سے ملتی ہے۔ حکومت نے کھوج کرید کر کے اس پہاڑ سے کیا چوہا برآمد کیا ہے؟ ــــ رحیم یار خان کے ۲۳ مدارس کو ''شرق اوسط کے ایک والی ریاست سے سالانہ امداد ملی ہے''۔ ذرا سوچیں کتنی؟ ۹۵ لاکھ روپے' یعنی چار لاکھ روپے فی مدرسہ۔ رحیم یار خان کے حوالے سے یہ شخصیت متحدہ عرب ریاستوں کے صدر شیخ زید بن سلطان النہیان [م: نومبر ۲۰۰۴ء] کے علاوہ کس کی ہو سکتی ہے؟ کیا بھٹو خاندان پر ان کی مالی فیاضی کی بارش کچھ کم ہوئی ہے کہ اس پر بھی اعتراض ہو۔ ''ایک فرقہ کے ۳۵ مدارس کو بیرونی ''ملاؤں'' نے امداد فراہم کی''۔ کتنی؟ ایک ماہ میں تین لاکھ ۷۰ ہزار روپے یعنی ۱۰ ہزار روپے فی مدرسہ کی ''خطیر'' رقم۔ یہ کل حقیقت ہے ''بے تحاشا فنڈز'' دیے جانے کے الزام کی۔

دینی مدارس کو یہ بیرونی امداد ملے بھی تو اس پر اس حکومت کو اعتراض کرنے کا کیا حق ہے جو خود سرتاپا بیرونی امداد کی محتاج ہے' جو اپنا' اپنی قوم اور قوم کے بچے بچے اور بال بال بیرونی قرضوں اور سرمایہ کاری کے نام پر سنہرے جال میں باندھتی چلی جا رہی ہے۔ وہ حکومت جس کی ناک کے نیچے سیکڑوں عیسائی مشنری تعلیمی ادارے' اور غیر ملکی ایجنڈے کو آگے بڑھانے والی

نام نہاد رضا کار تنظیمیں (NGOs) کھلے بندوں باہر سے لاکھوں کروڑوں ڈالر وصول کر رہی ہیں۔ یہ نام نہاد ''رضا کار' تنظیمیں صرف خارجہ پالیسی ہی میں نہیں' بلکہ اندرونی پالیسیوں' تہذیب' ثقافت' سیاست' قانون' عدالت' مقدمات سب میں مداخلت کر رہی ہیں۔ کیا ان کی جانب سے یہ چاند ماری' خلافِ دستور و قانون نہیں؟

دینی مدارس کی مالیات کے بارے میں حکومت ایک مخمصے میں گرفتار ہے۔ ایک طرف وہ زکوٰۃ کی معمولی رقوم اور دوسرے ملکوں میں محنت مشقت کرنے والے ہم وطنوں کے چندے کو بیرونی امداد قرار دے کر شور مچا رہی ہے۔ دوسری طرف اسے اس بات کی بھی سخت تکلیف ہے کہ یہ مدارس ان معمولی چندوں سے کیوں چل رہے ہیں۔ دراصل وہ چاہتی یہ ہے کہ یہ مدارس ختم ہو جائیں یا پوری طرح حکومت کے کنٹرول میں آ جائیں۔ یہ بات کھل کر وہ کہہ نہیں سکتی' کنٹرول میں لینے کے لیے پیسہ بھی خرچ کرنا نہیں چاہتی' اور خرچ کرے بھی تو یہ جانتی ہے کہ اکثر و بیشتر مدارس اس کی امداد کے عوض اپنی آزادی کا سودا کرنے کے لیے تیار نہیں ہوں گے۔ مولانا محمد قاسم نانوتویؒ [م: ۱۸۷۹ء] نے جب دارالعلوم دیوبند کے لیے ۸ نکاتی دستور العمل تجویز کیا تو سرفہرست زیادہ سے زیادہ چندے کی فراہمی کو رکھا' تاکہ مدارس عوام کے بل پر چلیں' حکومت کے محتاج نہ ہوں۔

فرقہ وارانہ تصادم کا الزام

مدارس کے خلاف اقدامات کا اصل جواز فرقہ واریت اور دہشت گردی' باہم خوں ریزی' خصوصاً مساجد میں' اور اسلحے کے استعمال اور فوجی تربیت کے خلاف کارروائی کے نام پر فراہم کیا گیا ہے۔ کالجوں اور یونی ورسٹیوں کے برعکس' دینی مدارس میں نہ جھگڑے ہوتے ہیں نہ اسلحے کا استعمال' نہ ایک فرقے کے مدارس دوسرے فرقے کے مدارس سے دست و گریباں ہیں۔ فوجی تربیت کا اہتمام بھی شاید ہی کسی مدرسے میں ہو۔ لیکن اس کے باوجود دینی طالب علم

فوجی تربیت کیوں حاصل نہیں کر سکتے۔ مولانا مفتی محمد رفیع عثمانی صاحب نے بالکل صحیح فرمایا ہے:

فرقہ وارانہ جھگڑوں اور غیر قانونی اسلحے اور دہشت گردی کے ہم سخت خلاف ہیں۔ البتہ جہاد ایک دینی فریضہ ہے' جہاد کی فکری تربیت کا اہتمام متعدد دینی مدارس میں کیا جاتا ہے' اور ان شاء اللہ یہ اہتمام جاری رہے گا۔[5]

فرقہ وارانہ دہشت گردی میں' مدارس نہیں' تنظیمیں ملوث ہیں۔ یہ دہشت گردی یقیناً ایک سنگین معاملہ ہے' لیکن اسے بڑھا چڑھا کر اُچھالا جا رہا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ فرقہ واریت کے نام پر جو خوں ریزی ہو رہی ہے ـــــ یا کرائی جا رہی ہے تاکہ اہلِ دین پر ہاتھ ڈالنے کا جواز فراہم ہو ـــــ وہ ملک میں سیکولر سیاسی فرقہ واریت اور نسلی و لسانی تعصّبات میں ہونے والی خوں ریزی کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں ہے۔ کراچی میں' ۱۹۹۵ء کے پہلے ۳۷ دنوں میں ۳۶۰ افراد ہلاک ہوئے' جن میں زیادہ سے زیادہ ۵۸ افراد کی موت کو فرقہ واریت کا نتیجہ قرار دیا جا سکتا ہے' جب کہ یہ وہ مدت ہے جس میں اس نوعیت کی اموات سب سے زیادہ ہوئیں۔

مدارس کا نظامِ تعلیم

جہاں تک مدارس کے تعلیمی نظام میں اصلاح اور تغیّر و تبدل کی ضرورت کا تعلق ہے' اس سے کسی کو انکار نہیں۔ یہ ایک عظیم چیلنج ہے۔ ممکن ہے اس چیلنج کی وسعت کا پورا ادراک مدارس کے اربابِ حل و عقد میں عام نہ ہو' لیکن اس کی ضرورت کا احساس کسی نہ کسی درجہ میں ہر جگہ موجود ہے۔

نصاب کی اصلاح تو عصرِ حاضر کے ہمالیائی چیلنج کا ایک بہت محدود حصّہ ہے۔ لیکن یہاں پر یہ بات بالکل واضح رہنی چاہیے کہ نصاب کی اصلاح ہو یا دیگر اصلاحات' یہ مدارس کا اپنا

۵- ماہنامہ البلاغ' کراچی (مدیر: مولانا محمد تقی عثمانی) فروری ۱۹۹۴ء' ص ۲۷

کام ہے' وہی کریں گے تو کامیاب ہوگا۔ حکومت کی طرف سے نصاب مسلط کرنے کا خواب کبھی پورا نہ ہوگا۔ وہ حکومت' اور وہ وزارت تعلیم کہ جس کا اپنا تعلیمی نظام زبوں حالی کا شکار ہے۔ جہاں پرائمری اسکولوں میں چھتیں اور فرنیچر نہیں' جہاں امتحانات ایک ایک سال مؤخر ہوتے ہوں اور نتائج چھے' چھے ماہ کے بعد آتے ہوں' جہاں ہر امتحان میں ۶۰' ۷۰ فی صد طلبہ فیل ہوتے ہوں ــــ بھلا وہ حکومت اور ریاستی انتظامیہ کس منہ سے مدارس کی اصلاح کا دعویٰ کرسکتی ہے؟

مدرسے اور سیکولر طبقہ

دیکھا جائے تو مدارس اور علما کا معاشرے میں سیاسی' معاشرتی اور علمی و فکری اثر و رسوخ بہت محدود ہے۔ بلاشبہہ انتخابات میں ان کی کارکردگی مایوس کن ہے۔ فرقہ وارانہ کشیدگی نے بھی بہر حال ان کا وقار اور مقام مزید گرا دیا ہے۔ بہت سے علاقوں میں تو مسجد کے امام کا مقام نچلے درجے کے کام کرنے والے بے وقعت مزدور سے مختلف نہیں۔ حکومت اور انتظامیہ کے مناصب ان کے پاس نہیں ہیں۔ فوج اور بیوروکریسی میں ان کا داخلہ بند ہے۔ عدلیہ میں گنتی کے صرف دو یا تین افراد ہیں' لیکن وہ بھی سیکنڈ کلاس ججوں کی حیثیت میں۔

پھر آخر ان مدارس سے مغرب اور مغرب کے مسلمان مہرے کیوں اتنے خائف ہیں؟ ذرائع ابلاغ خصوصاً انگریزی اخبارات' ان کے پیچھے کیوں ہاتھ دھو کر پڑے ہوئے ہیں؟ مغرب کی شہ پر' اور از خود بھی' پاکستان کی حکومت ان کے خلاف خم ٹھونک کر میدان میں کیوں اتر رہی ہے؟

مغرب کی سوچ

اس اہم سوال کا حقیقت پر مبنی جواب ہفت روزہ اکانومسٹ' لندن نے فراہم کیا ہے۔ یہی وہ جواب ہے' جو اس مسئلے کے بنیادی اور دُوررس پہلوؤں سے نقاب اٹھا دیتا ہے۔

اسلام کا سروے نام کے طویل مضمون کا خلاصہ[۶] یہ ہے:

۱- دنیا کی قیادت کی حقیقی دعوے دار دو ہی تہذیبیں ہیں: مغرب اور اسلام۔

۲- اسلام ایک آئیڈیا ہے: آج کی دنیا میں اپنی نوعیت کا واحد آئیڈیا' شاید اس نوعیت کا آخری آئیڈیا جو دنیا دیکھے (یا کم سے کم اسے آخری بنانا مغرب کا مشن ہونا چاہیے!) آئیڈیا جو انسانی تجربے و مشاہدے سے ماورا حق پر یقین کا مدعی ہے۔ یہ الحق اللہ کا کلام ہے' جس کا لفظ لفظ' چودہ سو سال پہلے' عرب کے ایک گرد آلود کونے میں' محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) پر نازل ہوا' اور انھوں نے اسے قرآن میں نقل کر دیا۔ یہ آئیڈیا انسان کی باطنی زندگی اور عوامی زندگی کے درمیان' مذہب اور سیاست کے درمیان کوئی سرحد تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں۔

۳- ایک تہذیب کو جوڑے رکھنے کے لیے الحق پر یقین کی قوت کا کوئی بدل نہیں' کہ اس سے طاقت ور کوئی اور قوت نہیں۔ مزید ستم یہ ___ ماجرا اور کہیں بھی دیکھنے میں نہیں آرہا ___ کہ یہ نئے لوگوں کو بھی کھینچ رہا ہے اور الحق کے دعوے پر مبنی اس تہذیب میں شریک بننے کے لیے لوگ ہجوم کر رہے ہیں۔

۴- لہٰذا' یہ کوئی تعجب کی بات نہیں کہ دوسری قومیں' خصوصاً یورپی باشندے مسلمانوں سے خوف زدہ ہیں۔ انھیں خطرہ ہے کہ ایک نئی سرد جنگ آرہی ہے' جو غالباً ''سرد'' نہ رہے گی۔

۵- لیکن کوئی وجہ نہیں کہ مغرب اور اسلام امن و آشتی کے ساتھ باہم گزارا نہ کرسکیں۔ دونوں میں بہت کچھ مشترک ہے۔ تاہم' اس مقصد کے لیے دونوں کو حکمت کے ساتھ معاملہ کرنا ہوگا' اپنے خیالات اور تصورات پر نظرثانی بھی کرنا پڑے گی۔

۶- ماہنامہ اکانومسٹ' لندن' ۶ اگست ۱۹۹۴ء

خاص طور پر مسلمانوں کو کوئی ایسا راستہ تلاش کرنا ہوگا جس کے ذریعے وہ ماڈرن زندگی کے تین پہلوؤں سے ضرور ہم آہنگ ہو جائیں ـــــ یعنی ماڈرن بن سکیں:
۱-معیشت '۲-عورت '۳- جمہوریت۔

۶- معیشت میں سود کے بغیر گزر نہیں' اگرچہ اسلام کے مشارکت' مضاربت کے نظام سے مغرب بھی کچھ سیکھ سکتا ہے (''کاش' علماے کرام کے پاس اکنامکس کی ڈگریاں ہوتیں!'')

۷- عورت کو آزاد کرنا ہوگا۔ اس کے لیے اسے معاشی طور پر خودکفیل بنانا ہوگا۔ ''مغرب سے جتنے انقلاب پھوٹے ہیں' ان میں سب سے عظیم انقلاب عورت اور مرد کے تعلقات میں انقلاب ہے۔ اسلام نے اس کو اختیار نہ کیا تو وہ تنہا رہ جائے گا''۔

۸- سب سے بڑی تبدیلی' خود کو ماڈرن بنانے کے لیے' جو اسلام کو کرنا ہوگی' وہ ''جمہوریت'' کا اختیار کرنا ہے۔ جمہوریت [ایسے سیاسی نظام کے معنوں میں نہیں' جہاں حکمرانوں کے عزل و نصب اور امور اجتماعی کے فیصلے رائے عامہ سے ہوتے ہیں' بلکہ ایسے فلسفے کے پیرو معاشرے کے معنوں میں] جو کسی الحق' حتمی سچائی پر ایمان و یقین کی بنیاد پر قائم نہ ہو' یا کم سے کم کسی کو دوسرے پر اپنا ایمان و یقین مسلط کرنے کی اجازت نہ دے' جہاں ہر شخص خود یہ فیصلہ کرنے کا اختیار رکھتا ہو کہ کیا نیکی ہے اور کیا بدی' کیا جائز ہے اور کیا ناجائز۔ الحق کے تصور اور مقام کو مسترد کر کے ہی تو مغرب میں جمہوریت پیدا ہوئی۔

۹- عورت کی آزادی ہو یا فرد کی آزادی' [ہدایت الٰہی پر یقین اور اس کے اتباع سے] یہ آزادی ممکن نہیں' جب تک ایک ادارہ بالکل بدل نہ دیا جائے: یعنی علماے اسلام کا ادارہ: ''تعداد میں قلیل' اول تا آخر مرد ہی مرد' خودساختہ اور منشاے الٰہی بتانے کا

حق رکھنے کے مدعی''۔ علما کا اصل ہتھیار ہے اجتہاد: قرآن صدائے الٰہی ہوا کرے' اس کی صرف ۸۰ آیات قوانین وضوابط کے بارے میں کچھ کہتی ہیں' وہ بھی محتاج تشریح ہیں' تشریح واجتہاد کا حق' اجماع کا حق' علما نے صدیوں سے ہائی جیک کیا ہوا ہے۔ ''بد قسمتی سے مسلمان آج بھی قران کی تعبیر وتشریح علما کے اس چھوٹے سے گروہ کے ہاتھوں چھوڑے رکھنے کے لیے تیار ہیں' اور یہ یقین بھی رکھتے ہیں کہ صرف ان ہی کی تعبیر آزادانہ ہوتی ہے''۔ وہ اب تک علما سے ''نہیں'' (No) کہنے کی ہمت نہیں کر پا رہے۔ چنانچہ ''اسلام ابھی تک ایک قلیل' مطلق العنان گروہ کی بالادستی کی دنیا میں رہ رہا ہے۔ یہ نتیجہ ہے اس بات کا کہ وہ اب بھی الـحـق کے وجود پر یقین رکھتا ہے''۔

۱۰- علما ''عورت کی آزادی'' کو روکے بیٹھے ہیں۔ انھوں نے صدیوں پیش تر عورت کے مقام کے بارے میں غلط اجتہاد کیا' اب بھی اسی پر عمل کیے جا رہے ہیں۔ اس لیے اگر اسلام عورت کو وہ مساوات دینا چاہتا ہے جو ''کم وبیش'' قرآن نے دی ہے' تو اسے علما کی گرفت اور قوت کو توڑنا ہوگا۔

۱۱- اسی طرح جمہوریت کے فلسفے کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ تھوڑے سے علما کی بالادستی ہے' جو خدا کی ترجمانی کے مدعی ہیں۔ عیسائی چرچ کی طرح بے شک نہیں' مگر اسلام میں ائمہ' علما اور مفتیوں کا ایک نظام ہے' اور اس ''تھکے ماندے مصالحت پسند اور ذلیل نظام'' کو ختم کیے بغیر اسلام کی قدیم پُر جوش قوت کا احیا نہیں ہو سکتا۔ خدا کس چیز کی اجازت دیتا ہے' کس چیز سے منع کرتا ہے' اس کا فیصلہ کرنے کا حق اب علما کے محدود ادارے سے سارے مسلم عوام کی طرف منتقل ہو جانا چاہیے۔

۱۲- بد قسمتی سے اسلام کی پہلی صدی میں کوئی سینٹ پال [م: ۶۴ء] نہیں ہوا' جو دین کو شریعت کے شکنجے سے آزاد کر دیتا۔ لیکن اب اسلام کی پندرھویں صدی میں ریفارمیشن

(reformation) کی لہر ناگزیر ہے۔عیسائیت کی پندرھویں صدی کی طرح، جس
کے نتیجے میں [جرمن نژاد عیسائی پروٹسٹنٹ مصلح] مارٹن لوتھر [۱۴۸۳ء-۱۵۴۶ء]
نے ۱۵۱۷ء میں چرچ کے دروازے پر اپنے مطالبات آویزاں کر کے یورپ میں
پادریوں کے اقتدار کے تابوت میں پہلی کیل ٹھونک دی تھی۔

یہ بارہ نکات ہم نے اکانومسٹ، لندن (۱۶ اگست ۱۹۹۴ء) کے خصوصی مضمون سے
اخذ کر کے پیش کیے ہیں، تاکہ آج مغرب کا ذہن اور اس کی حکمت عملی کے خدوخال سامنے آسکیں۔

چند وضاحتیں

اکانومسٹ، لندن کے تجزیہ نگار کی مذکورہ بالا تحریر: کم علمی، خودساختہ مفروضوں، تعصب اور مغالطہ آمیز نتائج کا مرقع ہے۔ اس مضمون میں ان پر تفصیلی گفتگو کی گنجایش نہیں۔ تاہم، چند وضاحتیں ضروری ہیں:

اسلام میں قرآن مجید کی تعبیر (interpretation)، تفسیر اور تنفیذ کی امانت، عیسائیوں کی طرح کسی چرچ کی نہیں، اُمت کی تحویل میں دی گئی ہے۔ اسلام میں عالم و مفتی، عیسائیوں کے ہاں پادری کی طرح کا منصب نہیں، بلکہ ایک اہلیت کا نام ہے۔ عالم کون ہے، اس کی بھی کوئی متعین تعریف نہیں۔ کوئی عالم تعبیر کے حق پر اپنی اجارہ داری کا مدعی نہیں ہوسکتا، کیونکہ وہ جب فتویٰ لکھتا ہے تو یہ ضرور لکھتا ہے کہ "یہ میری رائے ہے، علم صرف اللہ کے پاس ہے، وہی صحیح جانتا ہے"۔ کسی عالم کے پاس نہ پہلے اتنا اقتدار رہا ہے کہ وہ اپنا اجتہاد دوسروں پر مسلط کر دے، اور نہ اب ہے۔ مگر کوئی حکومت بھی، اقتدار کے باوجود، اپنی دینی تعبیر لوگوں پر مسلط نہیں کرسکی ہے، نہ آیندہ کرسکے گی۔

حقیقت یہ ہے کہ پہلے دن سے، عام مسلمانوں نے جن علما پر اعتماد کیا، انھی کو، اور انھی کے اجتہاد و تعبیر کو، ہمیشہ سند قبول اور بقا حاصل ہوئی۔ یہ "جمہوری حق" تو بغیر بیلٹ کے، نیچے عوام

ہی کے پاس رہا ہے۔ مگر تلخ حقیقت یہ ہے' کہ یہ صرف آج کی ماڈرن تعبیرات ہیں' جو مصطفیٰ کمال پاشا (ترکی)' صدر جمال عبدالناصر (مصر)' صدر احمد نور سوئیکارنو (انڈونیشیا) اور صدر محمد ایوب خان (پاکستان) وغیرہ جیسے فوجی ڈکٹیٹروں نے اُوپر سے نافذ کی ہیں۔ وہ تعبیرات جن کے بارے میں تجزیہ نگار آس لگائے ہوئے ہے کہ ''عوامی اجتہاد'' ہو تو وہ نیچے سے نافذ ہوں گی۔

بے شک ۱۴۷۰ء میں بائبل پہلی دفعہ چھپ کر عیسائیوں کے ہاتھ آئی' تو انھیں پتا چلا کہ اس میں کیا لکھا ہے' اور انجام کار ریفارمیشن یا اصلاح کی لہر پیدا ہوئی۔ مگر قرآن مجید تو روزِ اوّل سے مسلمانوں کے سینوں اور ہاتھوں میں رہا ہے۔ اور اب تک پہنچتے پہنچتے تو صدیاں ہوگئیں کہ تقریباً ہر زبان میں لوگ اس کا ترجمہ پڑھ رہے ہیں۔ لیکن' مضمون نگار اس کی کیا توجیہہ کرے گا' کہ لوگ جتنا زیادہ قرآن پڑھتے ہیں' اتنا ہی زیادہ وہ نام نہاد ''ریفارمیشن'' کے بجائے راسخ العقیدگی کی طرف لپکتے ہیں۔

مغرب اور مغرب زدہ کیوں خائف

اس تجزیے سے یہ بات ضرور روزِ روشن کی طرح آشکار ہوتی ہے کہ مغرب مدارس کو ایک خطرۂ عظیم اس لیے سمجھتا ہے کہ اس کی نظر میں اس کے تہذیبی غلبے اور قیادت عالم کی بقا' اور تہذیبی جنگ میں اسلام کے اُوپر (اس کو مغرب کے رنگ میں رنگ کر) فتح کی راہ میں یہ دینی مدارس ایک بہت بڑی رکاوٹ ہیں۔ کیونکہ دینی تعلیم ہی سے مسلمانوں کے اندر کائنات میں الحق کے وجود' اور قرآن اور رسالت محمدیؐ کے الحق ہونے پر یقین' چودہ سو سال سے زندہ اور قائم ہے' اور الحق کے ساتھ ربط بھی۔ ملّت کی وحدت' قوت اور توسیع کا راز اس یقین میں پوشیدہ ہے' جب کہ اس یقین کی قوت کا کوئی جواب مغرب کے پاس نہیں۔

پاک و ہند میں تعلیم کے مسئلے پر بحث کرتے ہوئے' ڈبلیو ڈبلیو ہنٹر نے اپنی مشہور کتاب Our Indian Musalmaans میں انیسویں صدی کے دوران اسی بات کا اظہار

یوں کیا تھا: ''شرع محمدی کو ہرگز تعلیم کا مقصد نہ بنانا چاہیے' کیونکہ شرع محمدیؐ کا مطلب ہے مسلمانوں کا مذہب' اور مذہب بھی اس زمانے کا جب اس کے پیرو تمام دنیا کو اپنی جائز شکارگاہ سمجھتے تھے' اور انھوں نے زمانہ حال کی مسلمان آبادیوں کی طرح عیسائیوں کے ساتھ اتحاد کر کے یا ان کی رعایا بن کر رہنا نہ سیکھا تھا''۔

اب یہ سمجھنا مشکل نہیں کہ دینی مدارس کے خلاف مغرب کی مہم' خواہ آج ہو جب وہ ہمارے اُوپر ہمارے حکمرانوں کے واسطے سے مسلط ہیں' یا ماضی میں جب وہ براہِ راست مسلط تھے' ایک عظیم تہذیبی جنگ میں کلیدی مقام رکھتی ہے۔

افسوس ان مسلمان حکمرانوں' دانش وروں اور انگلش ذرائع ابلاغ پر ہے' جو مغرب سے بڑھ کر مغرب کی وفاداری کی روش پر گامزن ہیں' اور شرع محمدیؐ کی تعلیم کو بے اثر یا ختم کرنے کے درپے ہیں۔ شاید وہ ایک مرتبہ پھر عیسائیوں کی ''رعایا'' بن کر رہنے کا فیصلہ کر چکے ہیں' اور ساری اُمت کو بھی یہی سبق سکھانا چاہتے ہیں۔

جب برعظیم پاک و ہند میں پہلی بار بیرونی آقاؤں کی طرف سے مسلمانوں کو عیسائیوں کی رعایا بن کر رہنے کا سبق سکھانے کی مہم شروع ہوئی' تو علما نے آگے بڑھ کر اس حملے کے خلاف دفاعی بند باندھا' اور ملک کے طول و عرض میں مدارس کا جال بچھا دیا۔ اس دفاعی مہم میں ۳۰ مئی ۱۸۶۷ء/ ۱۵ محرم الحرام ۱۲۸۳ھ کو دارالعلوم دیوبند کا قیام ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے بعد مسلمانوں پر جو قیامت ٹوٹی' اور جس زور و شور کے ساتھ مغرب کے سیاسی و تمدنی غلبے کا سیلاب آ رہا تھا' اس کو دیکھتے ہوئے ان مدارس کے بانیوں نے جو منصوبہ بنایا اور خدمات انجام دیں شاید اس سے زیادہ کچھ سوچنا اور کرنا کسی کے لیے ممکن نہ تھا۔ اس لیے آج کی دنیا میں بیٹھ کر کل کی دنیا کے بارے میں رومانوی فتوے صادر کرنا ــــــ کہ یہ ہونا چاہیے تھا' اور یہ خامی تھی ــــــ ایک بے سود مشغلہ ہے۔

مدارس کی خدمات

دینی مدارس نے علومِ نبوت کے تحفظ' ان کی تعلیم و اشاعت' ان میں اضافے اور ترقی' اور مخصوص مغربی افکار و تمدن کا جواب دینے میں جو شان دار خدمات انجام دی ہیں' ان کا اعتراف نہ کرنا اور انھیں خراجِ تحسین پیش نہ کرنا بخل ہوگا۔ لیکن ایک زندہ قوم کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنی ہر کوشش اور ہر معرکے کا جائزہ لے کر' کوتاہیوں اور خامیوں کا تعین کرے' اصلاح و بہتری کی فکر کرے اور اسے مستقبل کے تقاضے پورے کرنے کا اہل بنائے:

وَمَا كَانَ قَوْلَهُمْ إِلَّآ أَنْ قَالُوْا رَبَّنَا اغْفِرْلَنَا ذُنُوْبَنَا وَإِسْرَافَنَا فِيْٓ أَمْرِنَا وَثَبِّتْ أَقْدَامَنَا وَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ ○ (آل عمرٰن ۳:۱۴۷)

ان کی دعا بس یہ تھی کہ "اے ہمارے رب' ہماری غلطیوں اور کوتاہیوں سے درگزر فرما' ہمارے کام میں تیرے حدود سے جو کچھ تجاوز ہوگیا ہو' اسے معاف کر دے' ہمارے قدم جما دے' اور کافروں کے مقابلے میں ہماری مدد کر"۔

آج تو مدارس کو ایک بالکل نئی نوعیت کا اور کہیں زیادہ بڑا چیلنج درپیش ہے۔ اسلام اور مغرب کے درمیان معرکہ برپا ہونے والا ہے۔ دشمن نے مدارس کو اپنے اہداف میں سرفہرست رکھا ہے۔ مستقبل بے شک بڑا پُرخطر ہے' لیکن عظیم الشان امکانات سے بھرپور بھی۔ ملت کے احیا' اُمت کے مشن کی تکمیل' اسلام کے تہذیبی غلبے' دنیاے اسلام کے لیے روشن مستقبل اور انسانیت کے لیے امن و سلامتی کی زندگی کے امکانات۔

دینی مدارس کیا کریں؟

مدارس کہاں کھڑے ہیں' اور انھیں کیا کرنا چاہیے؟ یہاں پر ہم انتہائی ادب کے ساتھ مدارس کے اہل حل و عقد کی توجہ صرف چند بنیادی امور کی طرف مبذول کرانا چاہتے ہیں:

۱۸۵۷ء کے بعد کے زمانے میں دینی تعلیم کی حکمت عملی دفاعی حکمت عملی تھی' اس کا

اصل بنیادی مقصد 'تحفظ' تھا۔ قاری محمد طیبؒ [م: ۱۹۸۳ء] لکھتے ہیں: ''اجماع اس پر منعقد ہوگیا کہ ایک دینی مدرسہ قائم کیا جائے' تاکہ اس ملک میں مسلمانوں کا دین محفوظ ہو جائے''۔ لیکن اس میں یہ تمنا بھی شامل تھی کہ ''گو ان کی اسلامی شوکت پامال ہو چکی ہے' لیکن اگر دین اور دینی جذبات محفوظ ہو جائیں گے' تو ایسا وقت آنا بھی ممکن ہے کہ وہ ان دینی جذبات سے رہتی دنیا کو بھی سنوار سکیں۔[7]

یہ ادراک سب سے زیادہ ضروری ہے' اور اس کے عملی مظاہرے کا وقت آ گیا ہے۔ تحفظ علومِ نبوت کے ورثے کا بھی مطلوب تھا' مسلمانوں کے دین و ایمان کا بھی۔ خدا کے فضل سے اس مقصد میں کافی کامیابی ہوئی ہے۔ یہ کامیابی' اپنی تمام کوتاہیوں اور خامیوں کے باوجود' انھی مدارس کے ذریعے ممکن ہوئی' کہ دورِ انحطاط میں تقلید کا نسخہ ہی کارگر ہوسکتا ہے۔ اسی لیے علامہ محمد اقبال نے کہا تھا:

> ان مکتبوں (مدرسوں) کو اسی حالت میں رہنے دو' غریب مسلمانوں کے بچوں کو انھی مدارس میں پڑھنے دو۔ اگر یہ مُلا اور درویش نہ رہے تو جانتے ہو' کیا ہوگا؟ جو کچھ ہوگا میں اسے اپنی آنکھوں سے دیکھ آیا ہوں۔ اگر ہندستانی مسلمان ان مدرسوں کے اثر سے محروم ہو گئے تو بالکل اسی طرح ہوگا جس طرح اندلس میں مسلمان کی آٹھ سو برس کی حکومت کے باوجود ـــــ اسلام کے پیرووں اور اسلامی تہذیب کے آثار کا کوئی نقش نہیں ملتا۔[8]

تحفظ کا مقصد آیندہ بھی مطلوب رہے گا' لیکن اب معاملہ دفاع سے بہت آگے چلا گیا ہے۔ آج ایک بالکل نئی حکمت عملی کی ضرورت ہے' جس کا مرکزی نکتہ 'اقدام' ہونا چاہیے۔

۷- ماہ نامہ الرشید دارالعلوم نمبر' لاہور' ص ۱۳۷!

۸- خوں بہا [دینی مدارس میں تعلیم' از سلیم منصور خالد' انسٹی ٹیوٹ آف پالیسی اسٹڈیز' اسلام آباد' ۲۰۰۲ء' ص ۱۹!]

ایمان' رسوخ فی العلم' حکمت' اجتہاد اور جہاد' اس حکمت عملی کے لازمی اجزا ہوں گے۔ علامہ اقبال کو دورِ جدید کے اس چیلنج کا بھی شدت سے احساس تھا' اور نظم و نثر میں انھوں نے اس بارے میں اپنے اضطراب کا شدت کے ساتھ اظہار کیا ہے۔

- علمی و فکری اور تہذیبی سطح پر مغرب نے بے شمار انقلابات برپا کیے ہیں۔ روز نت نئے مسائل پیدا ہو رہے ہیں' ان کا علم اور فہم و ادراک نہایت ضروری ہے اور ایمان و حکمت اور اجتہاد کے ساتھ ان کا مقابلہ اور ان کے مقابلے میں جوابی انقلاب برپا کرنے کی صلاحیت اور جدوجہد بھی اتنی ہی ضروری ہے۔ تفقہ فی الدین کا مطلب صرف احکام و مسائل کا علم نہیں' حکمت اور مجتہدانہ نظر و صلاحیت بھی ہے۔
- تفقہ فی الدین کا ناگزیر تقاضا انذار عام ہے (سورۃ التوبہ)۔ انذار عام کی صلاحیت اور کاوش کے بغیر اُمت نہ مغرب کے مقابلے کے لیے تیار ہوگی' اور نہ اس کے اندر شریعت کا' قول ثقیل کا بار اٹھانے کی استعداد ہی پیدا ہو سکے گی۔
- اُمت میں اتحاد و اخوت کے بغیر علم کی بڑی سے بڑی مقدار بھی غیر مؤثر رہے گی۔ تعبیر' تشریح' فتاویٰ' رد و قدح' اختلافات' سب میں اس بنیادی مقصد کے لیے صلاحیت پیدا کرنا اور مناسب حکمت عملی اختیار کرنا ضروری ہے۔

ان چار نکات کی وسعت میں ہر چیز سما سکتی ہے۔ ہمیں امید ہے کہ ہماری یہ دردمندانہ گزارشات' ہمارے واجب الاحترام علما اور دینی مدارس کے ارباب حل و عقد کے لیے قابلِ توجہ قرار پائیں گی۔ [مئی ۱۹۹۵ء]

□□□

دہشت گرد کون؟

یہ بیت المقدس [ارض فلسطین] نہیں تھا' یہ بغداد [عراق] نہیں تھا' یہ سرائیوو [بوسنیا] نہیں تھا' یہ گروزنی [چیچنیا] نہیں تھا' یہ چرار شریف [مقبوضہ کشمیر] بھی نہیں تھا ـــــ یہ امریکا کے عین قلب میں واقع اوکلاہوما کا شہر تھا۔

امریکی شہر میں دھماکا

اپریل ۱۹۹۵ء کو شہر کے وسط میں ایک کار میں ہزاروں پونڈ طاقت کے ٹائم بم کے قیامت خیز دھماکے سے ۵۰ کلومیٹر دُور تک عمارتیں ہل گئیں۔ سرکاری دفاتر کی نومنزلہ دیوہیکل عمارت آناً فاناً ملبے کا ڈھیر بن گئی۔ جلی ہوئی مسخ شدہ لاشوں کا انبار (۱۳۷ نکالی جاسکیں' ۶۰ سے زیادہ راکھ بن گئیں)' معصوم بچوں کے بکھرے ہوئے اعضا' ان کے خون آلود جسم اور ان کی دل دوز چیخ و پکار ـــــ سارا منظر ایسا لگتا تھا گویا انھی شہروں میں سے کسی شہر سے اٹھا کر یہاں رکھ دیا گیا ہو' جن کا اس مضمون کے آغاز میں تذکرہ کیا گیا ہے۔

''میں نے سرائیوو میں سب کچھ تباہ ہوتے دیکھا تھا' سوچ بھی نہ سکتا تھا کہ کبھی یہاں امریکا میں بھی وہی تباہی دیکھوں گا''۔ ایک دیکھنے والے نے کہا۔ حالانکہ سرائیوو اور بوسنیا میں

ایک عرصے سے جس درندگی اور سفاکی کا مظاہرہ ہوا ہے' گروزنی اور چیچنیا میں جو قیامت بیت چکی ہے اور بیت رہی ہے' اور جس کو امریکا اور یورپ خاموشی (اور شاید اطمینان) سے دیکھ رہے ہیں' اس کے مقابلے میں ایسے سیکڑوں اوکلاہوما بھی کچھ نہیں۔

ہفت روزہ نیـــــوزویک [Newsweek] کے مطابق: "امریکا کے قلب میں اس ایک تباہ شدہ عمارت کے نیچے یہ غلط خیالی بھی ہمیشہ ہمیشہ کے لیے دفن ہوگئی کہ ہم کم از کم اپنے گھر میں محفوظ ہیں"۔[1] اگرچہ امریکا میں' اوکلاہوما کے بغیر بھی' اس غلط خیالی کی کچھ زیادہ گنجایش نہیں تھی۔ اس امریکا میں جہاں کے شہری آپس میں آتشیں اسلحے کے بے محابا استعمال سے ہر سال ۲۲ ہزار بے گناہوں کا خون بہاتے ہیں۔ وہ امریکا' جہاں کوئی سرپھرا اُٹھتا ہے اور بلا کسی محرک کے تڑتڑ درجنوں اَن جانے انسانوں کو موت کے گھاٹ اتار دیتا ہے۔ جہاں حکومت اسلحے کے اس بے روک ٹوک استعمال پر کوئی برائے نام پابندی لگانے سے بھی عاجز ہے۔ لیکن یہی حکومت دنیا بھر کی پولیس بنی پھرتی ہے' اگرچہ اس پولیس کا سارا زور صرف مسلمان ملکوں کو نہ صرف نیوکلیر بلکہ ہر قسم کے اسلحے سے محروم کرنے پر لگا ہوا ہے۔

بلاجواز الزام تراشی

اہلِ امریکا اور مغرب' بڑے اہتمام سے' عرصے سے' خود کو یہ باور کرائے بیٹھے ہیں کہ "ہم" اتنے "مہذب" اور انسانی حقوق کے اتنے بڑے محافظ ہیں کہ درندگی کی ایسی حرکات "ہم" تو کر ہی نہیں سکتے' یہ "وہ" ہی کر سکتے ہیں جو باہر کے ہیں۔ باہر کے بھی کون لوگ؟

خبر سنتے ہی عام امریکیوں کو اس کے علاوہ کچھ نہ سوجھی' اس لیے کہ ان کے حکمران اور طاقت ور ذرائع ابلاغ ان کو یہی باور کرا چکے ہیں کہ یہ دہشت گردی "مشرق وسطٰی میں پیدا ہونے والے" لوگوں (یعنی عرب مسلمانوں) اور اسلامی بنیاد پرستوں کے علاوہ کوئی اور کر ہی

۱- ہفت روزہ نیوزویک' یکم مئی ۱۹۹۵ء

نہیں سکتا۔ چنانچہ امریکا کے ذمہ دار لیڈروں نے کسی ادنیٰ سے بھی ثبوت کے بغیر' گم نام ''چشم دید گواہوں'' کے حوالے سے فوراً ٹی وی' ریڈیو اور اخباروں سے ''فتوے'' جاری کردیے۔ جن کے مطابق ملزمین کی 'داڑھیوں' اور 'کالے بالوں' کا ذکر نشر ہونے لگا' ایک بے گناہ مسلمان عرب امریکی کو لندن ایئرپورٹ سے گرفتار کرکے امریکا واپس بھی لے آیا گیا۔

نتیجہ یہ کہ مسلمانوں کے خلاف پارہ چڑھنے لگا' نفرت کا لاوا اُبلنے لگا' ٹیلی فون کی گھنٹیاں بجنے لگیں۔ مسجدوں اور گھروں پر خوف ناک دھمکیوں کا تانتا بندھ گیا۔ دوستوں نے آنکھیں پھیرلیں' سڑکوں پر گالیاں دی گئیں اور ''بچوں کے قاتل'' کے لقب سے نوازا گیا۔ یہ سب کچھ دہشت گردی کی اس تعریف میں تو آنہیں سکتا جو امریکا تسلیم کرتا ہے' لیکن نتیجہ وہی نکلا جو دہشت گردی کا نکلتا ہے۔ یعنی تمام مسلمان' وہ پیدایشی امریکی ہوں یا باہر سے آئے ہوں' اس وقت تک شدید خوف و ہراس کا شکار رہے' جب تک اصل مجرم پکڑ نہ لیا گیا۔

جھوٹا پندار

پھر مجرم کون نکلا؟

ایک بالکل سفید فام' اصلی اور نسلی امریکی' سابق فوجی جو عراق میں جنوری ۱۹۹۱ء کے دوران دادِ شجاعت دے چکا ہے اور سیکڑوں عراقیوں کو ہتھیار ڈالنے کے باوجود موت کے گھاٹ اُتار چکا ہے ؏

میں الزام ان کو دیتا تھا قصور اپنا نکل آیا

پتا چلا کہ یہ دہشت گردی نہ تو اسلامی احیا کے علم بردار کسی رہنما کے وعظ و نصیحت کا نتیجہ ہے اور نہ کسی مجاہد اسلام کی شہ کار منصوبہ بندی کا شاخسانہ۔ نہ یہ مشرق وسطیٰ سے آنے والے کسی براؤن آدمی کا کام ہے' نہ کسی اسلامی بنیاد پرست کا معرکہ۔ نہ یہ مسلمانوں کے سروں پر جابر و مستبد حکمرانوں کو مسلط رکھنے' قلب اسلام میں اسرائیل کا خنجر گھونپنے' فلسطینیوں کو بے گھر

کر کے تتر بتر کرنے اور در بدر کی ٹھوکریں کھلانے کا ردِعمل ہے۔ نہ عراق میں ہزاروں فوجیوں کو زندہ جلا دینے اور زمین میں دفن کر دینے اور ایرانی طیارے کو میزائل سے مار گرانے کا جواب ہے۔ نہ یہ الجیریا میں اسلامی قوتوں کی جمہوری تبدیلی کو سبوتاژ کرنے کا غصہ ہے۔ نہ یہ مسلمان معاشروں کو اسلام کے مطابق جینے سے روکنے کے خلاف کسی بے بس و مجبور کا احتجاج ہے اور نہ یہ مسلم معاشروں کی غربت اور معاشی پس ماندگی کی چکّی میں پسے کسی مفلوک الحال کی آہوں کا الاؤ ہے۔ یہ نہ اس ایران کی شہ پر ہوا ہے جو امریکا کو شیطانِ عظیم کہتا ہے' اور جس کو امریکا دنیا کا سب سے بڑا دہشت گرد ملک قرار دے چکا ہے۔ نہ ان باقی ماندہ چار مسلمان ممالک سوڈان' لیبیا' عراق یا شام میں سے کسی کی شہ پر یہ قدم اٹھایا گیا ہے کہ جن کو امریکا ہر سال دہشت گرد قرار دینے کی باقاعدہ رسم ادا کرتا ہے۔

یہ بھی پتا چلا کہ مجرم نہ تنہا ہے اور نہ دماغی مریض۔ چند لوگ نہیں بلکہ یہ لاکھوں لوگ ہیں' ۳۰ ریاستوں میں ان کا جال بچھا ہوا ہے' منظم ہیں' مسلح ہیں' کیل کانٹے سے لیس ہیں' جاہل نہیں یونی ورسٹیوں کے تعلیم یافتہ ہیں' مہذب ہیں' کالے اور براؤن نہیں بالکل سفید فام ہیں' عرصے سے کتابچوں اور کمپیوٹر پر انٹرنیٹ کے ذریعے بم سازی اور دہشت گردی کے نسخوں کی اشاعت کر رہے ہیں۔ یہ وہ ہیں' جو خود اپنی امریکی حکومت کو "شیطانِ عظیم" کہتے ہیں' اپنی آزادیوں اور حقوق کا "دشمن نمبر ایک" سمجھتے ہیں۔ اس کے جبر و ظلم کی وجہ سے اسے "درندہ صفت" قرار دیتے ہیں۔ وہ حکومت جو دنیا بھر سے مسلم حریت پسندوں کو پکڑ پکڑ کر امریکا لانے کی منصوبہ بندی کر رہی ہے اپنے ان حقیقی دہشت گردوں سے غافل ہے یا صرفِ نظر کیے ہوئے ہے۔

یہ اس واقعے کی حقیقت نکلی' جسے امریکا اپنی سرزمین پر دہشت گردی کا سب سے بڑا واقعہ قرار دے رہا ہے۔ سب سے بڑا واقعہ تو یہ اسی صورت میں کہا جا سکتا ہے' جب ہم اطالوی ملاح کرسٹوفر کولمبس [۱۴۵۱ء-۱۵۰۶ء] کی آمد سے لے کر اوکلاہوما تک کی تاریخ کے وہ باب

نہ کھولیں، جن میں اس تشدد کی داستان رقم ہے، جس نے امریکا کے حقیقی باشندوں یعنی ریڈ انڈینوں کا نسلی صفایا (cleansing) کیا، امریکا کی سرزمین کو ان سے ''پاک'' کیا، انھیں ''محفوظ علاقوں'' کے اندر دھکیل دیا، اور نسل پرست کوکلکس کلین[2] جیسی تنظیموں نے سیاہ فام امریکیوں کو زندہ جلا دیا۔ لیکن بہرحال اس بہت بڑے واقعے سے یہ ظاہر ہو گیا کہ امریکا، جو دنیا بھر میں مسلمانوں اور مسلمان ملکوں کو دہشت گرد ٹھیرانے کی مہم میں پیش پیش ہے، خود اپنی گود میں سفید فام امریکی دہشت گردوں کا کتنا بڑا گروہ پال رہا ہے۔

مجرموں کی شناخت کے بعد، چاہیے تو یہ تھا کہ یہ دوسری غلط خیالی بھی اوکلاہوما میں دفن ہو جاتی، کہ ایسے کام 'وہ'، یعنی مسلمان ہی کر سکتے ہیں، ''ہم'' نہیں۔ لیکن ایسا ہوگا نہیں۔ حکومت اور مغربی ذرائع ابلاغ اس غبارے میں برابر ہوا بھرتے رہیں گے، جس پر خودساختہ ''دہشت گرد اسلام'' کی تصویر پینٹ کر دی گئی ہے۔

خوف ناک امکانات

انکشافِ حقیقت کے بعد، یہ بھی چاہیے تھا کہ مسلمانوں کے خلاف ''فتوے'' واپس لیے جاتے، دنیا بھر کے مسلمانوں سے، بالخصوص امریکی مسلمانوں سے، معافی مانگی جاتی یا کم سے کم ان سے معذرت کی جاتی۔ لیکن اس غبارے کو اُڑتا رکھنے کی سیاسی ضرورت کے باعث یہ سب کچھ کرنے کا کیا سوال تھا؟ ضرورت ہی نہیں محسوس کی گئی۔

۲- Ku Klux Klan (KKK) گورے امریکی نسل پرستوں کی ایک خفیہ دہشت گرد تنظیم، جس کی تاسیس ۱۹ویں صدی میں ہوئی۔ اس تنظیم نے سیاہ فام امریکیوں کو ووٹ کا حق استعمال کرنے سے روکنے کے لیے قتل و غارت کا بازار گرم کیا۔ ۱۹۱۵ء میں اس تحریک کو دوبارہ زندہ کیا گیا، تب سیاہ فاموں کے علاوہ اس کے نئے اہداف میں تارکینِ وطن، یہودی اور کیتھولک بھی شامل ہو گئے۔ ۱۹۴۰ء کی کساد بازاری میں اس کی سرگرمیاں نرم پڑ گئیں، تاہم ۱۹۵۰ء کے عشرے میں پھر اسے زندگی ملی۔ موجودہ امریکی معاشرے میں سفید فام نسل پرستوں کی فکری حرارت کا منبع یہی مذموم تحریک ہے۔

بلکہ صورت حال اب بھی وہی ہے۔ اب بھی اس بات کا تصور تک خوف ناک ہے کہ اگر مجرم واقعی کوئی مسلمان ہی نکل آتا' یا کوئی مسلمان اگر ایک دوسرا 'اوکلاہوما' کر دے' تو غالباً وہی ہوگا' جو بھارت میں وزیراعظم اندرا گاندھی کے قتل [اکتوبر ۱۹۸۴ء] کے بعد سکھوں کے ساتھ ہوا۔ بھارت میں مسلمانوں کے ساتھ تو ایسا ظالمانہ برتاؤ برابر ہوتا رہتا ہے۔

اگر ہم ان خوف ناک امکانات کو محض خیالی باتیں نہیں سمجھتے' اگر اوکلاہوما کے بعد امریکی معاشرے کا موڈ اچانک مسلمانوں کے خلاف سیاہ پڑ گیا' تو اس میں تعجب کی کوئی بات نہیں۔ اگر خلیجی جنگ کے وقت بھی اہلِ مغرب کا یہ موڈ' اوکلاہوما کی طرح ہی مسلمانوں کے خلاف سیاہ ہو رہا تھا (جیسا کہ ہفت روزہ ٹائم نے موازنہ کیا ہے) ___ جس جنگ میں تقریباً سارے مسلمان حکمران امریکا بہادر کے دوش بدوش ایک مسلمان ملک کو کچلنے میں شریک تھے ___ تو بظاہر اس انتہائی تعجب خیز واقعے میں بھی تعجب کی کوئی بات نہیں۔ اس لیے کہ سیاسی مفادات کی خاطر اسلام کی جو تصویر دل و دماغ میں بٹھائی گئی ہے' اس کا نتیجہ یہی نکلنا تھا۔ خلیج میں مسلمان' امریکا کی طرف سے ہی لڑ رہے تھے' لیکن حملہ تو اسرائیل کو بچانے اور تیل کے چشموں پر بالواسطہ امریکی قبضہ برقرار رکھنے کے لیے ہوا تھا۔

اسی لیے' روز نامہ واشنگٹن پوسٹ کے کالم نویس اسٹیفن روزفیلڈ کو یہ کہنے میں کوئی باک نہیں:

> ہاں' مسلمانوں پر الزام لگانے میں جلدبازی کی گئی' اور یہ قابلِ مذمت ہے' خطرناک ہے۔ ہاں' مجھے اعتراف ہے کہ میرے ذہن میں بھی پہلی بات یہی آئی تھی کہ یہ کام مسلمانوں کا کیا ہوا ہے۔ لیکن ہمارے اس ردعمل کی بنیاد کوئی سفلی تعصب نہیں۔ یہ صرف اسلام کی ''تصویر'' کا مسئلہ نہیں' اس کی تہہ میں حقیقت بھی ہے [گویا کہ قصور مسلمانوں ہی کا ہے کیونکہ] مسلمان گروہ دہشت گردی کرتے ہیں' مسلمان اس کو جائز بھی سمجھتے ہیں' مسلمان حکومتیں اس کی پشت پناہی بھی کرتی ہیں۔

ہم دوستی اور انصاف کے نام پر انڈے تو نہیں بن سکتے۔ بلاشبہ یہ ضرور معلوم ہو گیا ہے کہ امریکی النسل بھی دہشت گرد ہوتے ہیں' لیکن کم سے کم ہماری حکومت ان کے خلاف تو ہے۔ [پھر دبے لفظوں میں یہ بھی کہتے ہیں] ہاں' ہماری حکومت کو بیرونی ممالک میں غیر قانونی قتل جیسے اقدامات سے اجتناب کرنا چاہیے' جنھیں دہشت گردی قرار دے دیا جاتا ہے' اور جن سے ہماری اخلاقی ساکھ کو نقصان پہنچتا ہے۔[۳]

دہشت گردی کا مطلب؟

دہشت گردی کی حقیقت کیا ہے؟ یہ سب سے اہم سوال ہے۔

رومن گورنر' پونٹیس پائلیٹ (Pontius Pilate -پہلی صدی عیسوی) ۔نے سیدنا مسیح علیہ السلام کے بارے میں یہی سوال پوچھتے پوچھتے' بالآخر انھیں صلیب پر چڑھانے کا حکم دے دیا تھا۔ ان رومن حکمرانوں کے آج کے جانشین بھی' شاید اسی طرح مسلمان اور اسلام کو دہشت گردی کے الزام میں صلیب پر چڑھانے کا فیصلہ کر چکے ہیں۔

مشکل یہ ہے ـــــ اور طاقت وروں کے لیے آسانی بھی ـــــ کہ ''دہشت گردی'' کیا ہے' سرے سے ایک مبہم اور غیر متعین لفظ ہے۔ توہینِ رسالتؐ کے قانون میں ابہام کے بارے میں تو اتنا شوروغوغا ہے کہ جرمنی کے صدر نے بہ نفس نفیس اس مسئلے کو پاکستان کے حکمرانوں کے سامنے اٹھایا' جب کہ اس جرم کے تحت آج تک پاکستان میں کسی کو کوئی سزا بھی نہیں ملی ہے۔ مگر دہشت گردی کا ''جرم'' بھی بڑا عجیب جرم ہے! ایک طرف اس جرم میں چند متعین ملزموں ہی کو نہیں' پوری کی پوری قوموں' بلکہ پورے مذہب وملّت کو تختہ دار پر چڑھایا جا رہا ہے۔ مبینہ ملزموں کو دھوکا اور فریب سے ہائی جیک کر کے گرفتار کیا جا رہا ہے (جو خود ایک دہشت گردی ہے)۔

۳- روزنامہ دی نیوز لاہور' ۳۰ اپریل ۱۹۹۵ء

دوسری طرف کسی قانون کے تحت اس کی کوئی تعریف موجود نہیں‘ کسی بین الاقوامی قانون کے تحت یہ کوئی جرم نہیں ہے‘ نہ اس کی کوئی سزا ہے (شکری‘ ۱۹۹۱ء)۔ بلکہ اس موضوع پر سب سے مستند کتاب کے مصنف کا کہنا ہے کہ: ”دہشت گردی کی تعریف مبہم ہی نہیں‘ مفقود ہے۔ مفقود ہی نہیں ناممکن ہے“ (Lacguer 1977, p 5)۔ جو بھی تعریف موجود ہے‘ وہ سخت متنازع ہے۔ کیونکہ یہ قانون کا مسئلہ ہی نہیں‘ سیاست کا مسئلہ ہے۔ ہر تعریف سیاسی تعریف ہوتی ہے‘ جس کا مقصد جرم کے تعین سے زیادہ ملزم کی مذمت ہوتا ہے‘ تاکہ اپنے مخالفین کی حرکات کے خلاف کارروائی کا جواز ملے‘ اور ان کے خلاف اپنے تعصب اور اپنے سیاسی مفاد کے تقاضوں کی تکمیل ہو سکے (Rubenstein, 1977)۔

نتیجہ یہ ہے کہ جو تشدد اپنے مفاد میں ہو وہ برحق ہوتا ہے‘ جو اپنے خلاف ہو وہ ناحق ہے اور دہشت گردی کہلاتا ہے۔ آج کا مجاہد حریت‘ کل کا دہشت گرد ہے‘ اور آج کا دہشت گرد‘ کل کا وزیراعظم (جیسے اسرائیلی وزیراعظم بن گوریان‘ کینیا کے صدر [۱۹۶۴-۷۸ء] جوموکین یاٹا [م: ۱۹۷۸ء])۔

اگر تشدد کرنے والے اپنے ہیں تو ہمدردی کے ساتھ ان کے محرکات اور ان کی حرکات کے جواز اور ان کے علاج کا تجزیہ ہوگا‘ ان پر غور و خوض ہوگا۔ ان کا جرم ان کا انفرادی جرم شمار ہوگا‘ پوری قوم مجرم نہیں ٹھیرے گی‘ جیسے امریکی دہشت گرد۔

اگر ان کے تشدد سے اپنے مفاد پر زد پڑتی ہے‘ وہ سیاسی یا تہذیبی دشمن ہوں‘ تو وہ سخت دہشت گرد قرار پائیں گے‘ قابلِ تعزیر ٹھیریں گے ـــــ ان کا کلچر بھی مجرم‘ ان کا مذہب بھی مجرم‘ اور ان کا پورا ملک بھی مجرم‘ جیسے مسلمان دہشت گرد۔

جس کی لاٹھی اس کی......

جو ملک طاقت ور ہیں‘ وہ دھڑلے سے اپنے مفادات کے حصول کے لیے جس کے

خلاف چاہیں' جہاں چاہیں' جس قسم کی فوجی' اقتصادی' سیاسی کارروائی چاہیں' وہ کرتے ہیں۔ وہ پورے پورے ملکوں کو اپنے تشدد کا نشانہ بناتے ہیں' جیسے امریکا نے عراق' پاناما اور ہیٹی کو بنایا۔ جب چاہیں' جہاں چاہیں' جتنے چاہیں' بم گرا دیتے ہیں۔ جیسے اسرائیل' لبنان پر گراتا ہے' تیونس تک پہنچ کر تنظیم آزادی فلسطین (PLO) کے ہیڈکوارٹر پر گرائے' عراق کی ایٹمی تنصیبات کو تباہ کیا۔ امریکا نے کمبوڈیا کے چھوٹے سے علاقے پر اتنے بم گرائے کہ دوسری جنگ عظیم کی مہیب بم باری ماند پڑ گئی۔ لیبیا میں طرابلس اور بن غازی کے شہری علاقوں اور وہاں کے صدر معمر قذافی کے گھر کو نشانہ بنایا۔

وہ اپنے ایجنٹ باہر بھیج کر حکومتوں کے تخت اُلٹ دیتے ہیں' جیسے سی آئی اے نے ایران میں وزیراعظم ڈاکٹر مصدق کا [۱۹۵۳ء میں] تختہ اُلٹ دیا۔ وہ بیرونی سربراہانِ حکومت اور لیڈروں کو قتل کرا سکتے ہیں اور ان پر قاتلانہ حملہ کر سکتے ہیں' جیسے چلی کے منتخب صدر ڈاکٹر سلواڈور آلندے [م: ستمبر ۱۹۷۳ء]' کیوبا کے فیڈل کاسترو' ایران کی پارلیمنٹ کے اسپیکر آیت اللہ بہشتی' صدر محمد علی رجائی' اور وزیراعظم جواد باہنر [م: ۲۹ اگست ۱۹۸۱ء]' لبنان کے شیخ فضل اللہ' سعودی عرب کے فرماں روا شاہ فیصل بن عبدالعزیز [م: مارچ ۱۹۷۵ء]' پاکستان کے صدر محمد ضیاالحق [م: ۱۸ اگست ۱۹۸۸ء] وغیرہ کے ساتھ کیا گیا ___ وہ ایک ملک کی پوری آبادی کو' بشمول عورتوں اور بچوں کے' طویل بھوک اور بیماری میں مبتلا کر سکتے ہیں' جیسے عراق میں۔

کیونکہ ان طاقت ور ملکوں ہی کے پاس دہشت گردی کی تعریف متعین کرنے کی طاقت اور اختیار بھی ہے۔ اس لیے وہ اپنے ان سارے افعال کو' اس ریاستی دہشت گردی کو دہشت گردی کی تعریف سے باہر رکھتے ہیں' بلکہ انھیں حق و انصاف اور انسانیت کی فلاح کے زمرے میں شمار کرتے ہیں۔

مگر جن بے طاقت و بے بس لوگوں کے پاس اپنے اُوپر مظالم کے خلاف احتجاج

رجسٹر کرانے اور اپنی طرف توجہ مبذول کرانے کے لیے ہائی جیکنگ' اِکا دکا بم پھینکنے اور قتل کے علاوہ اور کوئی ہتھیار نہیں ہوتا' ان کے افعال کو یہ طاقتیں بڑے شدومد سے بدترین دہشت گردی قرار دیتی ہیں' اور ساری دنیا کو ان کے خلاف کھڑا کرنے کے لیے بھاگ دوڑ کرتی رہتی ہیں۔ اسی لیے لاکھوں کی بھارتی فوج کشمیر میں' روسی فوج چیچنیا میں' اسرائیلی فوج بیروت میں جتنا بھی قتل عام کرے' گھر جلائے' یہ ''جائز'' کارروائیاں ہیں۔ دہشت گرد کشمیری ہیں' فلسطینی ہیں' چیچن ہیں' اور پاکستان ہے اگر وہ مظلوم کشمیریوں کی مدد کرے!

مغرب کا داغ دار چہرہ

تصویر کے بجائے حقیقت کی تلاش ہو تو یہ دیکھنا بھی ضروری ہے' کہ خود ان مغربی ممالک میں رہنے والے مسلمانوں کے جان و مال' ان کا مذہب اور ان کی عبادت گاہیں اہلِ مغرب کی دہشت گردی سے کس حد تک محفوظ ہیں؟

۱- عبادت گاہوں اور قبرستانوں کے خلاف تشدد اور بے حرمتی کی کارروائیوں کو بدترین دہشت گردی قرار دیا جانا چاہیے۔ برطانیہ' جرمنی اور یورپ میں مساجد اور مسلمانوں کے قبرستانوں پر حملے اور وہاں سور کے گوشت کے ٹکڑے پھینکنے کے ان گنت واقعات ہوئے ہیں۔

۲- امریکا اس لحاظ سے بھی بازی لے گیا۔ کیلے فورنیا میں' سان فرانسسکو سے ۲۲۵ کلومیٹر دُور' یوبا شہر میں ۱۰ لاکھ ڈالر کے خرچ سے تین سال میں ایک خوب صورت مسجد تیار ہوئی' جس کی تعمیر کی اجازت دینے میں ہی دو سال لگائے گئے۔ تیار ہوتے ہی یکم ستمبر ۱۹۹۴ء کو آتش گیر کیمیائی مادوں کی مدد سے راتوں رات پوری مسجد کو جلا کر راکھ کر دیا گیا۔ امریکا ہر ملک میں تشدد کی ہر کارروائی کو خوب اُچھالتا ہے' پھر اس کی مذمت کے لیے بھی دباؤ ڈالتا ہے' لیکن امریکی اخبارات' ٹی وی اور

ریڈیو نے اس حادثے کی خبر تک دینا گوارا نہ کیا۔ مسلمان خود کوشش نہ کرتے تو دنیا میں کسی کو اس کا علم بھی نہ ہوتا۔ کیلیفورنیا کے گورنر پیٹرولسن کی طرف سے اس بہیمانہ جرم کے خلاف ایک لفظ بھی سننے میں نہ آیا' نہ کسی اور حکومتی عہدے دار نے کچھ کہا۔ مسلمانوں کا بین الملکی پارلیمانی وفد' امریکی وزارت خارجہ کے پانچ عہدے داروں سے ملا تو انھوں نے اس واقعہ کا نوٹس لینے سے بھی انکار کر دیا' بلکہ اُلٹا مسلم ممالک میں ''انتہا پسند مسلمانوں'' کی زیادتیوں کا شکوہ کرتے رہے۔ (اگر پاکستان میں' یا کسی مسلمان ملک میں کوئی چرچ جلا دیا جاتا تو ـــــــ) اس سے پہلے بیت المقدس میں مسجد الخلیل میں یہودی دہشت گرد نے جو خون ریزی کی' اس پر بھی یہی کچھ ہوا۔

۳- اسلام کے نزدیک انسانی جان' عبادت گاہ سے بھی زیادہ محترم ہے۔ برطانیہ' جرمنی' فرانس' بلجیم وغیرہ میں سڑکوں پر اور گھروں میں' مسلمانوں پر جو حملے مسلسل ہو رہے ہیں' ان کا ذکر جانے دیجیے' لیکن کسی کو پانی میں ڈبو دینے یا گھر میں جلا کر راکھ بنا دینے کی بہیمانہ دہشت گردی کیا کسی مسلمان ''دہشت گرد'' نے بھی کبھی کی ہے؟ لیکن دہشت گردی کے خلاف مہم چلانے والے ممالک میں گزر بسر کرنے والے مسلمان اس درندگی کا شکار بنتے رہتے ہیں۔ اس کے لیے میڈیا کا عنوان ''نسلی تعصب'' (racism) ہے' دہشت گردی نہیں۔ شکار ترک' مراکشی ہوتا ہے' مسلمان نہیں۔

۴- ۲۹ مئی ۱۹۹۳ء کو کولون کے نزدیک واقع' جرمنی کے شہر سولنجن (Solingen) میں دہشت گردوں نے ایک مسلمان گھر کو آگ لگا دی' دو مسلمان عورتیں اور دو لڑکیاں گھر کے اندر جل کر مر گئیں' ایک نے کھڑکی سے چھلانگ لگا دی' مگر وہ بھی جان سے ہاتھ دھو بیٹھی۔ یہ خاندان جرمنی میں ۲۰ سال سے مقیم تھا۔ اس نوعیت کا یہ پہلا

واقعہ نہ تھا' (نہ آخری ہوگا!)

۵- نومبر ۱۹۹۲ء میں' ہمبرگ کے قریب' مولن (Molln) شہر میں دو مسلمان گھروں پر آتشیں بم پھینکے گئے' اور ایک عورت اور دو لڑکیاں اپنے بستروں میں زندہ جل گئیں' ۹ افراد شدید زخمی حالت میں بچ پائے۔ (پاکستان میں کسی عیسائی گھر کو جلا دیا جاتا تو ـــــ)

۶- پیرس میں' دو ہفتے قبل' یکم مئی کو انتہا پسند صدارتی امیدوار لی پین کی ریلی کے موقع پر تین سرمنڈے غنڈوں نے ایک مراکشی مسلمان' ابراہیم کو اٹھا کر دریائے سین میں غرق کر دیا' اور خود مجمع میں گم ہو گئے۔

۷- تین مسلمان عورتوں اور پانچ لڑکیوں کو زندہ جلا دیا گیا تو [متحدہ] جرمنی کے [پہلے] چانسلر ہیلمٹ کوہل [Helmut Kohl-۱۹۹۰ء] نے کیا کیا؟ انھوں نے سولنجن میں جل کر مرنے والے مسلمانوں کے جنازے میں شرکت سے انکار کر دیا' نہ ان کے گھر گئے بلکہ وہ آج تک کسی بھی ایسے گھر میں اظہار ہمدردی کے لیے نہیں گئے ہیں جہاں مسلمانوں پر حملہ ہوا ہو' وہ ان حرکتوں کی زوردار مذمت کرنا بھی ناپسند کرتے ہیں۔

۸- کراچی میں دو امریکی سفارت کار مارے گئے تو امریکا میں ہلچل مچ گئی۔ اس کی خفیہ ایجنسی ایف بی آئی کراچی میں اتری' اور ٹائم (Time) میگزین نے بغیر کسی ثبوت کے' یہ سرخی جمانے میں کوئی جھجک نہیں محسوس کی کہ ''اسلامی تشدد پسندوں نے دو جانیں لے لیں''۔ لیکن یورپ کے طول و عرض میں عرصے سے ترک سفارت کاروں اور ترک مراکز کے خلاف جو دہشت گردی آرمینیائی اور کرد کر رہے ہیں' ان کے خلاف یورپ کی حکومتیں تحفظ فراہم کرنے میں کیوں بالکل ناکام ہیں؟

ہم ظلم کے طرف دار نہیں

ہمیں اس بات کے اعتراف میں کوئی تامل نہیں، کہ بعض مسلمانوں نے بے گناہ انسانوں کی جان و مال کی سلامتی کے مسلّم و محترم اصول کے خلاف کارروائیاں کی ہیں، اور چند کررہے ہیں۔ کسی حکومت نے بعض کارروائیوں کی سرپرستی بھی کی ہوگی۔ بے شک وہ مسلمان مظلوم، بے بس اور کمزور ہیں۔ اتنی طاقت سے محروم ہیں کہ اپنے اوپر سے ظلم دفع کرسکیں۔ بعض سے ان کا ملک اور زمینیں بالجبر چھین لی گئی ہیں اور وہ نصف صدی سے بے گھر ہیں۔ بعض کے اوپر مغربی حکومتوں کے سہارے ایسے آلہ کار حکمران مسلط ہیں جو نہ صرف جبر واستبداد کے مرتکب ہیں، بلکہ قومی دولت اپنی رنگ رلیوں اور مغربی آقاؤں کی خوشنودی کی خاطر لٹانے میں بھی مشغول ہیں ــــ مغرب کے جرم وسزا کے فلسفے کی رو سے ایسے لوگوں کے سارے جرائم جائز ٹھیریں گے۔ لیکن اسلام نے جو اٹل اور بے لاگ تعلیمات دی ہیں، ان کی روشنی میں ہمیں ان سے یہ کہنے میں کوئی تامل نہیں، کہ ان کی ایسی کارروائیاں خلافِ اسلام ہیں اور انھیں ان سے اجتناب کرنا چاہیے۔ کیونکہ عام، بے گناہ اور لاتعلّق لوگوں کی جان لینے والی ایسی کارروائیوں سے اسلام کے مقاصد پورے نہیں ہوں گے۔

اسلام کی رو سے: انسانی جان اتنی قیمتی ہے کہ ایک بے گناہ کا خون بہانا ایسا ہے کہ گویا سارے انسانوں کا خون بہا دیا[المائدہ ۵:۳۲]۔ مسلمان وہ ہے جس کے ہاتھوں اور زبان سے لوگوں کی جان، مال اور عزت محفوظ رہے(الجامع الصحیح)۔ اس میں مسلم اور غیر مسلم کی کوئی تفریق نہیں۔ حالتِ جنگ میں کوئی مشرک بھی پناہ مانگے تو اسے پناہ دے کر اپنے ٹھکانے پر پہنچا دینے کا حکم ہے[التوبہ ۹:۶]۔ کوئی امن وصلح کی درخواست کردے، اس کو مارنا حرام ہے۔ قیدی کو چھوڑ دینے کی ترغیب دی گئی ہے۔ اس کو باندھ کر مارنے کی سرے سے کوئی گنجایش ہی نہیں۔ حالتِ جنگ میں بھی، عورتوں، بچوں، بوڑھوں، معذوروں اور بیماروں پر ہاتھ اٹھانے سے اور کھیتوں اور کارخانوں کو جلانے سے منع کیا گیا ہے۔

ہم اس دلیل کے بھی قائل نہیں: ''کیوں کہ یہ گناہ آپ بھی کرتے ہیں۔ اس لیے ہمارے لیے بھی کرنا جائز ہے''۔ مسلمانوں کی جن کارروائیوں کو مغرب اپنی متعین کردہ تعریف کے مطابق دہشت گردی قرار دیتا ہے' وہ مغرب کی ویسی ہی کارروائیوں کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں۔ لیکن ہم فی الوقت اس موازنے میں پڑنے کا بھی کوئی فائدہ نہیں دیکھتے۔

یہ خطرناک کھیل

ہم امریکا اور مغرب کے حکمرانوں' دانش وروں اور میڈیا سے صرف یہ کہنا چاہتے ہیں' کہ خدا کے لیے اسلام اور مسلمانوں کے خلاف نفرت کا زہر گھولنے کا یہ خطرناک کھیل بند کر دیجیے' ورنہ جو آگ آپ بھڑکا رہے ہیں' اس میں آپ خود بھی بھسم ہو سکتے ہیں۔

دنیا میں جس چابک دستی سے آپ نے اسلام کو فنڈامنٹلزم (جو ایک عیسائی اصطلاح ہے) سے منسوب کیا ہے' اور پھر فنڈامنٹلزم کو دہشت گردی کی نقاب اڑھائی ہے۔ گویا اسلام اور فنڈامنٹلزم اور دہشت گردی کی تکون قائم کی ہے' اس سے آپ نہ اپنا بھلا کر رہے ہیں' نہ دنیا کا۔ جاپان کی ریل گاڑیوں میں زہریلی گیس اور اوکلاہوما میں بم کے دھماکے یہ بتانے کے لیے کافی ہونے چاہییں کہ بے بس مظلوم یا اپنے مقصد کے متوالے کیا کچھ نہیں کر سکتے۔ تاہم یہ ضروری نہیں کہ یہ کرنے والے مسلمان ہی ہوں۔

آپ ہی نے دنیا بھر کو یقین دلایا ہے کہ اصل خطرہ اسلام اور مسلمان ہیں۔ رابرٹ اوکلے' اسٹیٹ ڈیپارٹمنٹ کے پالیسی پیپر (اکتوبر ۱۹۸۵ء) میں لکھتے ہیں: ''خانگی دہشت گردی بھی ایک سنگین مسئلہ ہے مگر ایف بی آئی [FBI] اور نفاذ قانون کے ادارے اس کو قابو سے باہر نہیں ہونے دیں گے [جیسے اوکلاہوما نے ثابت کر دیا کہ وہ کتنے قادر ہیں]۔ وسیع پیمانے پر دہشت گردی کا اصل خطرہ تو باہر سے ہے' خاص طور پر مسلم (Moslem) سے''۔ امریکی ٹیلی ویژن نیٹ ورک اے بی سی [ABC] کے نائٹ لائن (Nightline) پروگرام میں'

۴۰ ماہ [۸۸-۱۹۸۵ء] کے دوران دہشت گردی کے بارے میں ۵۲ پروگرام دکھائے جاتے ہیں، تو ان میں سے ۴۸ کا ارتکاز مشرق وسطیٰ پر ہوتا ہے۔ لیکن نیوز ویک، اوکلاہوما سے قبل سات دن کے واقعات کا جائزہ پیش کرتا ہے تو ۱۲ میں سے صرف ۳ کا تعلق مسلمانوں سے نکلتا ہے۔

اسی نفرت انگیزی کا نتیجہ ہے کہ مغرب اور اسلام کے درمیان محاذ آرائی گرم سے گرم تر ہوتی جارہی ہے، اور مسلمانوں کے دلوں میں امریکا کے خلاف نفرت روز بروز بڑھتی جارہی ہے۔ اس نفرت کا دائرہ اب کوئی صرف بنیاد پرستوں تک محدود نہیں، بڑے بڑے سیکولر، لبرل، دانش ور، صحافی اور لیڈر اس میں شریک ہو چکے ہیں۔

کیا یہ سب اچھا ہو رہا ہے؟ کیا امریکا کو یہی مطلوب ہے؟

مسلمانوں کا حق

مسلمان ''جیو اور جینے دو'' کے اصول پر مغرب سے اچھے تعلقات استوار کر سکتے ہیں۔

اس کا پہلا تقاضا یہ ہوگا، کہ وہ اسلام کی تعلیمات کے مطابق جئیں گے، آپ اس کو قبول کرلیں تو فبہا، ورنہ مسلمان اپنا یہ حق حاصل کرنے کے لیے جان دینے سے بھی دریغ نہ کرے گا۔ ہاں، جو مسلمان مغرب میں رہتے ہیں، وہاں کے خیر خواہ اور وہاں کے قوانین کے پابند ہوں گے۔

اس کا دوسرا تقاضا یہ ہوگا، کہ مسلمان عوام، جابر و مستبد اور مغرب کے ایجنٹ، حکمرانوں کے پیران تسمہ پا کی گرفت سے اپنی گردنیں آزاد کریں گے۔ وہ اپنے وسائل اور دولت کو اپنی صوابدید کے مطابق آزادی سے استعمال کرنے کا اختیار حاصل کریں گے۔ وہ ترقی اپنے ماڈل کے مطابق کریں گے۔ اس کے لازمی معنی یہ نہیں کہ وہ مغرب کے مفادات کو نقصان پہنچائیں گے۔ آج کی دنیا میں تعاون ہی سے معاشی و سائنسی ترقی ممکن ہے، مگر مغرب کو ناجائز استحصال ضرور ختم کرنا ہوگا۔

اس فریم ورک میں' اگر مغرب مسلمان ممالک کو اپنے سیاسی اور اقتصادی شکنجے میں کسے رکھنے پر مصر نہ ہو' تو اسلامی تحریکات بھی' بنیاد پرست بھی' عام مسلمان بھی' امریکا اور مغرب کے اچھے دوست ثابت ہو سکتے ہیں۔ انھیں امریکا سے کوئی پیدایشی دشمنی نہیں۔

اگر امریکا اور مغرب اپنی روش اور اسلام اور مسلمانوں کے خلاف اپنی دشمنی اور نفرت انگیزی پر اڑے رہے' تو ہمیں خطرہ ہے کہ کف افسوس ملنے کے علاوہ کچھ حاصل نہ ہوگا۔ حال ہی میں امریکی صدر جان ایف کینیڈی اور صدر لنڈن بی جانسن کے ادوار حکومت میں ویت نام جنگ کے معمار' اور سابق امریکی وزیر دفاع' رابرٹ میکنا مارا نے اپنا ''اعتراف گناہ'' شائع کیا ہے۔ اس جنگ میں ۶۰ ہزار امریکی فوجیوں کی جانوں' ۳۳ لاکھ ویت نامی جانوں اور اربوں ڈالر کی قیمت ادا کرنے کے بعد' میکنا مارا صاحب کہتے ہیں:

> ہائے افسوس ہم نے جو کچھ کیا تھا غلط کیا تھا' بہت غلط' ایک عظیم الشان غلطی...... غلطی کی وجہ یہ تھی کہ ہم وہاں کے لوگوں کی تاریخ' کلچر اور سیاست سے بالکل ناواقف تھے۔

کہیں ایسا نہ ہو کہ وقت گزرنے کے بعد' اس سے زیادہ گراں قیمت ادا کرنے کے بعد' کسی میکنا مارا کو یہی کچھ نہ کہنا پڑے۔

ہماری تمنا ہے کہ امریکا اور مغرب اپنی غلط روش کا احساس کریں اور مسلم دنیا سے اپنے تعلقات کو ایک نئے سانچے میں ڈھال کر نئے سرے سے ان کا آغاز کریں۔ [جون ۱۹۹۵ء]

□□□

یہودیوں سے جنگ میں شکست کیوں؟

چند روز پیش تر شرق اوسط میں جو عبرت ناک واقعات پیش آئے ہیں اور، اس کے نتیجے میں مسلمان جس ذلت اور رسوائی کا شکار ہوئے ہیں، اس کی مثال ہماری چودہ سو سالہ تاریخ میں کم ہی ملتی ہے۔☆

ذلت کا عذاب

اس جنگ کے دوران ہماری یہ رسوائی بھی ہوئی کہ چودہ عرب ریاستیں اپنے تمام وسائل و ذرائع کے ساتھ ایک حقیری ریاست سے شکست کھا گئیں، جب کہ ان کی پشت پر تمام مسلمان ممالک کی ہمدردیاں بھی تھیں۔ پھر ہم نے یہ ذلت بھی اٹھائی کہ جو جنگ اس بلند بانگ دعوے سے شروع ہوئی تھی کہ: ''عالمِ اسلام کے سینہ کا خنجر چار دن میں نکال کر سمندر میں پھینک

☆ ۵ تا ۱۰ جون ۱۹۶۷ء ــــ عرب اسرائیل جنگ کے دوران، اسرائیل نے عربوں کو عبرت ناک شکست دے کر اُردن سے بیت المقدس اور یروشلم، مصر سے نہر سویز اور صحرائے سینا اور شام سے گولان کی پہاڑیاں چھین لیں۔ جناب خرم مراد ان دنوں ڈھاکہ میں جماعت اسلامی کے امیر تھے۔ انھوں نے جنگ کے چند روز بعد ۱۵ جون ۱۹۶۷ء کو کارکنوں سے جو خطاب کیا، وہ پمفلٹ کی صورت میں (کوثر ہاؤس، صدیق بازار) ڈھاکہ سے شائع ہوا تھا جسے کتاب کی مناسبت سے یہاں پیش کیا جا رہا ہے۔ مرتب

دیا جائے گا''۔ وہ اس شرمناک انجام پر ختم ہوئی کہ یہ خنجر دو دن میں سینے سے اُوپر ہماری شہ رگ تک پہنچ گیا۔ خلیج عقبہ اور نہر سویز دونوں دشمن کی دست برد سے نہ بچ سکیں۔

سب سے بڑھ کر شرمناک بات یہ ہے کہ جس مقدس شہر (بیت المقدس) کی حفاظت ہمارے سپرد ہوئی تھی اس کو ہم نے نہ صرف یہ کہ ضائع کر دیا' بلکہ اس قوم نے ہم سے اسے چھینا جس کو ڈھائی ہزار سال پہلے اللہ تعالیٰ نے ذلیل وخوار کر کے وہاں سے نکال دیا تھا۔ ان سب پر مستزاد ہمارے نوجوانوں کا وہ گرم گرم خون اور ہمارے ترکش کے وہ تیر ہیں' جو بغیر کسی مقابلے کے دشمنوں کے قدموں پر ڈھیر ہو گئے۔

آج ہر مسلمان اپنی اس ذلت پر سوگوار ہے۔ وہ بے چین ہو ہو کر پوچھ رہا ہے: ''آخر یہ سب کیسے ہو گیا؟''

حقیقت یہ ہے کہ اگر ہم اب بھی جاگ جائیں اور اس سوال کا جواب پا کر اپنے حالات درست کر لیں تو یہ تازیانۂ عبرت ہمارے لیے سامانِ رحمت بن سکتا ہے۔ یہ ہمارا ایمان ہے کہ اس دنیا میں ایک حکیم اور مدبر ہستی کا راج ہے۔ یہ کوئی اندھیر نگری اور چوپٹ راج نہیں ہے کہ بلا سبب اور بلا قانون اتنے بڑے بڑے واقعات رونما ہو جائیں۔ جہاں ایک پتہ بھی خدا کی مرضی کے بغیر نہ ہل سکتا ہو وہاں اتنا بڑا زلزلہ اچانک کہیں خلا سے یوں ہی نمودار نہیں ہو گیا' بلکہ ہم نے خدا کے قانون کے تحت وہی فصل کاٹی ہے جس کے بیج ہم عرصے سے بو رہے تھے۔

اگر ہم نے اب بھی آنکھیں نہ کھولیں اور شکست کے اسباب اپنے اندر ڈھونڈنے کے بجائے اس کی ذمہ داری مغربی استعماری طاقتوں کی دخل اندازی' دشمن کی مکاری' نام نہاد دوستوں کی بے وفائی اور ٹکنالوجی میں اپنی کم تری جیسے عذرات لنگ کے سر منڈھتے رہے تو ہم کو مستقبل میں اس سے بھی بدتر ذلت کے لیے تیار ہو جانا چاہیے۔ اس لیے کہ قدرت بار بار سبق نہیں دیا کرتی۔

ذرا سوچیے ......

کیا ہمارے حکمرانوں کو پہلے سے یہ معلوم نہ تھا کہ اسرائیل بڑی طاقتوں کا قائم کردہ اور پروردہ ملک ہے اور کسی بھی جنگ میں یہ طاقتیں اس کی پشت پناہی کریں گی۔ پھر دخل اندازی کا یہ گلہ کیوں؟

کیا ہمارے حکمران یہ سمجھتے تھے کہ دشمن ہم سے پوچھ کر حملہ کرے گا' کہ کب کریں اور کدھر سے آئیں اور اگر اس کی طاقت ہمارے اندازے سے زیادہ نکلی تو قصور کس کا ہے؟

اگر "دوستوں" نے بے وفائی کی تو ہم اتنے نادان کیوں بن گئے تھے کہ یہ بھی نہ سوچ سکے کہ کفر خواہ واشنگٹن میں ہو یا ماسکو میں' پیرس میں ہو یا بیجنگ اور دہلی میں' کہیں بھی اسلام کا دوست نہیں بن سکتا۔ پھر شکایت کس لیے؟

اور جہاں تک سائنس اور ٹکنالوجی میں کم تری کا سوال ہے تو کیا ویت نام اور کیوبا اس لحاظ سے اپنے دشمن [امریکا] سے برتر ہیں کہ انھوں نے اس کے دانت کھٹے کر دیے؟

پھر سوال یہ ہے کہ سائنس و ٹکنالوجی کی جتنی قوت پہلے سے ہمارے مسلم عرب حکمرانوں کے پاس تھی' کیا وہ ہمارے کام آئی۔ اگر ہمارے لڑاکا جنگی طیارے اُڑ نہ سکے' ہمارے میزائل فائر نہ ہو سکے اور ہمارے ٹینک آگے نہ بڑھ سکے تو اور مزید قوت حاصل کر لینے سے ہمارا کیا بھلا ہو جاتا؟ اگر جنگ کے فیصلہ کا دارومدار اسلحہ اور تعداد پر ہوتا تو آج اسلام دنیا میں کہیں نظر بھی نہ آتا۔

مسلمانوں کے لیے قانونِ الٰہی

اتنا بڑا المناک حادثہ اس قانونِ الٰہی کے تحت ہوا ہے کہ جب اللہ کی طرف سے کتاب پانے والی قوم اس کتاب کو پیچھے ڈال کر اللہ کے مقابلے میں سر اٹھاتی ہے' اللہ کی کتاب کو غالب کرنے کا مشن بھول کر ہر گمراہی کے پیچھے دوڑتی ہے اور اس کے اپنے اندر جو لوگ اس کتاب

پر عمل کی دعوت دیتے ہیں ان کو ظلم وستم کا نشانہ بناتی ہے' اور ان کا خون بہاتی ہے اور ٹکڑے ٹکڑے ہو کر دنیاوی طاقتوں کے آگے سجدہ ریز ہو جاتی ہے ___ تو اللہ تعالیٰ اس پر دشمنوں کو مسلط کر کے اس کی عزت و آبرو کو ملیامیٹ کر دیتا ہے۔ منکرین پر تو اس کا عذاب اکثر طوفان' کڑک اور زلزلہ کی صورت میں آ کر ان کو مٹا دیتا ہے' لیکن اپنے سے بے وفائی کرنے والوں کو اللہ تعالیٰ مٹانے کے بجائے ذلیل و خوار کر کے رہتی دنیا میں ایک سامانِ عبرت بنا کر رکھ دیتا ہے:

أُولَٰئِكَ جَزَآؤُهُمْ أَنَّ عَلَيْهِمْ لَعْنَةَ اللّٰهِ وَالْمَلَٰٓئِكَةِ وَالنَّاسِ أَجْمَعِينَ ○

(آل عمران ۳:۸۷) ان کے ظلم کا صحیح بدلہ یہی ہے کہ ان پر اللہ اور فرشتوں اور تمام انسانوں کی پھٹکار ہے۔

خدا کے اس قانون کی بہترین مثال خود بنی اسرائیل ہیں' جن کا ذکر قرآن نے شروع میں ہی اتنی تفصیل سے اسی لیے کیا ہے کہ مسلمان اس انجام سے ہوشیار رہیں' جو ان کے حصّہ میں آیا ___ وہ ہم مسلمانوں سے پہلے کتابِ الٰہی کے حامل تھے۔ پھر انھوں نے اپنے خدا سے بے وفائی کی تو اللہ نے ان کو اس لیے زندہ نہ رکھا کہ وہ زندہ رہنے کے مستحق تھے' بلکہ اس لیے کہ خدا سے بے وفائی کی سزا یہی ہو سکتی تھی کہ وہ دربدر کی ٹھوکریں کھاتے پھریں۔ اس لیے بھی کہ اگر ان کے بعد آنے والی اُمت بھی خدا سے بے وفائی کرے تو اس پر انھی کو مسلط کیا جائے۔

سوچنے کی ضرورت ہے کہ بحیثیت مسلم اُمہ ہم نے وہ کون سے اعمال کیے ہیں کہ مشیت الٰہی نے یہ تک گوارا کر لیا کہ جس قوم کو وہ ذلیل کر کے دنیا میں تتر بتر کر چکی تھی' اسی کو وہ ہمارے اُوپر مسلط کرنے کے لیے دوبارہ کھڑا کر لائے۔ ظاہر بات ہے کہ جس درخت نے بنی اسرائیل کی جھولی کانٹوں سے بھر دی تھی اگر وہی درخت ہم بوئیں گے' تو ہماری جھولی میں پھول نہیں گریں گے بلکہ ویسے ہی کانٹے گریں گے۔ خدا کا قانون نہ بدل سکتا ہے اور نہ

جانب داری برت سکتا ہے۔ سچی بات تو یہ ہے کہ اگر بنی اسرائیل کے راستے پر چل کر ہمارا انجام ان سے مختلف ہوتا تو خدا کے عدل پر سوال اٹھایا جاتا۔

ذرا تورات اُٹھا کر دیکھیے تو بنی اسرائیل کے اعمال اور ان کی سزا کے آئینے میں ہم کو اپنی تصویر نظر آئے گی۔ تورات کہتی ہے:

- تو نے اپنے جوئے کو توڑ ڈالا اور اپنے بندھنوں کے ٹکڑے کر ڈالے اور کہا کہ میں اپنے دین کے تابع نہ رہوں گا۔
- یہ اپنی مخالف قوموں سے مل گئے اور ان کے سے کام سیکھ گئے۔ انھوں نے اپنی بیٹیوں کو شیاطین کے لیے قربان کیا اور معصوموں کا یعنی اپنے بیٹوں اور بیٹیوں کا خون بہایا۔
- تیرے سردار خونی اور چوروں کے ساتھی ہیں۔ ان میں ہر ایک رشوت دوست اور انعام کا طلب گار ہے۔ وہ یتیموں کو انصاف فراہم نہیں کرتے اور بیواؤں کی فریاد ان تک نہیں پہنچتی۔
- تم اس کلامِ الٰہی کو حقیر جانتے ہو اور کج روی پر بھروسا کرتے ہو۔ اس لیے یہ بدکرداری تمھارے لیے ایسی ہوگی جیسے پھٹی ہوئی دیوار جو گرا چاہتی ہے۔ وہ اسے کمہار کے برتن کی طرح توڑ ڈالے گا اور بے دریغ چکنا چور کر دے گا۔
- اسی لیے خداوند کا قہر اپنے لوگوں پر بھڑکا اور اسے اپنی قوم سے نفرت ہوگئی اور اس نے ان کو قوموں کے قبضہ میں دے دیا اور ان سے عداوت رکھنے والے ان پر حکمران بن گئے۔
- اے اسرائیل کے گھرانے' دیکھ میں ایک قوم کو دور سے تجھ پر چڑھا لاؤں گا' وہ تیرے مضبوط شہروں کو جس پر تیرا بھروسا ہے' تلوار سے ویران کر دیں گے۔
- انھوں نے میری طرف منہ نہ کیا بلکہ پیٹھ کی۔ پھر اپنی مصیبت کے وقت وہ کہیں گے

کہ اللہ ہم کو بچا ـــــ لیکن تیرے وہ سہارے کہاں ہیں جن کو تو نے اپنے لیے بنایا۔
اگر وہ تیری مصیبت کے وقت تجھ کو بچا سکتے ہیں تو انھیں کیونکہ اے یہوداہ! جتنے
تیرے ملک ہیں اتنے ہی تیرے معبود ہیں۔

عرب قیادت کا کردار

ویسے تو پوری اُمت مسلمہ کسی نہ کسی طرح اسی تصویر کا ایک نمونہ ہے لیکن اس کا وہ حصّہ جو اس جنگ میں اسرائیل سے برسرِ پیکار تھا' اس کی قیادت تو ایسے عناصر کے ہاتھ میں تھی جو خدا سے بے وفائی' اسلام دشمنی اور مسلمانوں کا خون بہانے میں سب سے ہی آگے بڑھ گئے تھے۔

ان عناصر میں سب سے نمایاں مثال مصر کے آمر مطلق جمال عبدالناصر [م: ۱۹۷۰ء] کی ہے۔ ہر مسلمان کو جاننا چاہیے کہ پچھلے چودہ سال سے وہ کس روش پر گامزن رہے ہیں۔ یہ جاننے سے اس سوال کا جواب ملے کہ یہ عبرت ناک حادثہ کیسے پیش آیا۔

خدا پرستی نہیں' قوم پرستی

خدا کے دیے ہوئے دین کے ساتھ ان کا سلوک یہ رہا ہے کہ اپنے ریاستی دستور سے اسلام کو کھلم کھلا خارج کر کے عرب سوشلزم (قوم پرستی+سوشلزم) کو سرکاری مذہب کے طور پر اختیار کیا۔ مسلمان ہونے کے بجائے عرب ہونے پر فخر کیا۔ عربوں میں سے بھی ان ممالک کو جو سوشلسٹ پارٹیوں کے زیرنگیں نہ تھے' انھیں مسلمان اور عرب ہونے کے باوجود دشمن اور گردن زدنی قرار دیا۔ اس عبرت ناک جنگ سے صرف تین ہفتے پہلے ناصر صاحب نے ایک ہی سانس میں' اسرائیل کے ساتھ ساتھ سعودی عرب' اُردن اور تیونس کو مغربی استعمار کا ایجنٹ قرار دیتے ہوئے مٹا دینے کی دھمکی دی۔

حد یہ ہے کہ اس پوری جنگ میں نہ عالمِ اسلام کو مدد کے لیے پکارا' اور نہ اپنی قوم کو اسلام کے لیے لڑنے کی دعوت دی۔ قوم کو اس کلمہ کی بنیاد پر لڑائی کے میدان میں نہیں اتارا جو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سکھایا ہے یعنی لا الٰہ الا اللّٰہ محمد رسول اللّٰہ، بلکہ وہ اس کلمہ پر میدانِ جنگ میں اترے جو عیسائی پادریوں نے سکھایا اور جو عربیت کا کلمہ ہے' یعنی اللّٰہ اکبر والعزۃ للعرب۔۔۔۔ حالانکہ مسلمان تو بنا ہی ایسے خمیر سے ہے کہ وہ صرف فی سبیل اللّٰہ ہی لڑنے اور مرنے کے لیے تیار ہو سکتا ہے۔ فی سبیل العرب [عرب کے لیے] مر جانے کا جذبہ وہ کہاں سے لاتا' جب کہ اس کو یہ معلوم تھا کہ جو وطن کے لیے مرا وہ جاہلیت کی موت مرا۔

قوم پرستی کا مذہب صدر ناصر کو اتنا عزیز ہوا کہ اس کی خاطر انھوں نے فرعونی تہذیب کو دوبارہ زندہ کیا۔ اس کی تصویریں نوٹوں اور ٹکٹوں پر چھاپیں' اس کے مجسمے بازاروں میں لگائے اور اس بات پر فخر کیا: ''ہم فرعون کی اولاد ہیں''۔ حد یہ ہے کہ ہوسمبل کے بتوں کے نیچے قرآن کے نسخے دفن کیے۔ اس جسارت کے بعد کیا مشیت ایزدی صرف اس لیے جدید فرعونیت کی تائید کرتی کہ بدقسمتی سے وہ اُمت محمدیہ میں پیدا ہو گئی ہے!

مصلحین کا خون

معصوموں کا خون بہانے میں وہ اس حد تک نکل گئے کہ اپنی قوم کے مصلحین اور مجاہدین تک کو بے دریغ پھانسی پر چڑھا دیا۔ اخوان المسلمون جس ظلم و ستم کا نشانہ بنائے گئے ہیں' اس ظلم کو زبان بیان نہیں کر سکتی اور آنکھ نم ہوئے بغیر سنا نہیں جا سکتا۔ ان کا جرم صرف یہ تھا کہ وہ قرآن کی طرف دعوت دے رہے تھے اور عرب قومیت اور سوشلزم کے بجائے اسلام پر چلنا چاہتے تھے حالانکہ یہ وہی اخوان تھے جنھوں نے ۱۹۴۸ء میں خاک و خون میں لوٹ کر اور اپنی جانیں قربان کر کے بغیر' کسی حکومت کی پشت پناہی کے اسی اسرائیل کو اسی صحرائے سینا اور

بیت المقدس میں آگے بڑھنے سے روک دیا تھا۔

مسلم مفادات کے دشمن

مسلمانوں کے مفادات کے حوالے سے تو عرب قوم پرستی کے علم بردار جمال عبدالناصر کی دردمندی کا یہ عالم ملاحظہ ہو:

- یمن میں اپنی فوجوں اور گیس بموں سے ایک لاکھ مسلمانوں کو شہید کر دیا' اور اپنی معیشت تباہ کر ڈالی۔ جس مسلمان حکمران سے مخالفت ہوگئی' اس کو قتل کر دینے کے لیے سازشیں شروع کر دیں۔
- سائپرس میں جب ترک مسلمان عورتوں اور بچوں کا قتلِ عام ہو رہا تھا تو جمال ناصر نے ترکی کے مقابلے میں عیسائیوں کی مدد پر اپنے وہی راکٹ برسانے کے وعدے کیے جو یہودیوں کے مقابلے میں فائر نہ ہو سکے۔
- حبشہ [ایتھوپیا] میں حکمران [بادشاہ ہیل سلاسی۔ م: ۱۹۷۵ء] نے بڑے پیمانے پر مسلمانوں کا خون بہایا اور ان کو جبراً عیسائی بنایا' اس سفاک حکمران سے جمال ناصر کی گہری دوستی [رہی] ہے۔
- کشمیر کے مسئلہ پر پاکستان کے خلاف ووٹ اشتراکی روس کے علاوہ مصر نے ہی دیا تھا۔ پھر جب [ستمبر ۱۹۶۵ء] بھارت نے پاکستان پر حملہ کیا تو ان کی زبان سے ایک لفظ بھارت کی مذمت میں نہ نکلا۔ حد یہ کہ کاسابلانکا (مراکش) میں منعقد ہونے والی عرب سربراہی کانفرنس کے دوران یہی صدر ناصر وہ واحد عرب سربراہ تھے' جنھوں نے پاکستان کی حمایت میں پیش کردہ قرارداد کی مخالفت کی۔ صدر ناصر کی نظر میں عرب سوشلسٹ ممالک کا اتحاد تو ہر صورت میں جائز تھا' لیکن مسلمان ممالک کا اتحاد بالکل ناجائز۔

خدا سے اپنے بندھن توڑ ڈالنے' خدا کی مخالف قوموں کے سے کام سیکھنے' معصوموں کا خون بہانے' (نعوذ باللہ) کلامِ الٰہی کو حقیر جاننے کے بعد' اگر یہ بد کرداری پہلے بنی اسرائیل پر دیوار کی طرح گری تھی تو اب ہمارے اُوپر کیوں نہ گرے ــــــ اگر ان پر خدا کا قہر بھڑکا اور ان کے دشمن ان پر حکمران ہو گئے تو ہمارے اُوپر قہرِ الٰہی کیوں نہ بھڑکے اور ہم پر ہمارے دشمن کیوں نہ مسلط ہوں۔

ہم نے مصر کا تذکرہ اس لیے تفصیل سے نہیں بیان کیا کہ ان جرائم کا ارتکاب صرف وہیں پر ہوا ہے۔ آپ کسی بھی مسلمان ملک کو اٹھا کر دیکھ لیجیے۔ اس پیمانے پر نہ سہی لیکن کم و بیش یہی داستان ہر جگہ دہرائی جا رہی ہے۔ ہر جگہ: پاکستان' تیونس' الجیریا' انڈونیشیا وغیرہ میں جنگِ آزادی اسلام کے نام پر لڑی گئی' مگر ہر جگہ آزادی کے بعد عوام کو اختیارات سے بے دخل کر کے اس بات کی کوشش کی گئی کہ اسلام سے چھٹکارا حاصل کیا جائے۔ ہر جگہ اسلام کے احکام و حدود کو پامال کیا گیا۔ ہر جگہ اسلام کے علم برداروں کو ظلم و ستم کا نشانہ بنایا گیا۔ ہر جگہ وطنیت اور قوم پرستی کو پروان چڑھایا گیا اور ملکی مفادات پر عالمِ اسلام کے مفادات کو قربان کیا گیا۔

مادی و قومی معبُود

کیا یہ حقیقت نہیں کہ جتنی مسلم ریاستیں ہیں' بنی اسرائیل کی طرح اتنے ہی ان کے معبُود ہیں۔ ممکن ہے یہ معبُود پتھر کے بتوں کی صورت میں نہ موجود ہوں' لیکن ڈالر' روبل' اور پونڈ کی صورت میں بالضرور موجود ہیں۔ مسلم ممالک میں سے کسی کا قبلہ لندن' کسی کا واشنگٹن' کسی کا ماسکو اور کسی کا بیجنگ ہے' لیکن یہ بت نہ آج تک ہم کو مصیبت سے بچا سکے ہیں اور نہ آیندہ یہ ہمارے کسی کام آئیں گے۔ یہ سب جھوٹے سہارے ہیں اور کفر کا کوئی بھی ایڈیشن ہو' خواہ وہ سرمایہ داری ہو' قوم پرستی ہو' یا سوشلزم' وہ اسلام کا اور مسلمان کا حقیقی دوست ہرگز نہیں

بن سکتا۔ یہ ہماری انتہائی سادہ لوحی اور بیوقوفی ہے کہ ہم پھر انھی جھوٹے سہاروں سے امیدیں باندھ رہے ہیں اور انھی کی طرف دوڑ دوڑ کر جا رہے ہیں' حالانکہ مومن ایک سوراخ سے دوبارہ نہیں ڈسا جاتا۔

عزت کا ایک ہی راستہ

سب راستے آزمانے کے بعد اور ہر طرف سے ٹھکرائے جانے کے بعد ہم کو اچھی طرح جان لینا چاہیے' کہ ہمارے لیے عزت و سربلندی کا ایک ہی راستہ ہے اور وہ یہ کہ ہم خدا کے مخلص بندے بن جائیں۔

دنیا کی غالب قوموں اور گمراہ نظریات یعنی سرمایہ داری' قوم پرستی اور سوشلزم کو چھوڑ کر اسلام کا راستہ اختیار کریں۔ دین حق کی نصرت کے لیے کمربستہ ہو جائیں۔ خدا سے بے وفائی چھوڑ کر اس کے وفادار بنیں اور اس کے ساتھ اپنا عہد پورا کریں۔ اس نے جس کام پر ہم کو مامور کیا ہے اور جو مشن ہمارے سپرد کیا ہے' یعنی اس کی اطاعت کی دعوت اور اس کے دین کا غلبہ' اس کو پورا کرنے کے لیے تن' من' دھن سے لگ جائیں۔

اگر ہم اللہ کی مدد کریں گے تو اللہ ہماری مدد کرے گا۔ اللہ ہماری مدد کرے گا تو دنیا کی کوئی طاقت ہمارے اُوپر غالب نہیں آسکتی۔ یہ اس کا وعدہ ہے جو خدا کی قسم' غلط نہیں ہو سکتا۔ اس نے اپنی قوم کو کہیں ذلیل نہیں کیا جب تک وہ اس کی رہی اور جب اس نے دوسروں سے آشنائی کی تو اس نے اسے کبھی معاف نہیں کیا۔

یہ بات ہم کو اچھی طرح معلوم ہونا چاہیے کہ جو قوم کسی ایک راستے کے لیے یکسو نہ ہو وہ ہمیشہ دوسروں کی جھولی بلکہ قدموں میں گری رہے گی اور دنیا میں اس کا اپنا کوئی مقام نہیں ہوگا۔ اب اس کو کیا کہیے کہ مسلمان قوم کا مزاج ہی ایسا ہے کہ ان کے حکمران چاہے لاکھ دماغ سوزی کریں' وہ قوم پرستی' سوشلزم اور دنیا پرستی کے لیے یکسو نہیں ہو سکتی۔ وہ صرف اپنے دین ہی

کے لیے یکسو ہو کر بے نظیر کارنامے دکھا سکتی ہے۔

تاہم' یہ اسلام کے لیے یکسو نہ ہونے کا نتیجہ ہے کہ آج سارا عالمِ اسلام اتنی عظیم الشان آبادی اور اتنے وسیع وسائل و ذرائع کے باوجود پارہ پارہ ہے اور دوسروں کی چوکھٹ پر سجدہ ریز ہے۔ لیکن عالمِ اسلام کے اتحاد کی ہر دعوت صدا بہ صحرا ثابت ہوگی' جب تک ہر مسلمان ملک کی قیادت اخلاص سے اسلام کے راستے پر چلنا شروع نہ کر دے۔

اس معاملے میں بحیثیت پاکستانی ہماری بہت بڑی ذمہ داری ہے۔

پاکستان وہ واحد ملک ہے جو کسی نسلی یا علاقائی قومیت کے بجائے اسلام کی بنیاد پر بنا ہے اور جس نے اپنے پروردگار سے علانیہ عہد کیا ہے کہ یہاں اسلامی حکومت قائم ہوگی۔ جب تک ہمارا یہ عہد بیان کی دنیا سے نکل کر عمل کی دنیا میں پورا نہ ہوگا' اس وقت تک ہمارا پروردگار ہم سے خوش نہ ہوگا۔

آج سارا عالمِ اسلام ہماری رہنمائی کا منتظر ہے اور اس کی نگاہیں ہماری طرف لگی ہیں۔ ہمارا فرض ہے کہ ہمارا ہر جوان' مرد' عورت' بوڑھا' بچہ اس کام میں لگ جائے کہ پاکستان کو صحیح معنوں میں اسلامی مملکت بنایا جائے اور خدا کی ہر نافرمانی کو ترک کر کے اس کی اطاعت کو اختیار کیا جائے۔ اس کے بعد عالمِ اسلام بھی متحد ہو جائے گا۔ اس کے بعد ہم مشقت کی زندگی بسر کر کے اسلحہ کے کارخانے بھی بنائیں گے۔ پھر اگر ہماری تعداد کم بھی ہو اور ہمارے پاس اسلحہ نہ بھی ہو تو ہمارا ایک آدمی دس دشمنوں پر بھاری ہوگا۔

آیئے! اللہ سے تعلّق جوڑیے۔

آیئے! ہم میں سے ہر آدمی اس تازیانۂ عبرت سے سبق حاصل کر کے اپنے خدا سے اپنا تعلق جوڑے' اس کی اطاعت کا عہد کرے اور اس کے دین کی سربلندی کے لیے میدان میں نکل کھڑا ہو۔ [جون ۱۹۶۷ء]

❑❑❑

اندلس تا فلسطین ۔ عبرت کا سفر

۳۰ اکتوبر ۱۹۹۱ء کو' اسپین (اندلس) کی سرزمین پر' میڈرڈ کے مقام پر' امریکا کی نیوورلڈ ڈپلومیسی' بالآخر اس بات میں کامیاب ہوگئی' کہ اس نے عرب مسلمان ممالک کو اسرائیل کی ناجائز یہودی ریاست کے سامنے گھٹنے ٹیک کر 'معاہدۂ امن' کی بات چیت شروع کرنے پر مجبور کر دیا۔ اس طرح امریکا (اور روس' جس کا الگ سے نام لینا اب اس لیے ضروری نہیں کہ وہ امریکا کا تابع مہمل ضمیمہ بن کر رہ گیا ہے) کی بلائی ہوئی نام نہاد 'مشرق وسطیٰ امن کانفرنس' کا انعقاد ہوا۔

اس حادثے سے ٹھیک ۵۰۰ سال پہلے' ۲۵ نومبر ۱۴۹۱ء کو' اسپین کی اسی سرزمین پر ایسا ہی المیہ رونما ہو چکا ہے۔ میڈرڈ سے تقریباً تین سو کلومیٹر جنوب میں' غرناطہ کے مقام پر اسپین کی آخری عرب مسلمان ریاست کے حکمران' ابوعبداللہ محمد [غرناطہ میں آخری مسلم منتظم' م: ۳ جنوری ۱۴۹۲ء] نے' ناکہ بندی' فاقہ مستی' احسان مندی اور خوف و طمع کے ہاتھوں مجبور ہو کر' اسپین کی عیسائی ریاست کے حکمران' شاہ فرڈی نینڈ چہارم [۱۴۵۲ء-۱۵۱۶ء] اور ملکہ ازابیلا [۱۴۵۱ء-۱۵۰۴ء] اور ان کی فوجوں کے سامنے گھٹنے ٹیک دیے اور 'حصولِ امن' کے نام پر ہتھیار ڈالنے کے معاہدے پر دستخط کر دیے۔ اس صلح نامہ کے تحت ابوعبداللہ محمد نے یہ وعدہ کیا

تھا کہ ساٹھ روز کے اندر وہ غرناطہ شہر الحمرا کا قلعہ اور تمام سامانِ جنگ عیسائیوں کے حوالے کر دے گا۔

اس صلح نامہ کے لیے جو اسپین میں اسلام اور مسلمانوں کے لیے پروانۂ موت تھا' ساری بات چیت ابوعبداللہ محمد اور اس کے وزرا نے بالکل خفیہ اور عامۃ المسلمین کو بالکل بے خبر رکھ کر کی۔ کیونکہ تمام مسلمان' مہینوں سے ناکہ بندی اور فاقہ کشی' تعداد کی قلت اور اسلحہ کے فقدان کے باوجود' طارق بن زیاد کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے اپنی جانیں نثار کرنے اور جہاد کرنے کے لیے آمادہ تھے۔ لیکن یہ وزیروں اور نوابوں کی مجلس تھی' جس میں شہر کے علما و شیوخ بھی موجود تھے' جس نے تقریباً یک زبان ہو کر کہا:

عیسائی ریاست سے صلح کر لی جائے' اس لیے کہ اگر ہم جنگ ہار گئے تو عیسائی ایک مسلمان کو بھی زندہ نہ چھوڑیں گے۔

ایک طرف ابوعبداللہ محمد نے اپنے وزیر ابوالقاسم عبدالملک کو خفیہ طور پر فرڈی نینڈ کے پاس بھیجا' جو رات کو قلعہ سے باہر جا کر عیسائیوں سے ملاقات کرتا' اور صلح نامہ کی شرائط طے کیا کرتا تھا۔ دوسری طرف شہر کے اندر عیسائی امرا' دوستی کے پردے میں خواص و عوام میں رشتوں کا جال بچھا کر ان کو اندر سے کھوکھلا کر رہے تھے۔

صلح کا پردہ' موت کا جال

اس صلح نامہ کے ساتھ ساتھ' جس میں غرناطہ کے عام مسلمانوں کو مستقبل میں امن و تحفظ کی ضمانت دی گئی تھی' ایک اور معاہدہ بھی ترتیب دیا گیا۔ اس میں ابوعبداللہ محمد کے لیے خصوصی مراعات کی ضمانت دی گئی تھی۔ جب عام مسلمانوں اور فوج کو اس صلح نامہ کی تباہ کن اور ذلت آمیز شرائط کا علم ہوا' تو وہ اس کے خلاف ہو گئے۔ ابوعبداللہ محمد نے گھبرا کر' کہ کہیں عوام بغاوت پر نہ اتر آئیں اور بنا بنایا کام نہ بگاڑ دیں' ساٹھ روز پورے ہونے سے پہلے ہی فرڈی نینڈ کو

پیغام بھیج دیا کہ: 'عیسائی قصر الحمرا اور غرناطہ پر فوراً قبضہ کر لیں'۔

۲ جنوری ۱۴۹۲ء کو ایک طرف عیسائی فوجیں غرناطہ میں داخل ہوئیں تو دوسری جانب اسپین میں آخری مسلمان حکمران' ابوعبداللہ محمد' اور اس کے اہل خاندان اور ساتھی' زرق برق ریشمی کپڑوں میں ملبوس اور ہیرے جواہرات سے لدے پھندے' قصر الحمرا سے برآمد ہوئے۔ فاتح غرناطہ کو داخل ہوتے دیکھ کر ابوعبداللہ محمد گھوڑے سے نیچے اتر پڑا' اس کے گھوڑے کی باگیں تھام لیں' شہر کی چابیاں نہایت عجز و نیاز سے اس کے حوالے کیں' اور عرض کیا:

> یہ کنجیاں اسپین میں عربوں کے اقتدار کی آخری نشانی ہیں۔ آپ انھیں لے لیجیے' کیونکہ اللہ تعالیٰ کی مشیت کے مطابق ہمارا ملک' ہمارے مال اور ہماری جانیں سب آپ کی ملکیت ہیں۔ امید ہے کہ آپ نے جیسا وعدہ کیا ہے اسی کے مطابق معاملہ کریں گے''۔ فرڈی عینڈ نے ابوعبداللہ محمد کو یقین دلایا کہ ''مسلمانوں سے جو وعدے کیے گئے ہیں' انھیں پورا کیا جائے گا۔[1]

الحمرا کے بلند ترین برج پر چاندی کی صلیب آویزاں کر دی گئی' اور اسپین سے اسلام اور مسلمانوں کا ۷۸۱ سالہ پرانا نام و نشان مٹانے کا عمل شروع ہو گیا۔ 'عہد نامہ امن' میں مسلمانوں کو ان کے جان و مال اور دین و ایمان کی سلامتی و تحفظ کی جو ضمانتیں دی گئی تھیں' وہ اپنی جگہ کاغذ پر بڑی خوش کن تھیں ـــــ مثلاً یہ کہ:

> ○ کسی مسلمان کے جان و مال کو کوئی نقصان نہ پہنچایا جائے گا ○ مسلمانوں کو اپنے مذہب پر چلنے' اپنا لباس پہننے' اپنی زبان بولنے' اپنی رسوم منانے' اپنے معاملات شریعت کے مطابق طے کرنے کی پوری آزادی ہوگی ○ مساجد اور اوقاف برقرار رہیں گے ○ تین سال تک کوئی ٹیکس نہیں لیا جائے گا' اور اس کے بعد بھی کوئی

۱- احسان الحق: مسلمان یورپ میں' ص ۲۹۳

نیا ٹیکس نہیں لگایا جائے گا---

اتنے دل خوش کن وعدے' حیرت ہوتی ہے' یہ کیسے یقین کرلیا گیا کہ ان کو پورا کیا جائے گا۔ مگر دشمنوں سے امیدوں اور ان پر اعتماد کے سوراخ سے مسلمان کتنی ہی بار ڈسے گئے ہیں۔

تباہی کی منزل

عیسائی حکمرانوں کی یہ نیت بالکل نہ تھی کہ وہ کوئی بھی وعدہ پورا کریں گے' خواہ وہ ابوعبداللہ محمد جیسے یار وفادار ہی سے کیوں نہ ہو۔ اس سے البشرات کے علاقے کی حکومت کا وعدہ تھا' لیکن جلد ہی اس کو مراکش جلاوطن کر دیا گیا۔ مسلمانوں کو عیسائی بنانے یا نیست و نابود کرنے کے لیے ہر قسم کے ظلم و جور کا دروازہ کھول دیا گیا۔ جلد ہی ۱۴۹۹ء میں ان تمام مسلمانوں کو جو عیسائیت قبول کرنے کے لیے تیار نہ تھے' اسپین سے نکل جانے کا حکم دیا گیا۔ ۱۵۰۲ء میں ایسے تمام مسلمانوں کے قتل کا فرمان جاری کر دیا گیا۔ اس طرح ان مسلمانوں کے علاوہ جو اپنی جان کے خوف سے عیسائی بن گئے تھے' باقی سارے مسلمان زندہ جلا دیے گئے' یا قتل کر دیے گئے' یا اسپین سے نکال دیے گئے۔ بظاہر عیسائی بن جانے والوں کے جسم اور ذہن سے اسلامی اثرات کھرچ دینے کے لیے ۱۵۲۶ء میں شاہی فرمان کے ذریعے عربی زبان بولنا' اسلامی رسوم و رواج اپنانا' اسلامی نام رکھنا' یہاں تک کہ غسل کرنا بھی جرم قرار دے دیا گیا۔ تمام عربی کتابیں جلا دی گئیں' حمام مسمار کر دیے گئے اور مساجد کو گرجا گھر بنا لیا گیا۔

۱۴۹۱ء میں غرناطہ کے 'عہد نامہ امن' کے چند سال بعد' قسم کھانے کو خدا اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا نام لینے والا ایک مسلمان بھی اس اسپین کی سرزمین میں باقی نہ رہا' جہاں مسلمانوں نے ۷۸۱ سال حکومت کی تھی:

کتنے ہی باغ اور چشمے اور کھیت اور شاندار محل تھے جو وہ چھوڑ گئے۔ کتنے ہی عیش کے سروسامان' جن میں وہ مزے کر رہے تھے' ان کے پیچھے دھرے رہ گئے۔ یہ ہوا

ان کا انجام' اور ہم نے دوسروں کو ان چیزوں کا وارث بنا دیا۔ پھر نہ آسمان ان پر رویا نہ زمین' اور ذرا سی مہلت بھی ان کو نہ دی گئی۔ (الدخان ۴۴:۲۵-۲۹)

پانچ صدیاں' ایک سا کردار

۱۹۹۱ء میں 'مشرق وسطیٰ امن' کے نام پر ہونے والی کانفرنس اسپین ہی میں کیوں رکھی گئی؟ یہ ایک اہم سوال ہے۔

اس سوال کا قطعی جواب مشکل ہے۔ توجیہات بے شمار ہوسکتی ہیں' لیکن کیا یہ سوچنا بالکل بعید از قیاس ہوگا' کہ کانفرنس منعقد کرنے والوں کے ذہن ونفسیات میں اسپین کا انتخاب کرتے وقت اسپین میں اسلام اور عرب مسلمانوں کا نام ونشان مٹانے کی ۵۰۰ سالہ برسی' اور عرب مسلمان حکومتوں اور مغربی حکمرانوں کی پروردہ یہودی ریاست اسرائیل کے درمیان امن وصلح کی بات چیت کے آغاز کے درمیان کوئی نہ کوئی تعلّق ضرور رہا ہوگا' خصوصاً مغرب کے اس کلچر سے تعلّق رکھنے والوں کے ذہن میں' جہاں ہر فرد کی ہر سالگرہ بڑے اہتمام سے منائی جاتی ہے۔ اس پس منظر میں:

- کیا عرب مسلمان شرکا کو انجام سے متنبہ کرنا مقصود تھا؟
- یا' ان پر نفسیاتی دباؤ ڈالنا پیش نظر تھا؟
- یا' یہ امن وصلح کی بات چیت انتقام کے اسی سلسلہ کی ایک کڑی تھا' جس کی ایک کڑی ''سقوطِ غرناطہ'' تھا؟
- یا' یہ صرف اپنے تحت الشعور کی نفسیاتی تسکین کا سامان تھا؟

میڈرڈ کانفرنس کے مقاصد

جواب جو کچھ بھی ہو' یہ سمجھنے کے لیے کہ 'میڈرڈ کانفرنس' سے امریکا کیا حاصل کرنا چاہتا

تھا، ہمیں امریکا، اسرائیل، فلسطین کے اس مثلث کے تاریخی پس منظر کی نقاب کشائی کرنا ہوگی۔ پوری بات تو شاید اسی وقت کھل کر سامنے آسکے، جب ''مغرب اور اسلام کے تعلقات'' کی طویل تاریخ کی گرہیں کھولی جائیں، لیکن اس طرح بات بہت پھیل جائے گی۔

مغرب اور اسلام کے تعلّق کی تاریخ ہو، یا امریکا اور مغربی طاقتوں کی طرف سے اسرائیل کے قیام و بقا، اس کے تمام ناجائز عزائم و اقدامات کی مکمل اور غیر مشروط تائید۔ ہر مرحلہ پر اس کی بھرپور عسکری، مالی، اخلاقی اعانت، اور پروپیگنڈا کے زور پر پشت پناہی کی تاریخ۔ جو اس سے واقف ہو، اسے اس بات میں ذرہ برابر بھی شبہہ نہیں ہوسکتا، کہ امریکا کو مشرق وسطیٰ میں امن کے قیام سے کوئی دلچسپی نہیں۔ سوائے ایسے امن کے، اور اس حد تک امن کے، کہ جس سے اس کے اور مجموعی طور پر مغرب کے عزائم پورے ہوتے ہوں اور ان کے مفادات کا تحفظ ہوتا ہو۔

اس کے پیش نظر حق و انصاف کی بنیاد پر وہاں کے مسائل حل کرنا کبھی نہیں رہا ہے۔ مغرب، جس کی قیادت و سیادت دوسری جنگ عظیم [۴۵-۱۹۳۹ء] کے وقت سے امریکا کے پاس ہے، کے نزدیک مشرق وسطیٰ میں مسلمان مرد، عورتیں اور بچے نہیں بستے، بلکہ وہاں اس تہذیب اور دین کے وارث اور ماننے والے بستے ہیں، جس کے ماننے والے ایک ہزار سال تک مغرب (عیسائیت اور یہودیت) کے لیے سب سے سنگین مسئلہ اور خطرہ بنے رہے۔ ہاں، البتہ آج وہاں سے تیل پھوٹتا ہے جو مغرب میں خوش حالی کے چراغ جلائے رکھنے کے لیے ناگزیر ہے۔

مغربی حکمت عملی اور فلسطین

پہلی جنگِ عظیم [۱۸-۱۹۱۴ء] کے دوران میں جوں ہی مغرب کو اپنی فکر اور اپنے نظامِ کار کے کھوکھلے پن کا احساس ہوا، اور اس کے مسلسل ترقی کے خواب بکھر گئے، تو اس نے

اپنی تاریخ کے سب سے سنگین مسئلے' یعنی اسلام سے نبٹنا اور اس کے حل کی تدابیر اختیار کرنا شروع کر دیں' تاکہ وہ دوبارہ سر نہ اٹھا سکے۔

ایک طرف عربوں اور ترکوں کو لڑا کر خلافتِ عثمانیہ [۱۲۹۹ء-۱۹۲۴ء] کو پارہ پارہ کرنے کا اہتمام کیا گیا۔ دوسری طرف مشرق وسطیٰ پر اپنا تسلط جما کر' اس کو ایسی چھوٹی چھوٹی کمزور ریاستوں میں بانٹ دیا' جو کبھی اپنے دفاع کے قابل نہ ہوسکیں۔ وہاں اپنے تابع دار اور باج گزار حکمران بٹھائے اور قوم پرستی کا فسوں پھونکا۔ ان کو ہمیشہ کے لیے باہم برسرِ پیکار رہنے کا سامان فراہم کیا اور اس بات کا انتظام کیا کہ وہ کبھی بھی سر نہ اٹھا سکیں' نہ کبھی مغرب کے تسلط سے آزاد ہوسکیں۔

تیسری طرف' یہ اندازہ کر کے کہ: بدلتے ہوئے حالات میں دُور دراز ممالک پر براہ راست سیاسی و عسکری تسلط نہ ممکن ہوگا' نہ اس کے اخراجات قابلِ برداشت۔ خود مشرق وسطیٰ ہی میں' فلسطین میں اسرائیل کی ایک ایسی ریاست قائم کرنے کا فیصلہ کیا گیا' جو وہاں کی سب سے بڑی' غالب عسکری اور اقتصادی طاقت ہو اور مغرب کے مفادات کا تحفظ کر سکے۔ گویا اب صلیبی سورما بھیجنے کی ضرورت نہ پڑے' بلکہ یہودی ریاست ان کے حصے کا کام کرے۔

اتنے 'اہم تہذیبی مقاصد' کی تکمیل کی راہ میں خود فلسطین میں بسنے والوں کا مقام اور اہمیت ان ریڈ انڈینوں [سرخ ہندیوں] سے زیادہ نہ ہوسکتی تھی' نہ ہے' جو امریکا میں بستے ہیں۔ چنانچہ لارڈ آرتھر جے بالفور [برطانوی وزیر اعظم: ۰۵-۱۹۰۲ء' اور بعدازاں وزیر خارجہ] جس نے ۱۹۱۷ء میں فلسطین میں اسرائیلی ریاست کے قیام کے منصوبے کا اعلان کیا تھا' ۱۹۱۹ء میں ہی اپنے ایک میمورنڈم میں لکھا:

> ہم فلسطین میں وہاں کے باشندوں کی رائے معلوم کرنے کی کسی ظاہری کوشش میں پڑنے کا بھی کوئی ارادہ نہیں رکھتے...... چار بڑی طاقتوں (یعنی برطانیہ' فرانس' روس اور امریکا) کی وابستگی صیہونیت کے ساتھ بالکل مکمل ہے۔ اس لیے کہ صیہونیت'

حق ہو یا باطل اور اچھی ہو یا بری' یہ ماضی کی ایسی قدیم روایات پر قائم ہے' اور اس پر عصرِ حاضر کے ایسے تقاضوں اور مستقبل کی ایسی امیدوں کا انحصار ہے' جو اس بات سے کہیں زیادہ وقیع اور اہم ہیں' کہ اس قدیم سرزمین میں بسنے والے سات لاکھ عرب کیا چاہتے ہیں اور کیا سوچتے ہیں۔

اگر مغربی طاقتیں اپنے مفادات کی خاطر فلسطینیوں کے حال اور مستقبل کو بالکل نظرانداز کرسکتی ہیں' تو ان کے حلیف یہودی' فلسطینیوں کے وجود ہی سے انکاری ہیں۔ اسرائیلی وزیراعظم' [۷۴-۱۹۶۹ء] گولڈامیئر [م: ۱۹۷۸ء] کے الفاظ میں: ''ایسا نہیں ہوا کہ وہاں ایک فلسطینی قوم بستی تھی...... ہم آئے اور ہم نے ان کو نکال کر باہر پھینک دیا ـــــ نہیں' ان کا کوئی وجود ہی نہ تھا''۔

فلسطینیوں کے وجود کو اہمیت دینے یا ان کو تسلیم کرنے کا منطقی نتیجہ ایک فلسطینی ریاست کا قیام ہے' اسرائیل کی تباہی نہیں۔ مگر مکمل اقتدار اعلیٰ کی حامل ایک فلسطینی ریاست نہ مغربی طاقتوں کے لیے قابلِ قبول ہے' اور نہ اسرائیل کے لیے۔ اس لیے کہ ایسی ریاست ان طویل المیعاد مقاصد کی راہ میں رکاوٹ ہے جو اسرائیل مغرب کی خاطر' مغرب کی شہ پر' اور مغرب کی مکمل پشت پناہی سے' حاصل کرنے میں مسلسل لگا ہوا ہے۔ ان مقاصد کی واضح نشان دہی' اسرائیل کے قیام سے پہلے ہی' امریکی جائنٹ چیفس آف اسٹاف کی ایک ٹاپ سیکرٹ (انتہائی خفیہ) رپورٹ (نمبر ۱۶۸۴/۱۱' مورخہ ۳۱ مارچ ۱۹۴۸ء) میں کر دی گئی تھی۔ یہ مقاصد محض اسرائیل کے نہیں' بلکہ مغرب کے بھی ہیں:

۱- ابتدا میں فلسطین کے ایک حصے پر یہودی اقتدار'

۲- پھر' فلسطین میں یہودیوں کا غیرمحدود داخلہ (جو اب تک جاری ہے)'

۳- پھر' پورے فلسطین پر یہودی اقتدار کی توسیع'

۴- پھر' اُردن' لبنان' شام (بلکہ اس سے بھی آگے) ''ارضِ اسرائیل'' کی توسیع'

۵- پھر پورے شرق اوسط پر اسرائیل کا فوجی اور معاشی تسلط۔

امریکی جائنٹ چیفس آف سٹاف کے الفاظ میں: ''اس پروگرام کے سارے مرحلے یہودی لیڈروں کے نزدیک یکساں طور پر مقدس ہیں'' (اور امریکا و مغرب کے لیے یکساں طور پر اہم)۔

اسی لیے امریکا اور اسرائیل 'تنظیم آزادیِ فلسطین [پی ایل او۔ آزادیِ فلسطین کے سرگرم مختلف حریت پسند گروپوں کا وفاق' تاسیس: ۱۹۶۴ء] کا وجود تسلیم کرنے یا اس سے کسی قسم کی بات چیت کرنے سے بالکل انکاری رہے ہیں۔ ایک اسرائیلی کے الفاظ میں:

یہ بالکل صحیح ہے کہ ایک گروہ جس سے ہم ہرگز بات چیت نہیں کریں گے' وہ پی ایل او ہے۔ وجہ یہ نہیں کہ یہ شرپسند لوگ ہیں' اصل رکاوٹ ان کے ایجنڈے کا موضوع ہے۔ یہ موضوع مغربی حصے میں فلسطینی ریاست کے قیام کے علاوہ اور کیا ہو سکتا ہے؟ یہ ایسی چیز ہے' جو ہم ہرگز نہیں مان سکتے۔[۲]

یہ سب تو فسانے ہیں' جو بڑی مہارت' چابک دستی اور فن کاری کے ساتھ گھڑ کر دنیا بھر میں پھیلائے گئے ہیں' جو مسلسل جھوٹ کی طرح دہرائے گئے ہیں' اور اہلِ مغرب کو باور کرائے گئے ہیں کہ: فلسطینی تو خود ہی فلسطین چھوڑ کر چلے گئے' عرب بشمول ''تحریک آزادیِ فلسطین'' اسرائیل کا نام و نشان مٹانے کے درپے ہیں' مسلسل اس کے خلاف جنگ برپا کیے ہوئے ہیں' اسرائیل یکے بعد دیگرے اپنی بقا کی جنگیں لڑتا رہا ہے' اور ''تحریک آزادیِ فلسطین'' ایک دہشت گرد گروہ سے زیادہ کچھ نہیں۔

اسرائیلی دہشت گردی اور فلسطین

حقیقت اس کے بالکل برعکس ہے۔

۲- ڈیوڈ کر یوائن: ہفت روزہ اکانومسٹ' لندن' ۱۰ جولائی ۱۹۸۳ء

بن گوریان [م:۱۹۷۳ء]' مناخم بیگن [م:۱۹۹۲ء] اور شامیر (یہ تینوں افراد بعد میں اسرائیلی وزیراعظم بھی بنے) جیسے دہشت گردوں کی سرکردگی میں دہشت گردی' نہتے' بے گناہ اور پُرامن شہریوں کے خلاف جنگ' ان کے قتل عام اور تعذیب جیسے ہتھکنڈوں کے ذریعے فلسطینیوں کو گھروں سے نکال کر باہر پھینکا گیا۔ عربوں کی طرف سے امن اور صلح کی ہر پیش کش کو اسرائیل نے اپنے وجود کے لیے جنگ سے زیادہ بڑا 'خطرہ' سمجھا۔ ہر جنگ کا سامان اسرائیل نے خود کیا' اور ہر جنگ اپنی 'بقا' کے لیے نہیں' بلکہ اپنی 'توسیع' کے لیے لڑی ہے۔ اسرائیل کے ہر 'جرم' پر امریکا نے اس کو مزید اسلحہ اور ڈالر فراہم کر کے' اور اس کے خلاف سلامتی کونسل کی قراردادوں کو ویٹو کر کے' اس کی پیٹھ ٹھونکی ہے۔

اسرائیل کی دہشت گردی' اور امریکا کی طرف سے اس دہشت گردی کی مکمل پشت پناہی کی داستان بیان کرنے کے لیے تو کئی کتابیں بھی ناکافی ہوں گی۔ فلسطینی شہریوں کے خلاف جنگ اور دہشت گردی کا آغاز ۵ جنوری ۱۹۴۸ء کو بیت المقدس کے عرب علاقے میں واقع سیمی رامیس ہوٹل کو ۱۷۵ پونڈ ڈائنامائٹ سے اڑا کر کیا گیا۔ فلسطینیوں کو خوف زدہ کرنے کے علاوہ اس کارروائی کا کوئی اور مقصد نہیں ہوسکتا تھا۔

۹ اپریل ۱۹۴۸ء کو' یعنی ۱۴ مئی کے قیام اسرائیل کے اعلان سے بھی بیش تر' یہودی دہشت گرد تنظیموں ارگون (Irgun)' ہیرٹ (Herut) اور اسٹرن (Stern) کے ۱۰۰ مسلح جوان بیت المقدس کے مضافات میں ایک چھوٹے سے عرب گاؤں' دیریاسین پر حملہ آور ہوگئے' اور ڈھائی سو نہتے بچوں' عورتوں اور مردوں کو ان کے گھروں میں ڈائنامائٹ سے اڑا دیا۔ ارگون کے کمانڈر نے اپنی کامیابی کے مژدہ کا تار ان الفاظ میں بھیجا: "ہر جگہ ـــــ اے خدا' اے خدا ـــــ تو نے فتح ہمارے لیے مقدر کر دی ہے"۔ اس طرح مئی ۱۹۴۸ء تک تین لاکھ فلسطینی اپنے گھروں سے نکال دیے گئے۔ اس کے بعد قتل و غارت کا یہ سلسلہ مسلسل جاری رہا' اور لاکھوں فلسطینیوں کا مقدر دربدر کی ٹھوکریں کھانا یا مہاجر کیمپوں میں پڑے رہنا بنتا

گیا۔ پھر [درمیانی عرصے کی خوفناک جنگوں کے علاوہ] ۱۹۸۳ء میں اسرائیل نے بیروت پر حملہ کر کے اور مہاجر کیمپوں میں قتل و غارت کا بازار گرم کر کے، فلسطینیوں کے ''ارض اسرائیل'' کی سرحدوں سے بہت دُور نکل جانے کا سامان کر دیا۔

فلسطینیوں کو نکال دینے، پورے فلسطین پر قبضہ کر لینے اور ''ارض اسرائیل'' قائم کرنے کے منصوبوں کو یہودی لیڈروں نے کبھی ڈھکا چھپا نہیں رکھا۔ یہ سب کارروائیاں اس لیے نہیں ہوئیں کہ عرب اسرائیل کو تسلیم کرنے کو تیار نہ ہوئے، یا اسرائیل سے برسرِ پیکار رہے۔ بلکہ، اس لیے ہوئیں کہ اسرائیل پورے فلسطین پر بلاشرکت غیرے قبضہ، اور پورے مشرق وسطیٰ پر اپنا تسلط قائم کرنے کے لیے معرکہ آرا ہے۔

تقسیمِ فلسطین کا منصوبہ قبول کرتے وقت ڈیوڈ بن گوریان نے واضح کر دیا تھا: ''ہم اُردن پر اپنے حق سے دست بردار نہیں ہو رہے ہیں۔ عربوں کی رضامندی سے ہو، یا دوسرے ذرائع اختیار کر کے ہم پورے ملک میں رہیں گے۔ (اگر عرب نہ مانیں) تو پھر ہمیں ان سے ایک دوسری ہی زبان میں بات کرنا پڑے گی''۔

اور منچم بیگن نے کہا: ''وطن کی تقسیم غیر قانونی ہے، یہ کبھی تسلیم نہیں کی جائے گی...... یروشلم ہمارا دارالحکومت تھا اور ہمیشہ رہے گا۔ ارض اسرائیل پوری کی پوری ہمیشہ ہمیشہ کے لیے بنی اسرائیل کو واپس مل کر رہے گی'' ـــــ اسرائیلی ملٹری انٹیلی جنس [موساد] کے ایک سابق سربراہ کے الفاظ میں: ''مستقبل میں کسی بھی جنگ کی صورت میں ہمارے پاس سات آٹھ لاکھ فلسطینیوں کو ان کے گھروں سے نکال دینے کا منصوبہ موجود ہے''۔

نام نہاد امن کانفرنس کے اہداف

اس تاریخی پس منظر میں یہ دیکھنا بالکل مشکل نہیں کہ میڈرڈ کانفرنس سے کس کو کیا حاصل ہوگا۔

جہاں تک اہلِ فلسطین کا تعلق ہے، روز نامہ گار جین لندن کے معروف تجزیہ نگار ڈیوڈ ہرسٹ کی یہ بات بالکل درست ہے کہ ''اسرائیلی وزیراعظم شامیر نے اس کانفرنس میں شرکت لیے امریکا سے جو شرائط منوالی ہیں' (یا باہم طے کرلی ہیں) وہ اس نوعیت کی ہیں کہ ان کا منطقی نتیجہ صرف ایک ایسا آخری تصفیہ ہی ہوسکتا ہے، جس میں فلسطینیوں کا بحیثیت ایک قوم کے بالکل کوئی مقام نہ ہو، ایسی قوم جس کو ایک قوم کے معروف حقوق حاصل نہ ہوں''۔ گویا کہ میڈرڈ کانفرنس اگر ایک تصفیہ تک پہنچی تو وہ اہلِ فلسطین کا بھی آخری حل (فائنل سولوشن) ہوگا۔ زیادہ سے زیادہ اگر کچھ ملے گا تو وہ میونسپلٹیاں چلانے کا اختیار ہوگا۔ یہ بھی اس لیے کہ اسرائیل اپنی حدود میں غیر یہودیوں کی ایک عظیم تعداد کی موجودگی کے دردسر سے نجات حاصل کرسکے' اور اس کے دامن پر عربوں کی اتنی بڑی تعداد کو حقوق شہریت سے محروم کر دینے کے دھبے پر پردہ پڑ جائے۔

اور شرائط کیا رکھی گئیں؟

فلسطینیوں کا کوئی وفد اس بات چیت میں شریک نہیں ہوگا۔ اگر فلسطینی شریک ہوں گے تو اُردن کے وفد کی حیثیت میں۔ اُردن کے وفد میں بھی جس فلسطینی کو اسرائیل شریک ہونے دے گا وہ بیت المقدس کا رہنے والا نہ ہوگا (کیونکہ بیت المقدس اب اسرائیل کا اٹوٹ انگ ہے۔ اگرچہ اسرائیل کے اس قبضہ کو دنیا نے' یہاں تک کہ امریکا نے بھی' ابھی تک تسلیم نہیں کیا' مگر اب اس طرح تسلیم ہوگیا)' وہ کوئی جلاوطن فلسطینی بھی نہیں ہوگا۔ اس کا کسی قسم کا تعلق فلسطین تحریکِ آزادی (PLO) سے بھی نہیں ہوگا۔ پھر شامل ہوگا کون؟ جو مغربی حصہ اور اُردن میں رہایش پذیر ہو' اور جس کا نام اسرائیل ویٹو نہ کرے۔ اس کی مثال حیدر شفیع جیسا سیکولر اشتراکی فلسطینی ہے جو غزہ میں فلسطینی پناہ گزینوں میں شیخ احمد یاسین شہید [شہادت: ۲۲ مارچ ۲۰۰۴ء] کی زیرِ قیادت ۱۹۸۷ء میں پروان چڑھنے والی اسلامی جذبوں سے سرشار انتفاضہ تحریک کا سخت مخالف ہے۔ دنیا میں گفت وشنید کی تاریخ میں شاید یہ پہلی نظیر ہے کہ

ایک فریق اس بات پر بھی ویٹو کا حق رکھتا ہو کہ دوسرے فریق کی نمایندگی کون کرے گا۔

دوسرے شرکا کے سلسلے میں بھی اسرائیل اور امریکا نے اپنے مفادات کے مطابق شرائط طے کیں۔ اقوامِ متحدہ کو بحیثیت مندوب کے شریک ہونے کی اجازت نہیں دی گئی۔ یہ بڑی عجیب بین الاقوامی کانفرنس تھی' جہاں خود اقوامِ متحدہ کو بھی پوری شرکت کی اجازت نہ ملی۔ وہی اقوامِ متحدہ جسے امریکا نے خلیجی جنگ[3] کی پوری مدت میں بطور ڈھال آگے رکھا۔ اس کانفرنس میں برطانیہ اور فرانس بھی شریک نہیں کیے گئے' حالانکہ ان کا مشرقِ وسطیٰ سے گہرا تعلق رہا ہے۔ یہ نتیجہ ہے سابق امریکی وزیرخارجہ ہنری کسنجر [۱۹۷۳-۷۶ء] کی متعین کردہ امریکا کی اس پالیسی کا' کہ یورپ اور جاپان کو مشرقِ وسطیٰ کے بارے میں بات چیت سے' بالکل باہر رکھا جائے۔ کانفرنس بلانے میں روس' امریکا کے ساتھ شریک ضرور ہوا' لیکن ایسے وقت جب اس کی طاقت بے وزن اور موقف یکسر بدل کر رہ گئے۔

درحقیقت اسے بین الاقوامی کانفرنس نہیں کہا جا سکتا۔ کانفرنس کے بعد ہر عرب ریاست براہ راست اسرائیل سے مذاکرات کرنے کی پابند قرار دی گئی۔ ایجنڈے کے بارے میں بھی شرائط طے کی گئیں۔ ''امن کے بدلے علاقے'' چھوڑ دینے کا ذکر ہے' لیکن خود اسرائیل ایک انچ زمین سے بھی دست بردار ہونے کو تیار نہیں۔ فلسطینی شریک ہوسکیں گے' لیکن فلسطینی ریاست کا کوئی ذکر نہیں۔

سیکولر قوم پرست فلسطینی جو میدانِ عمل میں سب کچھ کھو چکے تھے' وہی فلسطین کو اب باقاعدہ میز پر اسرائیل کے حوالے کرنے کے لیے کانفرنس میں آ بیٹھے کہ: (۱) اُردنی وفد میں شامل فلسطینی نمایندوں کی فہرست' امریکی وزیرخارجہ جیمز بیکر نے اسرائیل کو باقاعدہ دکھا کر

۳- ۲ اگست ۱۹۹۰ء کو صدام حسین کی قیادت میں عراق نے کویت پر اچانک قبضہ کرلیا۔ بعدازاں امریکا نے برطانیہ' سعودی عرب' مصر' شام اور کویت پر مشتمل اتحادیوں کی ڈھال میں: ۱۹۹۱ء میں ۱۷ جنوری تا ۲۸ فروری عراق پر بھرپور فضائی اور زمینی حملہ کردیا۔ اسی دوران امریکا نے سعودی عرب اور خلیجی ریاستوں میں اپنے فوجی اڈے قائم کرلیے۔

اس کی منظوری حاصل کی (۲) میڈرڈ میں ان کا استقبال علیحدہ سے کیا گیا' اور پوری ڈپلومیٹک حیثیت بھی (۳) کانفرنس میں ان کو بولنے کے لیے اتنا ہی وقت دے دیا گیا' جتنا اُردن اور اسرائیل کے وفود کو۔

جہاں تک باقی عربوں کا تعلق ہے' تو وہ عرب دنیا میں امریکا کی براہ راست فوجی مداخلت کے بعد جس ضعف اور کسمپرسی کے عالم میں ان مذاکرات میں حصّہ لے رہے ہیں' اس کے پیش نظر کچھ پانے کا تو سوال ہی نہیں' اس جوئے میں وہ سب کچھ ہار کر ہی میز پر سے اٹھیں گے۔

ذلت ورسوائی کا راستہ

امریکا اور اسرائیل اس کانفرنس سے کیا' اور کس طرح حاصل کرنا چاہتے ہیں؟

جب ایک طرف فلسطینی بہت ہی محدود اختیارات حاصل کرنے کے لیے اسرائیل کے سامنے ناک رگڑ رہے ہوں' تو تمام عرب ملک علیحدہ علیحدہ اسرائیل سے اپنی اپنی شرائط طے کرلیں۔ ان ممالک میں امریکا کے پرانے یارانِ وفادار بھی ہیں۔ جنگ خلیج میں امریکا کے ''احسان'' کے بوجھ تلے دبے ہوئے حکمران بھی ہیں۔ وہ ملک بھی ہیں جو اپنے اوپر اللہ کے بعد (بلکہ شاید اس سے بھی پہلے) زمین پر امریکا ہی کو اپنے لیے کافی سمجھتے ہیں' اور وہ بھی ہیں جو برملا اس بات کا اعلان کر چکے ہیں کہ ''اہلِ فلسطین' اسرائیل سے کوئی معاملہ کریں نہ کریں' ہم ضرور ہی کریں گے''۔ امریکا اور اسرائیل کا منصوبہ یہ ہے کہ اس طرح فلسطینی بالکل تنہا رہ جائیں گے۔ اس پس منظر میں سارے فلسطین پر اسرائیل کا قبضہ رہے گا۔ ہر متعلقہ عرب ملک اسرائیل سے الگ الگ کوئی نہ کوئی معاہدہ کرنے کے بہانے تلاش کرے گا۔ لیکن اگر کسی سے کوئی معاملہ طے نہ ہو سکا' تو جنگ خلیج کی طرح کسی اقتصادی و فوجی کارروائی سے اس کو سیدھا کرلیا جائے گا۔

اس طرح عرب ممالک جب اسرائیل سے امن کے معاہدوں میں بندھ جائیں گے تو ان کو غیر مسلح کیا جا سکے گا۔ رفتہ رفتہ ان کی معیشت کے دروازے بھی اسرائیل اور مغرب کے لیے کھول دیے جائیں گے۔ اس طرح اسرائیل، جس کو امریکا نے ہوش ربا اقتصادی اور عسکری امداد فراہم کر کے دنیا کی چوتھی بڑی فوجی طاقت بنا دیا ہے، جس کے پاس کم سے کم دو سو نیوکلیئر بم ہیں۔ جو مغرب و امریکا کے عزائم پورے کرنے کے لیے ہی بنایا گیا ہے، تاکہ سارے مشرق وسطٰی پر اپنا تسلط قائم کر لے، اس کو فوجی بالادستی بھی حاصل ہو، اور علاقہ کی معیشت پر بھی اس کا کنٹرول ہو۔

اس مقصد کی تکمیل کے لیے، دوطرفہ مذاکرات کے ساتھ ساتھ ایک علاقائی کانفرنس بھی اس منصوبہ میں شامل کی گئی ہے۔ جہاں پانی، معیشت، ماحولیات وغیرہ جیسے مسائل کے حوالے سے، کسی دوطرفہ معاہدہ سے پہلے ہی، عرب ممالک اسرائیل کے ساتھ منسلک ہو جائیں گے۔ عرب ممالک، کمزور و ضعیف، متفرق و منتشر، ایک دوسرے سے کٹے ہوئے اور ایک دوسرے کے خلاف معرکہ آرا، سیاسی طور پر اپنے ہی ملکوں کے عوام سے بیگانہ، بلکہ ان سے برسرِ پیکار، اخلاقی طور پر دیوالیہ ـــــ امریکا اور اسرائیل کے دست نگر اور باج گزار بن کر رہیں گے۔ پھر، اگر "بنیاد پرستی" سر اٹھائے گی، تو یہ مسلمان [مگر اصل میں سیکولر، اقتدار پرست اور مغرب کی طرف دار] حکومتیں خود ہی اس سے نپٹ لیں گی۔

امریکا کی ڈپلومیسی کا دائرہ کچھ مشرق وسطٰی ہی تک محدود نہیں، اگرچہ مشرق وسطٰی کے لیے اس کا منصوبہ اس ڈپلومیسی میں شہ رگ (یا کنگ پن) کی حیثیت رکھتا ہے۔ ہر مسلمان ملک جو کسی طرح بھی طاقت ور ہو، سرتابی کی مجال کرے، جہاں اسلامی تحریک احیا کے سر اٹھانے کا "خطرہ" ہو، وہ دباؤ کی زد میں ہے۔ آج یا کل، جلد یا بدیر، اس کی باری آنے والی ہے۔ اسی تناظر میں پاکستان کو بھی دیکھا جا سکتا ہے۔

پاکستان کا مقدمہ

پاکستان سے امریکا کے مطالبات بہت واضح ہیں۔ایک یہ کہ وہ اپنے نیوکلیئر پروگرام کو ترک کر دے' اور اب تک اس سمت میں جتنی پیش رفت کی ہے اس کو لپیٹ کر پیچھے دھکیل دے۔ اپنی ساری ایٹمی تنصیبات اور پروگراموں کو بین الاقوامی (یعنی امریکی) معائنے کے لیے کھول دے۔ اگر وہ ایسا نہ کرے تو اس کی ساری امداد (جو امداد سے زیادہ قرض کا جال ہے)' یہاں تک کہ طلبہ کے وظائف تک' تو بند کی ہی جا چکی ہے' دوسرے ممالک سے بھی یہی کچھ کرایا جائے گا۔تجارت کے راستے بند کیے جائیں گے۔ دنیا میں اس کو یکہ اور تنہا کر کے چھوڑا جائے گا۔ ایٹمی تنصیبات کی تباہی کے لیے' بھارت اور اسرائیل سے اچانک محدود حملے بھی کرائے جاسکتے ہیں۔یا بھارت سے جنگ بھی چھڑوائی جاسکتی ہے' تاکہ سرتابی کا مزا چکھایا جائے گا۔

دوسرے یہ کہ وہ کشمیر میں جہاد کی حمایت بالکل ترک کر دے اور مجاہدین کی ہر قسم کی امداد سے دست کش ہو جائے۔ اگر وہ ایسا نہ کرے تو اسے 'دہشت گرد' قرار دے کر اس کے خلاف مختلف النوع اقتصادی' سیاسی اور فوجی کارروائیوں کا راستہ کھول دیا جائے گا۔

تیسرے یہ کہ وہ افغانستان میں کسی اسلامی حکومت کو برسرِ اقتدار لانے کا خیال ترک کر دے۔ ویسے تو ایسی حکومت دنیا میں کہیں بھی قابلِ قبول نہیں' اور ہر جگہ مغربی تہذیب کے لیے ایک خطرہ ہے' لیکن افغانستان میں تو خاص طور پر بالکل ہی برداشت نہیں کی جاسکتی۔اس لیے کہ اس طرح ترکی' ایران' افغانستان اور وسط ایشیا کی وہ مسلمان ریاستیں جن پر روس نے قبضہ کر لیا تھا' آپس میں مل کر' مشرق وسطیٰ کے بعد' مسلمانوں کا دوسرا اہم اور زیادہ طاقت ور بلاک بن سکتے ہیں۔افغانستان کو اس وسیع' اہم اور حساس علاقے میں کلیدی مقام حاصل ہے۔ پھر' اب بچے کھچے' شکستہ و پراگندہ' روس کا تحفظ بھی امریکی نیو ورلڈ آرڈر کے ایجنڈے پر بڑی اہمیت رکھتا ہے' خصوصاً وسط ایشیا کی مسلمان ریاستوں کے آزاد اور طاقت ور ہو جانے

کے خطرے کے باعث۔ روس کے زیر تسلط بالٹک ریاستوں [لیٹویا' لتھوانیا' اسٹونیا' جنھیں اشتراکی روس نے ۱۹۴۰ء میں اپنا حصہ بنا لیا تھا' ۱۹۹۱ء میں ان] کی آزادی فوراً تسلیم کر لی گئی' دوسری ایسی ریاستوں کی آزادی پر بھی حمایت کی گئی' لیکن مسلمان ریاستوں کی آزادی کے ذکر سے ہی خطرے کے الارم بجنے لگتے ہیں۔

چوتھے' پاکستان اس علاقے میں کسی وسیع تر مسلمان بلاک کا خواب دیکھنا چھوڑ دے' اور مغرب و شمال کی طرف دیکھنے کے بجائے مشرق کی طرف دیکھے' اور بھارت کی بالادستی کے تحت زندگی بسر کرنا قبول کر لے۔ یہ کوئی غیر اہم بات نہیں ہے کہ محض ایک پاکستانی وفد کے وسط ایشیا جانے اور ثقافتی' اقتصادی اور سیاسی روابط بڑھانے کے لیے پہلا قدم اٹھانے کے ساتھ ساتھ یہ بریفنگ [نومبر ۱۹۹۱ء] اخباروں میں آ جائے کہ ''اس اقدام سے امریکا کو سخت تشویش ہے' اور وہ پاکستان اور وسط ایشیا کے درمیان روابط کے بڑھنے کو پسندیدہ نگاہوں سے نہیں دیکھتا''۔

لیبیا کی مثال

دوسرا معاملہ لیبیا کا ہے۔

لیبیا کے فوجی آمر مطلق معمر قذافی [جنھوں نے ۱۹۶۹ء میں اقتدار پر قبضہ کیا] کے استبداد یا بیرون ملک غیر قانونی اور پُرتشدد کارروائیوں کی تائید ہرگز نہیں کی جا سکتی۔ لیبیا کے اندر اور باہر' لیبیا کے باشندوں یا بے گناہ انسانوں کو ہلاک کرنے کی کارروائیوں کی یقیناً مذمت کرنا چاہیے۔ لیکن' امریکا اور دیگر مغربی طاقتوں نے دھونس اور تشدد کی جو پالیسی لیبیا کے ساتھ اختیار کر رکھی ہے' وہ بھی کوئی کم قابلِ مذمت نہیں ہے۔

لیبیا کی حکومت کی غلط کارروائیاں امریکا کو یہ جواز فراہم نہیں کرتیں کہ وہ اپنی فوجی قوت کے ساتھ اس پر چڑھ دوڑے' اور بے گناہ عورتوں اور بچوں اور مردوں کو ہلاک کرے۔

یہ کام وہ پہلے بھی کر چکا ہے۔ یہ عجیب لطیفہ ہے کہ امریکی ٹرانسپورٹ طیارے کے تو ٹکڑے ٹکڑے جمع کر کے ان پر لیبیا کا نام پڑھ لیا گیا' مگر ۱۷ ستمبر ۱۹۴۸ء کو فلسطین میں اقوام متحدہ کے نمایندے کاؤنٹ برناڈوٹ کو اسرائیلی دہشت گردوں نے' یروشلم کے یہودی علاقے میں ایک شاہراہ پر' گولی مار کر ہلاک کر دیا' خود امریکن کونسل واسن کو ۲۶ مئی ۱۹۴۸ء کو گولی ماردی گئی۔ ۱۷ اگست ۱۹۸۸ء کو بہاولپور کے نزدیک پاکستانی فضائیہ کا جہاز تباہ کر کے نہ صرف پاکستان کے صدر محمد ضیاء الحق [جولائی ۱۹۷۷ء- اگست ۱۹۸۸ء] اور پاکستان کے متعدد سینیر جنرلوں کو ہلاک کر دیا گیا' بلکہ امریکن سفیر اور فوجی اتاشی بھی ہلاک ہو گئے۔ اسرائیل رات دن نہتے فلسطینیوں کو ختم کر رہا ہے مگر ان سب کی نہ تحقیقات ہوتی ہیں' اگر ہو جائیں تو ان کے نتائج کا اعلان نہیں ہوتا۔ نہ مقدمہ چلتا ہے' نہ دہشت گرد پکڑا جاتا ہے' نہ کوئی اور کارروائی کی جاتی ہے۔

دنوں کی گردش' خون کے آنسو

۱۴۹۱ء اچانک پیش نہیں آ گیا تھا۔ نہ ۱۹۹۱ء اچانک نمودار ہو گیا۔

یہ دنیا اندھے راجا کی چوپٹ نگری نہیں ہے۔ نہ یہ کسی حادثہ اور اتفاق کی پیداوار ہے' نہ یہاں گردش لیل و نہار سے حادثے اور اتفاقات جنم لیتے ہیں۔ یہ دنیا حق پر پیدا کی گئی ہے' حق پر قائم ہے۔ یہاں آسمان سے زمین تک تدبیر اور امر اس کے ہاتھ میں ہے جو رب العالمین ہے' عالم الغیب والشہادہ ہے' عزیز و رحیم ہے اور حکیم و حمید ہے۔ اسی کی سنت یہاں کارفرما ہے: وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَبْدِيْلًا ۝ (الاحزاب ۳۳: ۶۲) ''اور تم اللہ کی سنت میں کوئی تبدیلی نہ پاؤ گے''۔ اس لیے یہ جاننا ضروری ہے کہ کل جو کچھ ہوا تھا' وہ کیوں ہوا تھا' اور آج جو کچھ ہو رہا ہے وہ کیوں ہو رہا ہے؟ قوموں کے لیے کوئی ایسا مستقبل اس طرح مقدر نہیں کہ اس سے مفر ممکن نہ ہو' جس کا ظہور پذیر ہونا ناگزیر ہو۔ ہاں' سنت اللہ سے مفر ممکن نہیں۔ جو کچھ کھویا وہ اس سنت کے تحت' جو کچھ پا سکتے ہیں' وہ بھی اسی سنت کے تحت۔

سوال پیدا ہوتا ہے کہ اسپین میں مسلمانوں کے ۷۸۱ سالہ تہذیبی تفوق اور سیاسی غلبے کا دور' حرف غلط کی طرح کیوں مٹ گیا؟

پہلا بڑا سبب' ان کا باہمی افتراق و انتشار' نزاع و جدل' اور جنگ و خوں ریزی ہے۔ عصبیت کی وجہ سے بھی' اقتدار و حکومت کے لالچ کی وجہ سے بھی' عیش و عشرت اور دولت و دنیا کی طلب و ہوس کی وجہ سے بھی۔

اسپین کے مسلمانوں میں تین گروہ تھے: ایک طرف عرب تھے' دوسری جانب بربر' اور تیسری طرف اسپینی مسلم (جو یا تو مخلوط اولاد تھے یا بالکل نومسلم' اور مولدون کہلاتے تھے)۔

خود عرب' کلبی و قیسی' یمنی و شامی وغیرہ بے شمار گروہوں میں تقسیم تھے۔ سب قبیلوں اور گروہوں کے درمیان مستقل آویزش اور کش مکش برپا رہتی تھی۔ سب کو ایک دوسرے سے سیاسی' معاشی اور تہذیبی شکایات تھیں۔ نومسلموں کو پیدائشی مسلمانوں سے' غیر عربوں کو عربوں سے' فرق و امتیاز اور استحصال کا گلہ تھا۔ جوڑ توڑ اور سازشیں بھی تھیں' کشت و خون بھی۔ چنانچہ نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمانوں نے ایک طرف فرانس کے میدانوں میں شکست کھائی' اور پیش قدمی رک گئی۔ دوسری طرف شیرازہ بار بار بندھتا اور پھر بکھرتا رہا۔ ہر افتراق و انتشار سے وہ عیسائی حکمران بھرپور فائدہ اٹھاتے جن کی ریاستیں شمال میں موجود تھیں' اور وہ عیسائی جو مسلم اسپین کے باشندے تھے۔

۷۱۱ء میں طارق بن زیاد کی فتح اسپین کے بعد سے ہی قتال و جدال کا یہ سلسلہ چھڑ گیا' اور نصف صدی تک جاری رہا۔ یمنی گورنر مارا جاتا یا معزول کیا جاتا تو قیسی آتا' وہ جاتا تو پھر دوبارہ یمنی گورنر زمامِ کار سنبھال لیتا۔ اموی دور ۱۰۳۰ء میں ختم ہوا' مگر آخری ۲۲ سال میں ۱۰ حکمران تخت پر بیٹھے۔ ان کے خاتمے کے ساتھ ہی اسپین میں کئی چھوٹی چھوٹی ریاستیں قائم ہوگئیں۔ مرابطین اور موحدین کے ادوار آئے' لیکن ان باہم برسرپیکار چھوٹی ریاستوں سے جان نہ چھوٹی۔

باہمی نفاق و افتراق اور کشت و خون سے فائدہ اٹھا کر عیسائی حکمران اپنا اقتدار مستحکم کرتے رہے۔ ایک مسلمان ریاست کو دوسری مسلمان ریاست سے لڑاتے رہے۔ کبھی ایک کی پشت پناہی کرتے' کبھی دوسرے کی۔ اس طرح ایک ایک کر کے چھوٹی چھوٹی ریاستوں کو ہڑپ کرتے رہے۔ بالآخر ۱۲۳۸ء میں صرف غرناطہ کی ایک چھوٹی سی ریاست باقی رہ گئی۔ ۱۴۹۱ء میں وہ بھی اپنے آخری انجام سے دوچار ہوگئی۔

عیسائیوں کو تو مسلمان قبیلوں اور ریاستوں کے باہمی جنگ و جدل سے فائدہ اٹھانا ہی تھا' اس پورے منظرنامے میں بڑی المناک داستان تو مسلمانوں کے خود عیسائیوں سے مدد لینے' ان کا آلہ کار بننے اور ان کے ساتھ مل کر مسلمانوں ہی کو تباہ و برباد کرنے کی داستان ہے۔ تاریخ اسی دل خراش کہانی سے بھری ہوئی ہے۔ یوسف بن تاشفین [۱۰۶۱ء-۱۱۵۷ء] کی آمد ہوئی تو مسلمان ریاستوں نے مل کر عیسائیوں کو اپنا اقتدار برقرار رکھنے کے لیے پکارا۔ اشبیلیہ کے لوگوں نے عیسائیوں کے دربار میں ایک مسلمان فوجی افسر کو لکھا: ''عیسائیوں کے بادشاہ کو ہماری فریاد سناؤ' اور اس کی مدد حاصل کر کے مرابطین کا جوا ہمارے کندھوں سے اتروا دو۔ مرابطین سے آزادی کے بعد ہم عیسائی بادشاہ کو سابق سے زیادہ خراج ادا کریں گے''۔ قرطبہ کے امرا کہتے تھے: ''بادشاہ [الفانسو] لیون [۱۲۵۲-۸۴ء] سے مل جاؤ اور حسب دستور سابق اس کو خراج دو۔ ان مرابطین سے گلوخلاصی کی جو تدبیر ہوگی وہ اچھی ہوگی''۔

سب سے زیادہ جگرخراش تو غرناطہ کے آخری ایام کی کہانی ہے۔

مولائے حسن وہ آخری حکمران تھا' جس نے عیسائیوں کو خراج دینے سے انکار کر دیا۔ جب مسلمان زندگی اور موت کی لڑائی لڑ رہے تھے تو عیسائیوں نے اس کے دونوں بیٹوں' ابوعبداللہ محمد اور یوسف سے اس کے خلاف بغاوت کروا دی۔ اگرچہ اس نے اپنے بیٹوں کو شکست دے دی' لیکن مولائے حسن کو عیسائیوں کے مقابلے سے دست کش ہونا پڑا۔ تنگ آ کر جب مولائے حسن نے حکومت اپنے بھائی الزاغل کے حوالے کر دی' تو عیسائیوں نے ابوعبداللہ

محمد کو مسلح کر کے اس [یعنی چچا] کے خلاف کھڑا کر دیا۔ الزاغل کس کس کا مقابلہ کرتا۔ ایک شہر پر ابوعبداللہ محمد کا قبضہ ہوتا' تو دوسرے پر فرڈی عینڈ کا ـــــ انجام کار' اس نے بھی اپنے بھتیجے ابوعبداللہ محمد سے بچنے کے لیے فرڈی عینڈ کے ساتھ صلح کر لی۔ مگر بالآخر الزاغل اور ابوعبداللہ دونوں ہی جلاوطن ہو کر کسمپرسی کی زندگی اور عبرت ناک موت سے دوچار ہوئے۔

اس کے ساتھ ساتھ مسلمان حکمرانوں اور امرا میں سے بے شمار عیسائیوں کے ایجنٹ تھے۔ اس وقت عیسائیوں کی تہذیبی و ذہنی غلامی کا تو کوئی سوال نہ تھا' لیکن سیم و زر کے عوض ان کے ضمیر اور زبانیں خرید لی گئی تھیں۔

مسلمان حکمران عیسائیوں سے ساز باز کرتے' عوام کو بے خبر رکھا جاتا' اور پھر ان کو بھیڑ بکری کے ریوڑ کی طرح ہانک دیا جاتا۔ علما و فقہا فتوے جاری کرتے' مگر ان کی کوئی نہ سنتا۔ مسلمان عوام پیچ و تاب کھاتے' لیکن بے بس و لاچار خاموش تماشائی بنے رہتے۔

وہی تکرار

۱۹۹۱ء نمودار ہونے کے اسباب اور آج کی صورت حال کیا ۱۴۹۱ء سے کچھ زیادہ مختلف ہے؟

عرب ترکوں کے خلاف' مصری اہلِ یمن کے خلاف' عراق کویت کے خلاف' پنجابی اور بنگالی' یہ سب مسلمان ہی ہیں جو ایک دوسرے کے خلاف معرکہ آرا ہوتے رہے ہیں' اور ہو رہے ہیں۔ مغرب کی سیکولر عیسائی قوتیں ان کو پارہ پارہ کرتی رہی ہیں' اور اپنا زیرنگیں بناتی رہی ہیں۔ میڈرڈ کانفرنس امریکا کی جنگ خلیج [۱۹۹۱ء] کے پس منظر میں شروع ہوئی۔ اس میں عرب کو عرب کے' یا صحیح معنوں میں مسلمان کو مسلمان کے خلاف لڑایا گیا۔ مغرب کے سارے ممالک نے مل کر پہلے عراق کی طاقت کا ہوا کھڑا کیا' پھر اس کو تباہ و برباد کر دیا۔ اُردن میں ''سیاہ ستمبر'' کا [۷۱-۱۹۷۰ء کے دوران اُردنی افواج کے ہاتھوں] فلسطینیوں کا قتل عام ہو'

یا لبنان میں [۱۹۷۵ء کے دوران] شام کی فوجی کارروائی' بیروت کے کیمپوں میں فلسطینیوں کا قتل عام [۱۹۸۲ء] ہو یا غزہ میں ان کی پکڑ دھکڑ' یہ مسلمان ہی ہیں جو مسلمانوں کے خلاف صف آرا ہیں۔ اگر مصر معاہدہ کیمپ ڈیوڈ [مارچ ۱۹۷۹ء- دستخط کنندگان: مصری صدر انوار السادات اور اسرائیلی وزیر اعظم مناخم بیگن] میں پہلے ہی سے فلسطینیوں کو چھوڑ چکا ہو' اور کویت و سعودی عرب برملا اعلان کریں کہ فلسطینی آئیں یا نہ آئیں' ہم تو اسرائیل سے ضرور صلح کریں گے' اس صورت حال میں فلسطینی کیوں پیچھے رہتے۔

عبرت کا راستہ

عصبیت کی پوجا' باہمی افتراق' جنگ و جدال اور غیروں کی کاسہ لیسی' یہ سب بجائے خود ایک بنیادی مرض کا نتیجہ ہیں۔ اور وہ مرض یہ ہے کہ مسلمان اُمت اپنے اصل مقصد و مدعا' اپنے مشن' بلکہ کسی قسم کے بھی مقصد و مشن سے خالی ہوگئی۔ حبل اللہ (اللہ کی رسی) چھوڑ کر' اس کو حبل الناس کے علاوہ کوئی سہارا نظر نہیں آتا۔

اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ''صرف خدائے واحد کی پرستش کرو''۔ ہم نے نسل' رنگ' قبیلے' زبان جیسے بتوں کی پوجا شروع کر دی۔ جس آگ کے گڑھے سے اس نے ہم کو نجات دی تھی' ہم جا کر سر کے بل اسی میں گر گئے۔ خالق ارض و سما کا حکم تھا: ''آپس میں جھگڑا نہ کرنا' ورنہ کمزور پڑ جاؤ گے اور تمھاری ہوا اکھڑ جائے گی''۔ ہم نے تنازعات کی جنگ چھیڑ دی۔ پھر ہم کمزور بھی پڑ گئے اور ہماری ہوا بھی اکھڑ گئی۔ اس کے آخری رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد تھا: ''دیکھو' میرے بعد کافر نہ ہو جانا کہ ایک دوسرے کی گردنیں مارنے لگو''۔ ہم نے مسلمان کو مسلمان بھائی کے بجائے اموی اور عباسی' عربی اور عجمی' عرب اور بربر' یمنی اور مصری' عرب اور ترک' پنجابی اور بنگالی' سندھی اور مہاجر' عراق اور ایران بنا کر بے دریغ ایک دوسرے کا خون بہایا۔

اس نے یہ بھی فرمایا تھا: باہمی عداوت و بغض کا پھیلنا تو اس بات کی سزا ہے کہ جو ہدایت تم کو دی گئی ہے' اور جس کی دعوت و غلبے کا مشن تمھارے سپرد کیا گیا ہے' تم اس کو فراموش کر دو ـــــ ہم نے بالکل یہی کیا' اور عیسائیوں کی طرح عداوت و بغض کا شکار ہو گئے۔ پھر ان کے لیے ہمارے شہروں کے دروازے کھل گئے' اور وہ انڈونیشیا سے لے کر مراکش تک ہر جگہ ہمارے اندر گھس کر ہمارے آقا و مالک بن گئے۔ اس نے خبردار کر دیا تھا: جو ہم سے نقض میثاق کے جرم کے مرتکب ہوتے ہیں' ہم ان کے دل سخت کر دیتے ہیں' ان پر لعنت کرتے ہیں' اور ان پر باہر کی قوموں کو چڑھا لاتے ہیں ـــــ ہم نے نقض عہد کیا' تو ہم پر اس کے یہ سارے مواعید صادق ہو گئے۔

ظلمت میں روشنی کے چراغ

بظاہر تو حالات تاریک اور مایوس کن ہیں۔ امکان یہی ہے کہ ابھی اور زیادہ تاریک تر اور مایوس کن ہی ہوں گے۔ لیکن ۱۹۹۱ء' ۱۴۹۱ء نہیں' بلکہ گھٹاٹوپ اندھیروں میں روشنی کی شعاعیں بھی چمک رہی ہیں۔

آج مسلمان عروج کے بعد زوال کی پستی میں نہیں گر رہے' بلکہ زوال کی پستی کے بعد ان میں بیداری کی ایک لہر بڑھ رہی ہے۔ ان کی بیداری کی یہ لہر ہی مغرب' امریکا اور اسرائیل میں اضطراب و بے چینی اور مسلمانوں کے خلاف اقدام یا صف بندی کا اصل باعث ہے۔ یہ لہر اب سیکولر عناصر کی رہنمائی میں مغرب کے سیاسی تسلط سے محض برائے نام آزادی کی لہر نہیں ہے۔ بیسویں صدی میں سید ابوالاعلیٰ مودودی [م: ستمبر ۱۹۷۹ء]' حسن البنا شہید [شہادت: ۱۲فروری ۱۹۴۹ء] اور ان جیسے بے شمار دیگر رہنماؤں کی جدوجہد کے نتیجے میں' آج دنیا کے چپے چپے پر مردوں اور عورتوں کی' بالخصوص نوجوانوں کی' نسلوں کی نسلیں جنم لے چکی ہیں' جو اللہ اور رسولؐ سے اپنے عہد وفا کو وفا کرنے کی سعی و جہد میں لگی ہوئی ہیں۔ امریکا کے غلبے کے

باوجود نااہل اور بیرونی تہذیب وقوت کے ایجنٹ یا پرستار حکمرانوں کے باوجود ہر مسلمان ملک میں خود ان کے حکمرانوں کی طرف سے مسلمان عوام کو ظلم و استبداد کی زنجیروں میں جکڑ کے بے بس و ناکارہ بنانے کی کوششوں کے باوجود یہ لہر بڑھتی جارہی ہے۔ اس لہر کی علامتیں بے شمار ہیں۔

اسلامی تحریکیں آگے بڑھ رہی ہیں۔ خود امریکا اور یورپ میں اسلام کی دعوت و اشاعت کا کام ہو رہا ہے۔ نئی نسلوں کی اسلام سے وابستگی میں اضافہ ہو رہا ہے۔ افغانستان میں، حوصلہ شکن نااتفاقیوں کے باوجود نہتے مجاہد ایک سپرپاور کو ہزیمت اور شکست و ریخت سے دوچار کر چکے ہیں۔ ایران کے انقلاب میں کتنی ہی خامیاں سہی، اس نے یہ ثابت کر دیا کہ اسلام میں اتنی قوت ہے کہ وہ ایک پوری قوم کو کھڑا کر دے اور بیرونی طاقتوں کے ایک زبردست مہرے کو اٹھا کر پھینک دے۔ کشمیر کے بے سروسامان اور بے سہارا مسلمان بھی جہاد کی راہ پر گامزن ہیں۔ وسط ایشیا کی ریاستوں میں مسجدیں بھرتی جارہی ہیں اور دین سے تعلّق دن رات فزوں تر ہو رہا ہے۔

ادھر، امریکا بھی معاشی طور پر کمزور ہو رہا ہے۔ اس کی بالادستی کو چیلنج کرنے والی قوتیں اٹھ رہی ہیں۔ خود امریکی اصحابِ فکر سنجیدگی کے ساتھ جاپان اور چین سے ایک جنگ کی پیشین گوئی کر رہے ہیں۔ یورپ بھی امریکا کا حریف بننے کی راہ پر آگے بڑھ رہا ہے۔ امریکا ہی واحد قوت کا مرکز ہو، یہ امکان روز بروز کم ہوتا جارہا ہے۔

مگر سنت اللہ کے تحت یہ نہیں ہوتا کہ روشن مستقبل کا پھل من وسلویٰ کی طرح خود بخود کسی قوم کی جھولی میں ٹپک جائے۔ اگر من وسلویٰ بغیر استعداد کے برسنے بھی لگے، تو مسور اور پیاز لہسن کی کشش ذلت ومسکنت کے گڑھے ہی کی طرف لے جاتی ہے۔ اس لیے بامِ عروج کا کوئی راستہ سعی وجہد کے علاوہ نہیں: وَاَنْ لَّيْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰى (النجم ۵۳:۳۹) ''انسان کے لیے کچھ نہیں ہے مگر وہ جس کی اس نے سعی کی ہے''۔ اللہ تعالیٰ کا ازلی و

ابدی قانون ہے۔

اس لیے اس بھنور سے نکلنے کے لیے اُمت مسلمہ کو ہمت کر کے کھڑا کرنا ہوگا۔ جو چیلنج درپیش ہیں ان کی نوعیت وحقیقت کا ادراک کرنا ہوگا۔ ان کا مؤثر جواب تیار کرنا ہوگا۔ یہ سمجھنا ہوگا کہ جو کچھ ہوا ہے وہ کیوں ہوا ہے' اور جو کچھ ہو رہا ہے وہ کیوں ہو رہا ہے؟ اپنے گھروں کو ٹھیک کرنا ہوگا۔ اس لیے کہ جو خود کو نہ بدلیں' ان کی حالت کبھی نہیں بدل سکتی۔ حکمت و تدبر' دلیری و جرأت اور اجتہاد و جہاد کے ذریعے اپنا راستہ بنانا ہوگا۔ اس یقین سے سرشار ہو کر اپنی حکمت عملی بنانا ہوگی' کہ ہمارے پاس ایک ایسی دعوت ہے جو کڑے سے کڑے دشمن کو بھی مسخر کر سکتی ہے۔ اتنے بڑے دشمن کا مقابلہ صرف نفرت اور گالیوں' نعروں اور مظاہروں سے نہیں کیا جا سکتا۔ یہ بھی ضروری نہیں کہ جو دشمن ہے' وہ ہمیشہ دشمن رہے گا۔ عمر فاروقؓ [شہادت: ۲۴ھ/ ۶۴۵ء] ہوں یا ہلاکو خان[4] کی اولاد' کعبہ کو صنم خانوں سے پاسبان ملتے رہے ہیں اور آج بھی مل سکتے ہیں۔

اُمت کو ایک عظیم چیلنج درپیش ہے۔ سب سے بڑھ کر یہ چیلنج ان کے لیے ہے جو اسلام کے علم بردار ہیں' جو احیائے اسلام کے داعی ہیں' اور جو اقامت دین کے دعویدار ہیں۔ کیا وہ ایمان و عمل' فکر و نظر اور اجتہاد و جہاد کے ذریعے اس چیلنج کا مقابلہ کرنے کے لیے آگے بڑھیں گے؟ [دسمبر ۱۹۹۱ء]

□□□

۴۔ منگول شہنشاہ چنگیز خاں تموجن [م: ۱۲۲۷ء] کا پوتا' جس نے ۶۵۶ھ/ ۱۲۵۸ء میں بغداد پر حملہ کر کے عباسی سلطنت کی اینٹ سے اینٹ بجا دی' اور مسلمانوں کا بڑے پیمانے پر قتل عام کیا۔ لیکن بعدازاں اسی کی اولاد میں سے لوگوں نے اسلام قبول کیا۔

اسرائیل کا ہدف

سینٹ آگسٹائن [م: ۴۳۰ء] کا مقام عیسائیوں کے ہاں وہی ہے' جو مسلمانوں میں امام غزالی [م: ۱۱۱۱ء]' امام ابن تیمیہ [م: ۱۳۲۸ء] یا حضرت شاہ ولی اللہ [م: ۱۷۶۲ء] رحمہم اللہ کا۔

سینٹ آگسٹائن ایک دلچسپ کہانی سناتے ہیں:

ایک بحری قزاق کو پکڑ کر سکندر اعظم [م: ۳۲۳ء] کے سامنے لایا گیا۔

سکندر نے اس سے پوچھا: تم سمندروں میں اتنے دھڑلے سے ڈاکا زنی کرتے پھرتے ہو؟

اس نے جواب دیا: عالی جاہ' آپ ساری دنیا میں دھڑلے سے ڈاکے مارتے پھر رہے ہیں! فرق صرف اتنا ہے کہ میں یہ کام ایک چھوٹے سے جہاز کے ذریعے کرتا ہوں' اس لیے میں ڈاکو کہلاتا ہوں۔ جہاں پناہ! یہی کام ایک عظیم فوج اور ایک بہت بڑے بحری بیڑے کے ذریعے عالمی پیمانے پر انجام دیتے ہیں' اس لیے آپ کو شہنشاہ کہا جاتا ہے۔

ملتے جلتے کردار

اپنے ہاں تو ہم برابر یہی ڈراما ہوتا دیکھتے آرہے ہیں کہ ایک جنرل فوج کے بل پر سارے ملک پر قبضہ جما لیتا ہے' کچھ اور لوگ ہیں جو دونوں ہاتھوں سے قومی خزانہ لوٹتے رہتے ہیں' ان سب کو نجات دہندہ' حکمران' وزیر اور افسر ہونے کا اعزاز و احترام بخشا جاتا ہے۔ ایک آدمی ایک کلاشنکوف لے کر ایک گھر کو لوٹ لیتا ہے' اس کو ڈاکو کا لقب دے کر اس سے نفرت کی جاتی ہے۔ لیکن بساطِ عالم پر' چھوٹے موٹے ''دہشت گردوں'' کے خلاف کارروائی کے نام پر 'شہنشاہ عالم' امریکا اور اس کے ''کارندے'' اسرائیل نے عرصے سے جو دہشت گردی مچا رکھی ہے' اس پر تو یہ کہانی بالکل ٹھیک ٹھیک صادق آتی ہے۔ اتنے فرق کے ساتھ ضرور کہ یہ چھوٹے چھوٹے ''دہشت گرد'' بھی بالعموم' شوق قزاقی میں نہیں' بلکہ تنگ آمد بجنگ آمد کے مصداق شہنشاہ کے ظلم کے خلاف ایسی کارروائیاں کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔

جو قتل و غارت گری ''شہنشاہ معظم'' یا ان کے اہالی وموالی خود کریں اور وہ بڑے پیمانے پر ہو' کتنی ہی ہولناک کیوں نہ ہو' نہ صرف ''بالکل جائز'' جوابی یا دفاعی کارروائی قرار پاتی ہے' بلکہ مستحسن بھی سمجھی جاتی ہے۔ اس کے خلاف ایک لفظ بھی منہ سے نکالنا مزاج شاہی کے لیے ناقابلِ برداشت ہوتا ہے۔ دوسرے' جیسے ریڈ انڈین' فلسطینی' مسلمان ایک پٹاخہ بھی پھینک دیں تو وہی چند لوگ نہیں بلکہ ان کا پورا ملک' عورتوں اور بچوں سمیت ان کی ساری آبادی' ان کے معاشی وسائل سامراجی حکمرانوں کے لیے سب کے سب ''حلال'' ہو جاتے ہیں۔

آج کے قزاق

اس دوغلے کردار کا تازہ ترین نمونہ وہ دہشت گردی ہے' جو لبنان میں [۱۹۹۶ء] میں اسرائیل اور امریکا نے کی ہے۔ رابرٹ فسک (Fisk) نے اس پر لکھا:

یہ تو قتل عام ہے! میں نے صابرہ اور شاتیلا (لبنان' ۱۹۸۲ء) کے بعد بے گناہوں کو

اس طرح ذبح ہوتے نہیں دیکھا ہے۔ جگہ جگہ عورتوں' بچوں اور مردوں کی لاشوں کے ڈھیر لگے ہوئے ہیں۔ کسی کے ہاتھ غائب' کسی کی ٹانگیں اور کسی کا سر۔ انھیں برباد کرنے کے لیے امریکا کے فراہم کردہ بم استعمال کیے گئے ہیں' جو زمین سے چھے میٹر اُوپر پھٹتے ہیں' زیادہ سے زیادہ ہلاکت پھیلاتے ہیں اور انسانی اعضا کو کاٹ کاٹ کر جسم سے جدا کر دیتے ہیں۔ اقوام متحدہ کے کمپاؤنڈ میں خون کی ندیاں بہہ رہی ہیں۔ ایک فرانسیسی سپاہی' ہاتھ میں تھیلا لیے' کٹے ہوئے ہاتھ' پاؤں اور انگلیاں جمع کر رہا ہے۔ شہریوں کو تو اسرائیل خوف ناک طریقے سے ذبح کر رہا ہے۔ ایک ایمبولینس کو میزائل سے تباہ کر دیا' ایک جگہ دو بہنیں' ایک جگہ ایک دو سالہ بچی' اور ایک جگہ چودہ افراد پر مشتمل ایک گھر' اسی طرح میزائلوں کا شکار ہو گئے۔[1]

رابرٹ فسک نے مزید لکھا:

یہ قانا ہے' جہاں اقوام متحدہ کے ہیڈکوارٹر کے احاطے میں' اسرائیلی ہوائی جہاز ۶۰۰ سے زائد پناہ گزینوں کو تیرہ منٹ تک بموں اور میزائلوں کا نشانہ بناتے رہے۔ اسرائیل نے فوراً کہا کہ ''یہ قتل عام غلطی سے ہو گیا۔ ہمارے خلاف راکٹ اس احاطہ کے پاس سے فائر کیا گیا تھا''۔ حالانکہ ہمیشہ یہی کہا جاتا رہا کہ یہ ایسے میزائل ہیں جو سرجن کے چاقو کی طرح ٹھیک اپنے نشانے پر بیٹھتے ہیں' غلطی کر ہی نہیں سکتے۔ مگر اقوام متحدہ نے صاف کہہ دیا کہ ''ہم نے تو دو دن قبل اسرائیل کو مطلع کر دیا تھا کہ ہمارے پاس پانچ ہزار لوگ پناہ لیے ہوئے ہیں''۔[2]

اُدھر رابرٹ فسک نے وہ ویڈیو فلم بھی حاصل کر لی' جس میں عین بم باری کے وقت اسرائیل کا نگراں طیارہ (Drone) احاطے کے اُوپر پرواز کرتے دیکھا جا سکتا ہے۔ اس ویڈیو

۱- روز نامہ انڈی پنڈنٹ' لندن' ۱۹/ اپریل ۱۹۹۶ء

۲- روز نامہ انڈی پنڈنٹ' لندن' ۴ مئی ۱۹۹۶ء

کے مطابق اسرائیل کے جھوٹ کا پول کھل گیا اور قطعاً ثابت ہوگیا کہ یہ ہلاکت دیدہ و دانستہ نشانہ باندھ کر کی گئی۔

اقوام متحدہ کی بے بسی

ویڈیو کی دریافت کے بعد اسرائیل نے اپنا بیان بدل لیا: ''ہاں' طیارہ وہاں موجود تو تھا' مگر دوسرے مقاصد کے لیے''۔ اقوام متحدہ کے ڈچ کمانڈر نے بھی اپنی خفیہ رپورٹ میں اسرائیل کو دانستہ بم باری کے لیے موردِ الزام قرار دے دیا۔ لیکن امید نہیں کہ اقوام متحدہ کے [مصری نژاد] سیکرٹری جنرل بطروس غالی [۹۶-۱۹۹۲ء] اس رپورٹ کو اقوام متحدہ کی سلامتی کونسل میں پیش کر سکیں گے۔ کیونکہ امریکا سخت خفا ہے کہ بطروس غالی نے تحقیقات کیوں کرائیں' اور کرائیں تو یہ نتیجہ کیوں نکالا کہ ''شہنشاہ'' بھی بڑے پیمانے پر وہی کام کر رہا ہے جو ڈاکو کرتا ہے۔ امریکا خفا ہو تو غالی صاحب کی نوکری خطرے میں پڑ جائے گی[۳] اس کو اصرار ہے کہ ''قانا'' کو بھلا دیا جائے' دفن کر دیا جائے اور اسرائیل تو اب اقوام متحدہ کی فوجوں کا وجود ہی لبنان سے ختم کرنے پر تلا بیٹھا ہے۔

حالات کی ستم ظریفی دیکھیے! کہنا پڑتا ہے کہ اچھا ہوا کہ قانا میں یہ قتل عام ہو گیا' ورنہ بے چارے لبنانیوں کی خیر نہ تھی۔ یہ اتنی بڑی 'غلطی' ہوگئی کہ 'شہنشاہ' نے فوراً اسرائیل کی جنگ بند کرا دینے میں ہی عافیت دیکھی۔ ورنہ دس روز سے روزانہ سیکڑوں ہوائی حملے ہو رہے تھے' دُور مار توپیں بم باری کر رہی تھیں' بحری جہازوں نے ناکہ بندی کر رکھی تھی' ہر طرف سے بم' راکٹ اور میزائل برس رہے تھے۔ چودہ دن میں گیارہ ہوائی حملوں کے دوران' ۲ ہزار ۳ سو سے زیادہ لوگ ہلاک ہو چکے تھے۔ پانچ لاکھ کے قریب بے گھر ہو کر مارے مارے پھر رہے تھے۔

۳- واقعی ایسا ہوا' اور بطروس غالی کے دوسری مدت کے انتخاب کو امریکا نے ویٹو کر دیا۔

سرجیکل بم بیروت کے دو پاور ہاؤس تباہ کر چکے تھے۔ مگر بے شرمی کی حد یہ تھی کہ امریکا اور برطانیہ کھل کر اسرائیل کی پیٹھ ٹھونک رہے تھے: ''ہر ملک کو اپنے دفاع کا حق ہے۔ دہشت گردی کے خلاف یہ مناسب اور جائز ردِعمل ہے''۔

کہیں سے بھی اس وحشیانہ کارروائی کی مذمت میں چوں تک نہ ہو رہی تھی۔ لبنان کے ''مسلمان عرب بھائی'' چپ سادھے ہوئے تھے۔ تحریک آزادیِ فلسطین کے صدر یاسر عرفات [م: ۹ نومبر ۲۰۰۴ء] اسرائیلی وزیر اعظم شمعون پیریز سے معاہدہ [۳۰ اکتوبر ۱۹۹۱ء] کر کے مسکرا رہے تھے۔ لبنان نے ۱۵ اپریل کو سلامتی کونسل کا اجلاس بلایا' تو امریکا نے ایسی تیوریاں چڑھائیں کہ وہ مذمت کا ایک حرف بھی پاس نہ کر سکی۔ حتیٰ کہ قانا کے قتلِ عام کی خبر کے بعد بھی کوئی کچھ نہ بولا۔ لبنانیوں کی جان کیسے بچتی' وہ تو قانا کے حادثے نے مجبور کر دیا کہ اسرائیل اور امریکا اپنے منصوبے فی الحال ملتوی کر دیں اور دوڑ دھوپ کر کے' شام کے آمر مطلق صدر حافظ الاسد [م: جون ۲۰۰۰ء] کی خوشامد کر کے کسی طرح جنگ بندی کرا دیں۔ سولہ دن کے بعد جنگ بند ہوگئی' کم و بیش انھی شرائط پر' جن پر ۱۹۹۳ء کی اسرائیلی جنگ بند ہوئی تھی' اور جن شرائط کو اپنے حق میں تبدیل کرانے کے لیے ہی اسرائیل نے یہ غارت گری مچائی تھی۔

سامراجی استدلال

یہ [لبنان کے شیعہ مسلمانوں کی تنظیم] حزب اللہ کی کون سی ''دہشت گردی'' کے خلاف اسرائیلی سامراجیوں کا ''جائز دفاع'' تھا؟

۱۹۹۳ء میں اسرائیل کے اسی قسم کے حملے کے بعد' اور تباہی مچنے کے بعد' جب امریکا نے جنگ بند کروائی' تو یہ طے پایا کہ دونوں' اپنے شہری علاقوں سے دوسرے کے شہریوں پر حملے نہیں کریں گے۔ حزب اللہ اپنے اس حق سے دست بردار نہیں ہوئی کہ وہ مقبوضہ لبنان میں اسرائیلی فوجیوں پر حملے جاری رکھے گی۔ چنانچہ ''موت سے نہ ڈرنے والے'' مجاہدوں نے

ایسی بے جگری سے حملے جاری رکھے کہ پتہ بھی کھڑکتا تو اسرائیلی فوجی کانپ اُٹھتے۔

اپنے فوجیوں کی ہلاکت روکنے کے لیے اسرائیل نے معاہدے کی خلاف ورزی کرتے ہوئے شہریوں پر حملے شروع کر دیئے اور ہر حملے کو ''غلطی'' قرار دیتا رہا۔ حزب اللہ نے جواب میں گلیلی میں قریات شمونہ پر راکٹ پھینکنا شروع کر دیے۔ لطف کی بات یہ ہے کہ ان راکٹوں سے ایک بھی اسرائیلی ہلاک نہ ہوا تھا___ بلکہ ۱۹۸۳ء سے' ۱۴ سال کی مدت میں حزب اللہ کی جوابی ''دہشت گردیوں'' سے صرف ۱۳' اسرائیلی ہلاک ہوئے ہیں___ لیکن جب ایک اور فوجی ہلاک ہو گیا تو اسرائیل نے ۱۱ اپریل سے ''سبق سکھانے'' کا آپریشن شروع کر دیا۔ رسالہ اکانومسٹ' لندن جیسے اسلام دشمن پرچے کو بھی کہنا پڑا: ''حزب اللہ کی کارروائیوں کو دہشت گردی قرار دینا تو دہشت گردی کی تعریف کو بہت زیادہ کھینچ دینا ہے۔ اوّل تو حزب اللہ اپنے ہی علاقے کو آزاد کرانے کے لیے حملے کر رہے تھے' اور یہ ''جوابی کارروائی'' تو ''ایک آنکھ کے بدلے دو آنکھیں'' نکال دینے کے مترادف ہے' بلکہ اس سے بھی زیادہ''۔

اسرائیلی حملے کے مقاصد فوجی نہیں' سیاسی تھے۔ ۱۹۹۳ء کے معاہدے کی شرائط پر لڑنا (جو قانا کے واقعے کی وجہ سے نہ بدل سکیں)' عام آبادی کو حزب اللہ کا مخالف بنانا (بے تحاشا بم باری نے عیسائی مسلمان' شیعہ سنی سب کو ایک کر دیا)' لبنانی اور شام کی حکومتوں پر دباؤ ڈالنا' حماس کے حملوں میں ۵۹ اسرائیلیوں کے ہلاک ہونے پر بہنے والے اسرائیلی آنسو پونچھنا۔ سب سے بڑھ کر ۲۹ مئی کے انتخابات میں شمعون پیریز کی [بطور اسرائیلی وزیر اعظم] کامیابی کے امکان کو روشن تر بنانا۔ اگر دہشت گردی کی تعریف یہ ہے کہ سیاسی مقاصد کے لیے شہریوں کو نشانہ بنایا جائے' تو اسرائیل کا یہ حملہ ایک سو ایک فی صد دہشت گردی تھا۔ لیکن کیونکہ یہ کام ''شہنشاہ'' کے کارندے نے کیا' اس لیے کس کی مجال ہو سکتی ہے' جو یہ کہے: ''جناب والا' اصل اور بڑے ڈاکو تو آپ ہیں!''

اسرائیلی دہشت گردی

لبنان کے خلاف اسرائیل کی دہشت گردی کی یہ واردات' نہ نئی ہے نہ تعجب خیز۔

اسرائیل کے نزدیک جنوبی لبنان اور دریائے لیطانی کے پانی کا مالک وہ ہے۔ پھر جب ستمبر ۱۹۷۰ء میں اُردن کے شاہ حسین [م: ۱۹۹۹ء] نے اسرائیل اور امریکا کی خوشنودی کی خاطر' ہزاروں فلسطینیوں کو قتل کر کے تنظیم آزادی فلسطین (PLO) کو در بدر کیا۔ تب پی ایل او نے بھی لبنان میں ٹھکانا بنایا اور وہاں سے اسرائیل کے خلاف کہیں کہیں چھوٹی موٹی کارروائیاں بھی شروع کر دیں۔ چنانچہ اب تک اسرائیل' لبنان پر تین بہت بڑے اور بے شمار ان سے کم بڑے حملے کر چکا ہے۔

مارچ ۱۹۷۸ء میں پہلے خونیں حملے میں ۲ ہزار ہلاک' ڈھائی لاکھ بے گھر' اور بے شمار علاقے تاخت وتاراج ہوئے۔ ۶ جون ۱۹۸۲ء کو اسرائیل نے دوسرا حملہ شروع کیا۔ ستمبر میں بیروت پر قبضہ کر لیا' صابرہ اور شاتیلا کیمپ عیسائی فوج کے حوالے کر دیا۔ جس نے وہاں ایسا قتلِ عام کیا کہ دنیا کو پہلی دفعہ کچھ پتا چلا کہ 'شہنشاہ' کیا کچھ نہیں کر رہے۔ یہ بھی تنظیم آزادیِ فلسطین کی 'دہشت گردی' کے خلاف 'ردعمل' تھا۔ جس میں چار سال کے دوران انتیس اسرائیلی ہلاک ہوئے تھے! لیکن اس 'ردعمل' کا نتیجہ: ۲۰ ہزار لبنانی مسلمانوں کو ہلاک (۴۰ ہزار صرف بیروت میں)' کیمپ اور بستیاں مسمار' لاکھوں بے گھر کر کے ظاہر کیا گیا۔

تیسرا حملہ' اسرائیل نے جولائی ۱۹۹۳ء میں کیا۔ ۱۹۸۳ء کے بعد سے اس نے اپنی فوجیں داخل کرنے کی حماقت تو نہ کی' مگر حالیہ آپریشن کی طرح جہازوں اور توپوں سے بے پناہ بم باری کر کے لاکھوں لبنانیوں کو بے گھر کیا' اور سیکڑوں کو ہلاک۔ ان کے علاوہ' ۱۹۷۰ء سے مسلسل حملے کر کے وہ لبنان میں جو ہلاکت مچاتا رہا ہے' اس کا تو ذکر یہاں ممکن نہیں۔ ۱۹۷۶ء میں لبنانی فوج کے ریکارڈ کے مطابق اوسطاً ہر دو دن میں تین بار اسرائیلی حملے ہوئے' ۱۹۷۵ء میں روزانہ ۷ حملے ہوئے' اکتوبر ۱۹۷۷ء تک جنوب سے مستقل پناہ گزینوں کی تعداد ۳۰ ہزار تک پہنچ چکی تھی۔

تاریخ کا ناپسندیدہ کردار

لبنان کے خلاف کارروائیاں بھی ایک بڑی کہانی کا حصّہ ہیں۔

اسرائیل کی پیدایش ہی دہشت گردی کے نتیجے میں ہوئی ہے' اور وہ قائم بھی دہشت گردی کے بل پر ہے۔ لیکن سینٹ آگسٹائن کی کہانی بخوبی واضح کر دیتی ہے' کہ فن کاری کا کمال یہ ہے کہ ایسی دہشت گردیاں کرنے والے' سب کچھ کرنے کے بعد بھی' خود 'شہنشاہ' بنے رہتے ہیں' اور باقی سب کو 'ڈاکو' قرار دے کر ان کی سرکوبی کرتے رہتے ہیں۔

کون سی کارروائی دہشت گردی ہے' اس کا انحصار اس پر نہیں کہ ''کیا کارروائی ہوئی'' یا ''کیوں'' ہوئی' بلکہ اس پر ہے کہ ''کس'' نے کی؟ بین الاقوامی دہشت گردی کے خلاف امریکا کے سارے جوش و خروش اور مہم آرائی کا مقصد دہشت گردی کا انسداد نہیں' بلکہ اپنے اہداف کی تکمیل' اپنے مفادات کا حصول اور تحفظ' اپنے مخالفین کی سرکوبی اور اپنے اسرائیل کے جرائم پر پردہ ڈالنا ہے۔

اسرائیل کی دہشت گردیاں پوری طرح عالمی پریس میں رپورٹ نہیں ہوتیں۔ اگر رپورٹ ہو جائیں تو ہر کارروائی دہشت گردی کے خلاف 'جائز ردعمل' اور اپنے 'حق دفاع کا استعمال' شمار ہوتی ہے۔ دوسروں کا ہر فعل' خواہ اپنی آزادی اور حقوق کے لیے ہو' یا ردعمل کے طور پر سیدھا 'دہشت گردی' شمار ہوتا ہے۔

ہوائی جہاز کے اغوا کی پہلی واردات' اسرائیل نے کی' جب ۱۹۵۴ء میں اس کے دہشت گردوں نے ایک شامی ہوائی جہاز کو لدہ کے ایئرپورٹ پر اُتار لیا۔ اس وقت کے اسرائیلی وزیراعظم موشے شیرٹ کی ڈائری کے مطابق: ''چیف آف اسٹاف موشے دایان کا مقصد [شامی] مسافروں کو یرغمال بنانا تھا' تاکہ شام سے اسرائیلی جنگی قیدی رہا کرائے جاسکیں''۔ پہلا سیاسی قتل ۱۹۴۸ء میں اسرائیل نے کیا' جب اقوام متحدہ کے 'صلح کنندہ' کاونٹ برناڈوٹ کو اسرائیلیوں نے موت کے گھاٹ اتار دیا۔ اس ہلاکت کے ذمہ دار تین کمانڈروں

میں سے ایک' اسحاق شامیر تھے' جو بعد میں اسرائیل کے وزیر خارجہ بھی بنے' دوسرے وزیراعظم ڈیوڈ بن گوریان [م: ۱۹۷۳ء] کے گہرے دوست تھے۔

امریکا اور اسرائیل وہ پہلے ملک ہیں' جنھوں نے بالترتیب ایران (۱۹۸۱ء) اور لیبیا (۱۹۷۳ء) کے مسافروں سے بھرے عام ٹرانسپورٹ طیارے مار گرائے۔ اسی طرح اسرائیل کی بحریہ' مسافروں سے بھری کشتیاں اور چھوٹے جہاز اغوا کر کے عیسائیوں کے حوالے کرتی رہی ہے' جو انھیں موت کے گھاٹ اتارتے رہے ہیں۔

اسرائیلی وزیراعظم بیگن کی دہشت گرد تنظیم [ہیرٹ] نے اپریل ۱۹۴۸ء ہی میں دیریاسین نامی بستی کے ڈھائی سو نہتے باشندوں کو' جن میں ایک سو سے زائد عورتیں اور بچے شامل تھے' موت کے گھاٹ اتار دیا۔ بیگن نے اپنے مبارک بادی تار میں کہا: ''جس طرح دیریاسین میں' اسی طرح ہر جگہ...... اے رب' اے رب! آپ نے ہمیں فتح کے لیے چُن لیا ہے''۔ اسی طرح ایریل شیرون [بعدازاں وزیراعظم اسرائیل] کی سرکردگی میں' یونٹ ۱۰۱ نے اگست ۱۹۵۳ء میں غزہ میں البریجا کیمپ پر حملہ کر کے ۵۰ پناہ گزین قتل کر دیے' پھر اکتوبر ۱۹۵۳ء میں اُردن میں قبیہ نامی گاؤں پر حملہ کر کے اسے مکمل طور پر تہس نہس کر دیا۔

شہریوں کو قتل کرنا' ان کی بستیوں کو مسمار کرنا' ان کو گھروں سے نکال کر بے گھر کرنا' یہ تو اسرائیل کے لیے آغاز ہی سے معمول کی کارروائیاں رہی ہیں۔ افسانہ تو یہ گھڑا گیا کہ ''فلسطینی خود گھر اور زمینیں چھوڑ چھاڑ کر چلے گئے'' لیکن اب تو خود اسرائیلی مورخین مثلاً بینی مارس (Morris)' الوی شلائم (Shalaim) اور آئی لین پیٹی (Patty) سرکاری دستاویزات کی بنیاد پر یہ حقیقت تسلیم کر رہے ہیں: ایک منظم اور سوچے سمجھے منصوبے کے تحت آبادیوں کی آبادیاں موت کے گھاٹ اتاری گئیں' لوگوں کو بھاگنے پر مجبور کیا گیا اور ان سے جبراً کاغذات دست برداری پر دستخط کرائے گئے۔

امریکی سرپرستی میں شیطانی کھیل

لبنان میں اسرائیل کی وحشیانہ کارروائیوں کی امریکا کی طرف سے مکمل حمایت اور پشت پناہی بھی کوئی نئی بات نہیں ہے۔

امریکا شروع ہی سے اسرائیل کے سارے جرائم میں اس کی بھرپور مدد کرتا رہا ہے۔ یہ امریکا ہی ہے جو اسرائیل کو سب سے بڑھ کر زیادہ سے زیادہ مالی امداد دیتا رہا ہے۔ وہ بہترین اسلحہ فراہم کرتا رہا ہے، جن کے ذریعے اس نے کشت وخون کر کے اپنے سیاسی مقاصد حاصل کیے ہیں۔ اس نے اسرائیل کے انسانیت کش جرائم کی مذمت تک نہیں ہونے دی ہے' اُلٹا ان پر پردہ ڈالا ہے اور ان کو 'جائز' اور 'مبنی برحق' بنا کر پیش کیا ہے' اور اس کی پیٹھ ٹھونکی ہے۔ گویا امریکا نے اسرائیل کو کھلا لائسنس فراہم کیے رکھا ہے کہ وہ جہاں چاہے گھس جائے' جس کو چاہے مار ڈالے' جس بستی کو چاہے تباہ و برباد کر دے' جن کو چاہے گھروں سے نکال باہر کرے' جس زمین پر چاہے قبضہ جما لے۔ اس تعاون اور پشت پناہی میں حکمران' سیاست دان' دانش ور اور ذرائع ابلاغ' سب ایک دوسرے سے بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے ہیں۔

مثال کے طور پر ۱۹۷۸ء سے لے کر ۱۹۸۲ء کے دوران' امریکا نے اپنی کل عالمی فوجی امداد کا اڑتالیس فی صد اور اقتصادی امداد کا ۳۵ فی صد حصہ تنہا اسرائیل کو دیا۔ جب بھی اسرائیل نے دہشت گردی کی کوئی بڑی کارروائی انجام دی' امریکا نے اس کی پیٹھ ٹھونکی بلکہ اس کو خصوصی امداد کا تحفہ بھی دیا۔ ۱۹۸۲ء میں بیروت پر حملے اور قتلِ عام کے فوراً بعد امریکی صدر [۱۹۸۱-۸۹ء] رونالڈ ریگن نے اسرائیل کے لیے اڑھائی ارب ڈالر کی امداد کی تجویز کانگرس کو بھیجی۔ کانگرس کو مسئلہ یہ درپیش تھا کہ اسرائیل کو 'سزا' دینے کے لیے امداد میں یہ اضافہ کافی ہے یا مزید اضافے کی ضرورت ہے۔

اکتوبر ۱۹۸۵ء میں اسرائیل نے تیونس پہنچ کر تحریکِ آزادی فلسطین کے ہیڈ کوارٹر پر امریکا کے دیے ہوئے وہ تیر بہ ہدف (smart) بم برسائے' جنھوں نے ۷۵ شہریوں کے

پرخچے اُڑا دیے۔ اسی امریکا نے اس بم باری کا سرکاری طور پر خیر مقدم کیا' اور اسے دہشت گردی کے خلاف ایک جائز جواب قرار دیا۔ اس کے صلے میں امریکی صدر ریگن نے ۱۷ اکتوبر کو اسرائیلی وزیر اعظم شمعون پیریز کا واشنگٹن میں والہانہ استقبال کیا اور کہا: آج امریکا اور اسرائیل کے درمیان "غیر معمولی" ہم آہنگی ہے ___ ظاہر ہے کہ امریکا' اسرائیلی جہازوں کے تیونس جانے سے بے خبر کس طرح ہو سکتا تھا۔ ساتھ ہی دونوں نے "دہشت گردی" کی لعنت کا مقابلہ کرنے اور اسے "امن" کی راہ میں حائل نہ ہونے دینے کے عزم کا اعلان کیا۔ اپریل ۱۹۹۶ء میں لبنان میں یہ ساری دہشت گردی مچانے کے بعد' شمعون پیریز پھر واشنگٹن گئے' تاکہ "دہشت گردی" کے مقابلے کے لیے خصوصی آلات و اسلحہ اور امداد حاصل کر سکیں۔

بیروت میں قتلِ عام کے بعد' ۲۶ جون ۱۹۸۳ء کو جب اقوام متحدہ کی سلامتی کونسل نے متفقہ طور پر اسرائیل اور تحریک آزادی فلسطین دونوں سے مطالبہ کیا' کہ وہاں سے اپنے فوجی دستے ہٹالیں' تو یہ امریکا تھا جس نے اس قرارداد کو ویٹو [مسترد] کر دیا۔ حقیقت یہ ہے کہ جب بھی اسرائیل کے کسی بھی اقدام کی مذمت میں کوئی بھی قرارداد پیش ہوئی' تو امریکا نے اس کی مخالفت کی' پاس ہوئی تو اسے ویٹو کر دیا' یہاں تک کہ مسجد الخلیل میں ایک اسرائیلی انتہا پسند کی طرف سے نمازیوں کے قتلِ عام کی مذمت کو بھی امریکا نے ویٹو کر دیا۔ اور اب تو سلامتی کونسل کو اجلاس کرنے اور بحث کرنے کی بھی جرأت نہ ہوئی' مذمت تو بہت دُور کی بات ہے۔

اس میں کسی شک کی گنجایش نہیں کہ امریکا' اسرائیل کے تمام جرائم میں برابر کا شریک ہے۔ لیکن یہ ضرور بحث طلب ہے کہ: امریکا' یہودی لابی کے زیر اثر' اسرائیل کا تابع مہمل بنا یہ سب کچھ کر رہا ہے' یا فی الواقع ڈوری کا سرا اسی کے ہاتھ میں ہے' اور اسرائیل روز اول سے مشرق وسطیٰ میں امریکا کے عالمی اہداف و مقاصد کے حصول کے لیے اس کے آلہ کار کے طور پر یہ سارے کام انجام دے رہا ہے؟

''یہودی اثرات وطاقت'' اور ''یہودی سازشوں'' کے وجود کے بارے میں بھی دلائل کمزور نہیں، لیکن ہمیں دوسری بات زیادہ قرین قیاس لگتی ہے کہ اصل مجرم امریکا ہے، اور اسرائیل اس کا منہ زور گماشتہ۔ اگر امریکا رسی دراز نہ کرتا، تو اسرائیل قائم ہی نہ ہوسکتا تھا، یہ سب کارروائیاں تو دُور کی بات ہے۔ قرآن بھی یہی کہتا ہے کہ یہود کو ذلت ومسکنت سے اگر کچھ نجات ملے گی، تو وہ حُبْلٍ مِّنَ اللّٰہِ وَحَبْلٍ مِّنَ النَّاسِ (اٰل عمرٰن ۳:۱۱۲) ''کہیں اللہ کے ذمے یا انسانوں کے ذمے'' کے نتیجے میں۔

دراصل امریکا نے تو دوسری جنگِ عظیم [۴۵-۱۹۳۹ء] کے دوران ہی عالمی غلبہ وتسلط کا منصوبہ بنالیا تھا۔ ۱۹۴۶ء سے لے کر آج تک وہ بڑی خوب صورتی سے اس منصوبے کو عملی جامہ پہناتا رہا ہے۔ یہاں تک کہ آج وہ اس پوزیشن میں ہے کہ کہہ سکے: ''۲۱ویں صدی، امریکا کی صدی ہے''۔[۴]

مشرق وسطیٰ کی حد تک امریکا نے اپنے اسٹرے ٹیجک اہداف ڈھکے چھپے نہیں رکھے ہیں۔ اسرائیل فی نفسہٖ امریکا کے لیے کوئی اسٹرے ٹیجک اثاثہ (asset) نہیں، اصل اہمیّت تیل کی ہے، مارکیٹ کی ہے۔ ۱۹۴۵ء میں امریکی وزارتِ خارجہ اس نتیجے تک پہنچ چکی تھی کہ: ''سعودی عرب اسٹرے ٹیجک قوت کا ایک بڑا ہی عظیم خزانہ ہے۔ یہ عالمی تاریخ میں سب سے بڑا مادی انعام ہے''۔ چنانچہ اس انعام کو جیتنے اور اپنے قبضے میں رکھنے کا امریکا نے تہیہ کرلیا۔ اسی کا ایک پہلو یہ بھی کہ اربوں پٹروڈالر خود امریکا کی معیشت کے اندر رہنے چاہییں۔

اس مقصد کے لیے اس نے برطانیہ، فرانس اور یورپ کو شرق اوسط سے نکال باہر کیا۔ یونان اور ترکی پر تسلط قائم کیا، اور ہر عرب ملک میں ایسے جابر ومستبد حکمران مسلط کیے، جن کا اقتدار اس کی حمایت کا محتاج ہو۔ اسی منصوبے کی تکمیل کے لیے امریکا نے اسرائیل کو اپنی پٹھو

۴- مجلہ Foreign Affairs، مارچ اپریل ۱۹۹۶ء ص ۲۰-۵۴

ریاست (client state) کے طور پر قائم کیا' مضبوط کیا' طاقت ور بنایا' یہاں تک کہ آج وہ فوجی لحاظ سے شرق اوسط کی سب سے طاقت ور ریاست ہے۔ مبینہ طور پر اس کے پاس کم سے کم دوسو ایٹم بم ہیں' جن کا تذکرہ امریکا میں ممنوع ہے۔ اس لیے اس نے ہر برے بھلے وقت میں اسرائیل کا پورا ساتھ دیا' اس کی ہر حرکت و شرارت کی پوری پشت پناہی کی' کیونکہ اس حرکت و شرارت کا نفع امریکا کے کھاتے میں جاتا تھا۔

مصر سب سے بڑا عرب ملک ہے۔ مصری صدر [۱۹۷۰-۸۱ء] انوار السادات [م: ۱ اکتوبر ۱۹۸۱ء] نے یروشلم کی ''یاترا'' کی اور آنکھیں بند کر کے 'کیمپ ڈیوڈ معاہدے' [مارچ ۱۹۷۹ء] پر دستخط بھی کیے۔ امریکی وزیر دفاع ولیم پیری کے الفاظ میں: ''مصر سے ہم وہ سب کچھ کرا سکتے ہیں جو چاہتے ہیں''۔ تنظیم آزادی فلسطین چند میونسپلٹیاں لے کر فلسطینیوں کو دبانے کے شرم ناک کام میں اسرائیل کی شریک کار ہوگئی۔ اس وقت اس کی جیلوں میں تیرہ ہزار قیدی ہیں۔ عراق تباہ و برباد ہے' ایران کمزور ہے' اس کے گلے میں پھندا کسا جا رہا ہے۔ چھوٹی چھوٹی ریاستیں کویت' امارات' عمان' قطر' امریکی فوجی اڈوں میں تبدیل ہو چکی ہیں۔ لبنان میں اسرائیل نے اتنی ہولناک کارروائی کی' مگر کسی عرب ملک نے چوں تک نہ کی۔ حالانکہ دنیا کے ان دس ملکوں میں سے جو سب سے زیادہ فوجی اسلحہ اور ساز و سامان خریدتے ہیں' سات عرب ممالک ہیں۔

اس عرصے میں امریکا نے جو کچھ حاصل کر لیا ہے' کیا اسرائیل کی حمایت و پشتی بانی کا یہ نفع کچھ کم ہے۔ اسرائیل نے کیا حاصل کیا ہے؟ ایک ریاست جو مستقل دشمنوں سے گھری ہوئی ہے' خطرے میں ہے۔ امریکا کے رحم و کرم پر ہے۔ اس کے ''عظیم تر اسرائیل'' اور ''شرق اوسط پر تسلط'' کے منصوبے اب تک خواب و خیال ہیں۔ ہاں' اس نے امریکا کے خوابوں کو حقیقت بنانے میں اپنا کلیدی کردار ادا کر دیا ہے۔

اسرائیلی ہدف

سوال پیدا ہوتا ہے یہ وحشت اور درندگی' یہ دھوکے اور فریب کا کاروبار' یہ غیر انسانی اور انسانیت سوز حرکات کیوں کر ممکن ہو رہی ہیں؟ اسباب کیا ہیں؟ جڑیں کہاں ہیں؟

جہاں تک لبنان کے خلاف اسرائیل کی طویل دہشت گردی کا تعلق ہے' تو اس کا اصل سبب اسرائیل کے متعین اہداف ہیں۔ ان اہداف کی تکمیل میں مکمل ساتھ دینا یقیناً امریکی مفاد میں بھی ہے' اگرچہ بعید نہیں کہ امریکا کے پیشِ نظر ان دو سو اکتالیس فوجیوں کا انتقام بھی ہو' جن کو حزب اللہ ملیشیا نے اکتوبر ۱۹۸۳ء میں بم سے اڑا دیا تھا۔ اسرائیل کا طویل المیعاد ہدف اس دستاویز سے واضح ہے جو ۱۹۱۹ء میں ورلڈ زایونسٹ آرگنائزیشن (WZO) نے' ورسیلز کانفرنس کو دیا تھا۔ اس دستاویز میں مطلوبہ عظیم تر اسرائیل میں دریائے لیطانی تک پورا جنوبی لبنان شامل ہے۔ چنانچہ ۱۹۴۸ء سے ہر اسرائیلی لیڈر' جنوبی لبنان پر قبضہ کرنا اپنا حق سمجھتا آیا ہے۔ ۱۹۴۸ء میں جب اسرائیل قائم ہوا' تو پہلے وزیراعظم بن گوریان نے کہا: ''لبنان میں ایک عیسائی حکومت قائم ہونا چاہیے' جس کی جنوبی سرحد دریائے لیطانی ہو''۔

موشے شیرٹ اپنی ۱۹۵۵ء کی ڈائری میں لکھتا ہے: ''موشے دایان [بعدازاں اسرائیلی وزیر دفاع] کا کہنا ہے کہ ہم کو صرف ایک میجر چاہیے' جس کو ہم جیت لیں یا خرید لیں' اور جو خود کو عیسائیوں کا نجات دہندہ قرار دے۔ بس پھر اسرائیلی فوج لبنان میں داخل ہو جائے گی' ایک عیسائی حکومت قائم کر دے گی' اور دریائے لیطانی کے جنوب کا سارا علاقہ اسرائیل میں شامل کر لیا جائے گا۔ یہ کام ہمیں فوراً ــــ بلکہ کل ــــ ہی کر لینا چاہیے''۔

موت کے متوالے

اسرائیل کی بدقسمتی سے پہلے' فلسطینیوں اور پھر حزب اللہ کی جرأت نے ان کا یہ منصوبہ درہم برہم کر دیا۔ ۲۳ سال بعد' ۱۹۷۸ء کے حملے میں وہ جنوبی لبنان میں ایک میجر

سعد مراد تلاش کر پایا' اور ایک عیسائی حکومت قائم کر دی۔ پھر ۱۹۸۴ء میں اس نے بیروت پر قبضہ کر کے' فلسطینیوں کا قلع قمع کیا۔ لیکن اس کے بعد حزب اللہ میدان عمل میں آ گئی۔ بقول کسے: ''فلسطینی تو مارنے کا مقصد لے کر آئے تھے' حزب اللہ کے مجاہد مرنے کی تمنا لے کر آتے ہیں''۔ ان کا مقابلہ کس طرح ممکن تھا۔ چنانچہ آج تادم تحریر دو عشرے گزر گئے ہیں مگر اسرائیلی فوج کسی طرح جنوبی لبنان پر قبضہ برقرار نہیں رکھ پائے۔ اسرائیلی فوج' حزب اللہ کے خوف سے کانپتے ہیں۔ اسرائیل کی ساری دہشت گردی ۱۹۱۹ء کے عظیم تر اسرائیل کی جستجو میں اور حزب اللہ کے خلاف غم وغصہ کی وجہ سے ہے۔

یہ اسباب تو اسٹرے ٹیجک ہیں۔ درندگی کی اصل جڑیں ہمیں بہ آسانی مغرب کی تہذیب' کلچر اور تاریخ میں مل جائیں گی۔ ان جڑوں کی نقاب کشائی بھی سینٹ آگسٹائن کی کہانی بہ خوبی کرتی ہے۔ اپنی تہذیبی ونسلی فوقیت کے نشے میں خود کو شہنشاہ سمجھنا اور اپنے لیے ہر کارروائی جائز سمجھنا' اور جو راہ میں حائل ہوں' ان کو ''دو ٹانگوں کے وحشی جانور'' قرار دے کر ان کا صفایا کرنا۔

ابھی بوسنیا میں چھ لاکھ مسلمانوں کے قتل عام کا اعتراف کیا گیا ہے جو ہمارے نزدیک درست نہیں' درحقیقت انھیں اس سے بھی کہیں بڑی تعداد میں شہید کیا گیا ہے۔ لیکن مہذب یورپ میں خود یہودیوں کے ساتھ جو کچھ ہوا' شمالی امریکا [پر قبضہ جمانے والے سفید فاموں] نے ریڈ انڈینوں [شمالی امریکا کے حقیقی باشندوں] کا جس طرح صفایا کیا' اسے دیکھ کر خیال گزرتا ہے کہ [نازی جرمنی کا آمر مطلق] ہٹلر [م: ۱۹۴۵ء] امریکا پر رشک کرتا ہوا مر گیا ہو گا کہ اس نے اپنی نسلی اقلیت' ریڈ انڈین کا مسئلہ کتنی 'خوش اسلوبی' اور 'خاموشی' سے حل کر لیا کہ وہ ۲۰ لاکھ میں سے صرف ۲ لاکھ رہ گئے ___ یہ چند نمونے اسی 'تہذیب اور کلچر' کے ہیں۔

امریکی صدر [۹۷-۱۷۸۹ء] جارج واشنگٹن نے لکھا ہے: ''انڈینوں میں' کوئی چیز انسانی نہیں' سوائے انسانی شکل کے۔ جیسے جیسے ہماری آبادکاری بڑھے گی' ہم ان وحشیوں کو'

بھیڑیوں کی طرح' نکال باہر کرتے رہیں گے۔ دونوں ہی شکاری درندے ہیں' خواہ شکل میں مختلف ہوں''۔۔۔۔ اسرائیل بھی اسی ذہن اور تہذیب کی پیداوار ہے۔

کہانی کا سبق

یہ کہانی اس لیے کھول کر بیان نہیں کی کہ ہم امریکا اور اسرائیل کے خلاف دل کی بھڑاس نکالنا چاہتے ہیں' یا امریکا اور اسرائیل کی دہشت گردیوں کی نقاب کشائی اور ان کے کلچر و تہذیب میں اس کی جڑوں کی نشان دہی کر دینے ہی کو کافی اور مسئلے کا حل تصور کرتے ہیں۔ ہاں' ہم امریکا' اسرائیل اور دیگر مغربی طاقتوں اور مغرب کے ناواقف عوام کے سامنے' ان کے مہذب ہونے' حقوق انسانی کا علم بردار ہونے اور دہشت گردی کا دشمن ہونے کے دعووں اور عزائم کے حوالے سے' پوری حجت قائم کرنا ضروری اور انسانیت کے لیے مفید سمجھتے ہیں۔

ساتھ ہی ہم یہ بھی ضروری سمجھتے ہیں کہ خود مسلمانوں کو بین الاقوامی سیاست کاری کا صحیح ادراک اور شعور حاصل ہو۔ انھیں معلوم ہو کہ ''شہنشاہ'' کس طرح بے گناہوں کو' دہشت گرد' قرار دیتے ہیں' چھوٹے چھوٹے ''دہشت گردوں'' کے خلاف زبردست شوروغل مچاتے ہیں' اور پوری پوری قوموں کو' دہشت گردی' کے الزام میں صلیب پر چڑھا دیتے ہیں۔ لیکن' اس طرح وہ عام لوگوں کی آنکھوں میں دھول جھونکتے ہیں اور عالمی پیمانے پر اپنی بڑی بڑی فوجی طاقتوں سے دہشت گردی مچانے کے جرائم پر تہذیب کا پردہ ڈالتے ہیں۔

مسئلے کی اصل جڑ تو ہمیں [بحیثیت مسلم اُمت] اپنے اندر ہی تلاش کرنا ہوگی' اس کا حل بھی اپنے اندر ہی سے نکالنا ہوگا۔ ورنہ ہم: ہر لبنان' بوسنیا' چیچنیا' کشمیر و فلسطین اور اراکان وغیرہ پر خون کے آنسو تو ضرور بہا سکتے ہیں' ان المیوں کے دوبارہ وقوع پذیر ہونے کو روک نہیں سکتے۔ دشمن سے گلے اور شکایت کا کیا فائدہ اور کیا جواز کہ تم نے ہمارے ساتھ دشمنی کیوں کی؟

اور اتنی وحشیانہ دشمنی کیوں کی؟ اگر ذلت و مسکنت' لاچاری و ناطاقتی ہمارا مقدر بن چکی ہے تو اس کی اصل وجہ ہمارے اندر ہے' اگر دشمن ہمارے اُوپر مسلط ہے تو اس کا باعث ہم خود ہیں۔ صادق ومصدوق صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمانے میں شک کی کیا گنجایش ہے:

ھی اعمالکم ترد علیکم

یہ تمھارے ہی اعمال ہیں جو تمھیں واپس کیے جارہے ہیں۔

فمن وجد خیرًا فلیحمد اللّٰہ ومن وجد غیر ذٰلک فلا یلومن الا نفسہ

بس جو بھلائی اور خیر پائے وہ اللہ کا شکر کرے' اور جو اس کے خلاف کچھ پائے' وہ اپنے علاوہ کسی کو ملامت نہ کرے۔

مسلم ریاستوں پر مسلط حکمرانوں کی مجرمانہ بے حسی اور امریکا کی انسانیت سوز غلطی پر ہم جتنے آنسو بہائیں کم ہیں' لیکن اس کا بھی کوئی حاصل نہیں۔ یہ حکمران اسی وقت تک ہمارے اوپر مسلط ہیں' اور مسلط رہ سکتے ہیں' اور اسی وقت تک قوم کو فروخت کرسکتے ہیں' اور ارزاں فروخت کرسکتے ہیں' جب تک قوم بحیثیت مجموعی ان کو برداشت کر رہی ہے' اور ان کے پھندے سے آزاد ہونے کے لیے کچھ کرنے کو تیار نہیں۔

مایوسی کی بھی کوئی بات نہیں۔ گذشتہ چند برسوں میں ہونے والے واقعات یقیناً غم ناک ہیں' مایوسی کا کینسر بھی پیدا کرتے ہیں۔ لیکن ہم کو اپنا زاویہ نظر وسیع کرنا ہوگا۔ نصف صدی کی مدت' حیات اجتماعی میں کوئی طویل مدت نہیں ہوتی۔ اگر ہم پچاس برس پہلے سے آج کا موازنہ کریں تو دیکھیں گے کہ اُمت کے جسد بے جان میں زندگی کی لہر نے دوڑنا شروع کردیا ہے۔ سیکڑوں سال کی بیماری پلک جھپکتے میں دُور نہیں ہوسکتی' نہ قعر ذلت سے اٹھ کر کوئی قوم اچانک بامِ عزت پر پہنچ سکتی ہے۔ دیکھا جائے تو اُمت کے مقصد اصلی کے شعور' اس کے ساتھ وابستگی' اس کے لیے سعی و جہد' اس کے مخالفین کی مزاحمت میں نمایاں اضافہ ہوا ہے' بلکہ یہ

سارے اثاثے کم و بیش اسی نصف صدی کی پیداوار ہے۔

ضرورت اس کی ہے کہ جو جاگ رہے ہیں' وہ دوسروں کو جگائیں' جو کھڑے ہیں وہ دوسروں کو کھڑا کریں' جو چل رہے ہیں' وہ دوسروں کو چلائیں۔ گہری للٰہیت اور پُرجوش انقلابیت کے ساتھ متحد ہو کر ہم آگے بڑھیں تو کوئی وجہ نہیں کہ اللہ تعالیٰ ہماری مدد نہ کرے' اور: مِّنۡۢ بَعۡدِ غَلَبِهِمۡ سَيَغۡلِبُوۡنَ [الروم ۳۰:۳]' اور اپنی اس مغلوبیت کے بعد چند سال کے اندر وہ غالب ہو جائیں گے' کی صبح نہ طلوع ہو۔

ہماری قوت کا خزانہ اللہ پر ایمان اور اللہ کے ساتھ وابستگی میں ہے۔ ہمارے غلبے کا راز اللہ کے دین کے لیے' رسالتؐ کے مشن کی تکمیل کے لیے' جان و مال کی بازی لگا دینے میں ہے۔ ہماری طاقت کا راز اس اُمت کو متحد رکھنے اور اس کا دائرہ وسیع کرنے میں ہے۔ جو اس بات پر کان دھرنے کو تیار ہو' جس کے پاس دل دردمند ہو' وہ آگے بڑھے' اور لبیک کہے۔ قطرہ قطرہ دریا بنتا ہے۔

کشمیر میں مٹھی بھر لوگ ۷ لاکھ بھارتی مسلح فوج کا ناطقہ بند کیے ہوئے ہیں۔ چیچنیا میں مٹھی بھر مجاہدین نے ایک سپر پاور کو لاچار کر دیا' لبنان میں مٹھی بھر حزب اللہ نے ''شہنشاہ'' اور اس کے کارندے کو ناکوں چنے چبوا دیے: كَمۡ مِّنۡ فِئَةٍ قَلِيۡلَةٍ غَلَبَتۡ فِئَةً كَثِيۡرَةًۢ بِاِذۡنِ اللّٰهِ (البقرہ ۲:۲۴۹) ''بارہا ایسا ہوا ہے کہ ایک قلیل گروہ اللہ کے اذن سے ایک بڑے گروہ پر غالب آ گیا ہے''۔ [جون ۱۹۹۶ء]

☐☐☐

بوسنیا: مسلمانوں کی حالت زار اور مغرب

یورپ کے عین قلب میں' جی ہاں 'تہذیب، جمہوریت اور بنیادی حقوق' کے علم بردار یورپ کے عین قلب میں' وہ یورپ جو بنیاد پرستی اور مذہبی جنون کے ''امراض'' میں مبتلا نہیں' بلکہ امن و انصاف' انسان دوستی اور ایک نئے عالمی نظام کا علم بردار ہے' اس یورپ کے ہاتھوں' آج بوسنیا کے مسلمانوں کو نیست و نابود کرنے اور یورپ کے نقشے پر بوسنیا کی ایک خودمختار مسلمان ریاست کا نام و نشان مٹانے کے لیے وحشت و درندگی کا جو انسانیت سوز کھیل کھیلا جا رہا ہے' وہ اب کوئی ڈھکا چھپا راز نہیں رہا۔ لیکن سربیا کے چنگیز خانی مظالم' مغربی طاقتوں کی مکاری اور عیاری' اور مسلم ممالک کی قیادتوں کی انتہائی شرم ناک بے حسی پر کتنے ہی غیض و غضب کا اظہار کیا جائے یا ماتم' حالات میں کوئی تغیر رونما نہ ہوگا۔

جو کچھ پیش آ رہا ہے وہ بھی قانون ازلی کے تحت پیش آ رہا ہے کہ: فَكُلًّا اَخَذْنَا بِذَنْۢبِهٖ [العنکبوت ۲۹:۴۰] آخر کار ہر ایک کو ہم نے اس کے گناہوں کی پاداش ہی میں پکڑا۔ تغیر رونما ہوگا تو وہ بھی قانون ازلی ہی کے مطابق کہ: وَاَنْ لَّيْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰى [النجم ۵۳:۳۹] 'انسان کے لیے کچھ نہیں ہے' مگر وہ جس کی اس نے سعی کی ہے' اور: اِنَّ اللّٰهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِهِمْ [الرعد ۱۳:۱۱] 'اللہ کسی قوم کے حال کو

نہیں بدلتا' جب تک وہ خود اپنے اوصاف کو نہیں بدل دیتی ـــــ اور جب اللہ کسی قوم کی شامت لانے کا فیصلہ کر لے تو پھر وہ کسی کے ٹالے نہیں ٹل سکتی' نہ اللہ کے مقابلے میں ایسی قوم کا کوئی حامی و مددگار ہو سکتا ہے۔

اپنے لیے خود ہی فکر کرنا' اللہ کی طرف رجوع' اپنی منصوبہ بندی' اور اپنی سعی و جہد اور اس کے صلے میں اللہ تعالیٰ کی رحمت و نصرت' اس کے علاوہ ان الم ناک واقعات کا دھارا پلٹنے کا اور کوئی راستہ نہیں۔ اقوام متحدہ کی فوجیں' اقوام عالم کا ضمیر' یورپی برادری کی دخل اندازی' یا اسلحہ کے لیے اپنے ہی دشمنوں کے سامنے دست سوال دراز کرنا اور اُمیدیں باندھنا' یہ سب جھوٹے سہارے ہیں' اور دل کو بہلانے کے لیے نشے کے جام۔ تارِ عنکبوت سے بھی زیادہ بودے اور کمزور۔

یہ بے خبری

بوسنیا کے مسلمانوں پر قیامت ٹوٹ پڑنے سے پہلے ملت اسلامیہ اپنے ان بھائیوں کے وجود سے بھی واقف نہ تھی۔ یہ ان دنوں کی بات ہے جب دنیا پر خلافتِ عثمانیہ [۱۲۹۹ء-۱۹۲۴ء] کی عظمت کا جھنڈا لہرایا کرتا تھا' اس کی سرحدیں وسط یورپ تک وسیع ہو چکی تھیں' اور اس کی فوجیں دریائے ڈینیوب تک پہنچ چکی تھیں۔

بوسنیا یورپ میں عثمانیوں کی سرحد پر وہ صوبہ تھا' جہاں پندرہویں صدی کے اواخر میں سلاوک نسل کے لوگ بڑے پیمانے پر مشرف بہ اسلام ہوئے تھے۔ ایک روایت کے مطابق ایک دن میں ۳۶ ہزار افراد نے اسلام قبول کیا۔ انیسویں صدی کے اواخر میں ادھر خلافت عثمانیہ زوال کے مدارج اترتی رہی' ادھر بوسنیا اور مشرقی یورپ کے دیگر مسلمان' عیسائی ریاستوں کے زیرنگیں آتے گئے۔ اہلِ مغرب کی زبان میں ''جنونی'' مسلمانوں کی حکومت میں تو عیسائی اور یہودی مکمل رواداری' جان و مال کی سلامتی اور دیگر حقوق کی نعمتوں سے بہرہ ور رہے تھے۔ لیکن جو مسلمان عیسائی مملکتوں کے تحت آتے' ان کے خلاف ظلم و جبر اور قتل و

غارت کی قیامتوں کا ایک نہ ختم ہونے والا سلسلہ ٹوٹ پڑتا۔ اسی سلسلے کی تازہ ترین کڑی بوسنیا میں مسلمانوں کے استیصال کی مہم ہے۔

مسئلے کا پس منظر

بوسنیا کے سلاوک مسلمان ہو گئے' لیکن ان کے شمال میں کروشیا (Croatia)' رومن کیتھولک رہا اور مغرب وجنوب میں سربیا' یونانی آرتھوڈوکس چرچ کا پیروکار۔ مختلف مذاہب اور نسلوں کے اس خطے کو' پہلی جنگِ عظیم [۱۸-۱۹۱۴ء] کے بعد' قدیم حکومتوں کے ملبہ پر یوگوسلاویہ کی ریاست کو شکل دی گئی۔ جہاں دوسری جنگ عظیم [۴۵-۱۹۳۹ء] کے بعد مارشل ٹیٹو [م: مئی ۱۹۸۰ء] کی قیادت میں کمیونسٹ حکومت غالب آ گئی۔ ٹیٹو کے دورِ حکومت [پہلے وزیراعظم' پھر صدر: ۸۰-۱۹۴۵ء] میں یوگوسلاویہ بظاہر آٹھ خود مختار ریاستوں پر مشتمل ملک تھا۔ ٹیٹو خود کروشیا کا باشندہ تھا' لیکن کمیونسٹ پارٹی اور فوج میں سرب غالب تھے۔ سربیا ہمیشہ سے' پورے خطے کو دیگر لوگوں سے' خصوصاً مسلمانوں سے'' پاک وصاف'' کر کے ایک عظیم سربیا وجود میں لانے کے لیے کوشاں رہا ہے۔

کمیونزم کے زوال (۱۹۹۰ء) کے بعد مختلف ریاستوں نے سربیا کے تسلط سے نکل کر آزاد ہونا شروع کر دیا۔ سلووینیا اور کروشیا جیسی عیسائی ریاستیں تو' سربیا کی مزاحمت کے باوجود' یورپی برادری اور اقوام متحدہ کی سرپرستی میں آزاد ہو گئیں۔ لیکن جب بوسنیا نے' جہاں کی ۴۴ فی صد آبادی مسلمان تھی' ریفرنڈم میں آزادی کے فیصلے کی جسارت کی' تو سربیا نے اسی ''مہذب'' یورپ میں قتل وغارت' شہروں اور قصبات کی تباہی' بڑے پیمانے پر آبادیوں کے انخلا' کیمپوں میں نظربندی' عصمت دری اور ہلاکت کا ایک ایسا شیطانی کھیل شروع کر دیا جس کی نظیر کم ہی ملے گی۔ یورپی برادری اور امریکا نے اس شیطانی کھیل پر کچھ نہ کرنے اور نیم دلانہ مذمت تک محدود رہنے کی پالیسی اختیار کر لی۔

آخر یورپ کے قلب میں ایک مسلمان ریاست کیسے برداشت کی جاسکتی تھی' جو برائے نام سہی' لیکن بہرحال تھی تو مسلمان۔ خصوصاً تاریخ کے ایسے موڑ پر جب آنے والی تہذیبی کش مکش میں مسلمان ہی اصل حریف اور ہدف بن چکا ہے۔

سرب درندگی' چند مناظر

سربیا کا خواب واضح ہے: ایک عظیم سربیا ___ ان کے عزائم بھی عیاں ہیں: کم سے کم دو تہائی بوسنیا پر قبضہ اور وہاں سے مسلمانوں کی نسل کا صفایا (cleansing)۔ ان کا طریق واردات بھی آنکھوں کے سامنے ہے: مسلمان آبادیوں کا محاصرہ' ان پر گولہ باری' عمارتوں کو مسمار کرنا' فاقوں سے مارنا' قبضہ ہو جائے تو ان کو تتر بتر کر دینا' جاتے ہوئے ان سے تمام اموال و جائیدادوں کی ملکیت منتقل کرا لینا' جو نہ جائیں ان کو مویشیوں کی طرح باڑوں میں بند کر دینا' لڑنے کے قابل نوجوانوں کو سر میں گولی مار کے یا گلے کاٹ کر ہلاک کر دینا۔ یہ سب کچھ ٹی وی اسکرینوں اور اخباری کالموں میں دیکھا گیا ہے۔

بی بی سی کی رپورٹ کے مطابق ۱۹ لاکھ مسلمانوں میں سے ۹ لاکھ بوسنیا سے باہر نکالے جاچکے ہیں' اور آٹھ لاکھ خود بوسنیا میں بے گھر ہیں۔ کیمپوں میں بند ہیں یا دربدر ٹھوکریں کھاتے پھر رہے ہیں۔ ایک لاکھ کے قریب لوگ ہلاک کیے جاچکے ہیں۔ فوکا شہر میں ۷۵ فی صد مسلمان تھے' مگر آج ایک بھی نہیں۔ بوسنیا میں سیکڑوں مساجد گولہ باری سے منہدم کی جاچکی ہیں۔ بوسنیا کی معیشت کی تباہی کا اندازہ ایک سو ارب ڈالر کے مساوی ہے۔ یہ سب کچھ "مہذب" یورپ کے قلب میں ہوا ہے۔

- وحشت و درندگی کے جو کام کیے گئے ہیں' جو سب عینی شواہد سے ثابت ہیں' وہ لرزہ خیز اور ناقابلِ یقین ہیں۔ جس رات برطانوی ٹی وی کی اسکرین پر اومارسکا (Omarska) اور منیاکا (Manyaka) کے کیمپوں میں موجود مسلمانوں کے بے جان اور بے بس انسانی

ڈھانچے نمودار ہوئے' تو انھیں دیکھ کر سنگ دلوں کے بھی دل پسیج گئے' آنکھیں نم ہوگئیں۔ اومارسکا میں ڈھائی ہزار مسلمان اس طرح بند کیے گئے کہ گھٹ دم گھٹنے سے مر گئے۔ فرینکفرٹ کی "انٹرنیشنل سوسائٹی فار ہیومن رائٹس" کے پاس ایسے گیارہ کیمپوں کے بارے میں عینی شواہد موجود ہیں' جہاں قیدیوں کو منظم طریقہ سے باقاعدہ ہلاک کیا گیا ہے۔ صرف فوکا اور پریجیڈور (Prijidor) کے دو کیمپوں میں "ہزاروں کو موت کے گھاٹ اتارا جا چکا ہے"۔ ایک نامہ نگار نے فوکا کیمپ میں ایک کلومیٹر فاصلہ میں بیس لاشیں شمار کیں۔

۱۹۴۱-۴۵ء کے دوران بھی ایک لاکھ بیس ہزار مسلمان ہلاک کیے گئے تھے۔ حجاب کا مذاق اڑانے کے لیے عورتوں کے چہروں کی کھالیں کھینچ کر اتار دی گئی تھیں۔ وضو اور نماز کا تمسخر بنانے کے لیے مردوں کے ہاتھ' پیشانیوں کی کھالیں چھیل دی گئی تھیں۔ یہ تو ایک طرف' خود سرب فوجیوں کی نگرانی میں ایک سرب عورت نے شیشے کے ٹکڑے سے چند مردہ اور زندہ مسلمانوں کی آنکھیں نکال دیں' اعضا کاٹ دیے اور پھر اپنے اس فعل پر بڑے فخر اور خوشی کا اظہار کیا۔ بھاری ہتھوڑوں سے سر پھاڑ دیے گئے اور رپورٹروں نے راستوں میں بکھرے ہوئے انسانی بھیجے دیکھے۔ بچوں کی تدفین ہو رہی تھی تو قبرستان پر گولہ باری کی گئی۔ اپنے شہید پوتے کو دفن کرنے آیا تھا مگر دادا خود اپنے اعضا کھو بیٹھا کہ اس بزرگ کی حالت زار دیکھ کر بے حس رپورٹر بھی رو پڑے۔ بے دردی سے مارا پیٹا جاتا تو اس وحشت سے نہ زخمی' نہ بیمار' نہ عورت' نہ بچہ' کوئی بھی نہیں بچتا۔ ایک طرف تو اسلام کی قائم کردہ حدود کو "وحشیانہ" کہا جاتا ہے' مگر ڈیلی ٹیلی گراف 'لندن میں ایک آنکھوں دیکھی رپورٹ پڑھ لیجیے۔ شاید آپ کو یقین نہ آئے کہ آپ اس مہذب زمانے میں رہ رہے ہیں۔

سولیو ڈیلک اپنے شہر کا نقشہ کاغذ پر بنا کر بتاتا ہے:

یہ ہیں وہ پُل جہاں روزانہ ہی مسلمان ذبح کیے جاتے تھے! یہ ہے وہ سڑک جہاں اس سے خون صاف کرایا گیا تھا! یہ ہے وہ مقام جہاں اس نے انسانی سر سے لٹکتا

ہوا مغز دیکھا! وہ [سرب درندے] ویگنوں اور لاریوں میں ایک ایک گلی میں جاتے‘ فہرستوں کے مطابق اپنے شکار تلاش کرتے‘ زیادہ تر نوجوان اور ادھیڑ عمر کے مسلمان کو۔ لاریوں میں بھر لوگوں کو پلوں تک لے جاتے‘ اتار کے دیواروں کے ساتھ کھڑا کر دیتے۔ پھر ان کو ذبح کر دیا جاتا۔ کسی کے سر میں گولی مار کر‘ کسی کا گلا کاٹ کر اور کسی کی پیٹھ میں چھرا گھونپ کر۔ پھر ان کی لاشیں دریائے ڈرینا میں پھینک دی جاتیں۔ ساتھ ہی باقی گلیوں میں ایک وین اعلان کرتی پھرتی کہ ”مسلمانو‘ تم بالکل محفوظ ہو“۔[1]

انسان دوستی‘ دوہرے معیارات

بوسنیا کویت نہیں ہے‘ نہ وہ دوسرا ”کویت“ بننے کی شرائط پر پورا اترتا ہے۔[2] وہاں انسان بستے ہیں‘ وہ بھی مسلمان! نہ وہاں تیل کے چشمے پھوٹتے ہیں‘ نہ وہاں امریکی‘ یورپی مفادات رہتے ہیں۔ نہ وہاں پر اسرائیل ہے کہ جس کی رضا مقصود ہے۔ نہ وہاں مسلمان سے مسلمان کا گلا کٹوانے کا مقصد حاصل ہوسکتا ہے اور نہ وہاں سے اربوں ڈالر مل سکتے ہیں۔

پھر کیا ۱۴۹۱ء کے سقوطِ غرناطہ کی پانچ سو سالہ یادگار کے طور پر ۱۹۹۲ء میں بوسنیا کو ایک دوسرا اسپین بنانا ہے؟[3] اس سوال کا جواب تو کل کی تاریخ دے گی‘ مگر آج کے حقائق سے چشم پوشی ایک جرم عظیم ہوگا۔

۱- روز نامہ ٹیلی گراف‘ لندن‘ ۸ اگست ۱۹۹۲ء

۲- اگست ۱۹۹۰ء میں عراق نے کویت پر قبضہ کرلیا۔ چونکہ کویت تیل کی دولت سے مالا مال تھا‘ اس لیے امریکا اور اس کے اتحادیوں نے ’کویت کی مدد‘ کے بہانے‘ ۱۹۹۱ء کے اوائل میں عراق پر حملہ کر کے اس کی اینٹ سے اینٹ بجا دی۔ بعدازاں مارچ ۲۰۰۳ء میں امریکی قیادت میں اتحادی فوجوں نے عراق پر حملہ کر کے وہاں اپنا قبضہ مضبوط بنانے کی کوشش کی۔

۳- مراد یہ ہے کہ مسلم اسپین پر قبضہ کرنے کے بعد وہاں کے عیسائی حکمرانوں نے جس طرح مسلمانوں کا قتل عام کیا تھا۔

بوسنیا میں بہیمانہ درندگی اور وحشت' مغرب کی مہذب اقوام کے لیے اتنا بھی سنگین واقعہ نہیں ہے' جتنا عراق کی طرف سے اقوام متحدہ کو وزارت زراعت کا معائنہ کرنے کی اجازت نہ دینا' کہ سلامتی کونسل جنگ کا الٹی میٹم دے ڈالے۔ امریکی صدر [۹۳-۱۹۸۹ء] جارج بش اپنی چھٹی منسوخ کر دیں' امریکی قومی سلامتی کونسل کا اجلاس طلب کر لیا جائے' اور امریکی بحری بیڑہ حرکت میں آ جائے۔

بوسنیا ایک آزاد ملک ہے' جس کو یورپ کے ممالک اور اقوام متحدہ تسلیم کر چکے ہیں اور جس پر سربیا نے قبضہ جمانے کے لیے پیش قدمی شروع کر رکھی ہے۔ لیکن امریکی وزیر خارجہ کے الفاظ میں: ''بوسنیا اور کویت میں کیا مماثلت! یہاں خانہ جنگی ہے' وہاں [کویت] ایک ملک نے دوسرے ملک پر قبضہ کر لیا تھا''۔

اصل بات اس کے علاوہ اور کچھ نہیں کہ بوسنیا کے مسلمانوں کو اسلام سے کتنا ہی دُور کر دیا گیا ہو' مگر اس کے باوجود وسطی ایشیا کے مسلمانوں کی طرح ان کے دلوں سے بھی مسلمان ہونے کے تشخص کا احساس نہیں کھرچا جا سکا ہے ___ اور دل میں مسلمان ہونے کا احساس اور شعور! یہ ایک ایسا ''گناہِ عظیم'' ہے جو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ اس احساس و شعور کی تہہ میں ایک قیامت برپا اور ایک محشر پنہاں ہے۔ اس لیے اہلِ مغرب کا فیصلہ یہی تھا کہ: ''بوسنیا کو آزاد اسلامی ملک نہیں بننا چاہیے' اسی لیے خود مختار بوسنیا نہیں بنے گا!''

چنانچہ وہی یورپی طاقتیں' امریکا اور اقوام متحدہ' جنھوں نے سلووینیا کی آزادی اور تحفظ کا بندوبست کیا' کروشیا کو سربیا سے بچانے کے لیے مداخلت کی اور اقوام متحدہ کی فوج بھجوا دی' بوسنیا کے معاملے میں مگرمچھ کے آنسو بہا رہے ہیں' اور کچھ نہ کرنے پر تلے بیٹھے ہیں۔ کچھ آنکھ کی شرم ہے' کچھ اپنے مہذب ہونے کی لاج بھی رکھنا ہے' اور کچھ یورپ کو درپیش خطرات کے اندیشے کے پیش نظر نیم دلانہ کوششیں کی گئی ہیں۔

مسلمان آبادیوں کا صفایا' کیمپوں میں قتل و غارت اور وحشت و درندگی ان کے

علم میں کچھ زمانہ گزرنے کے بعد نہیں آئی۔ ٹیلی ویژن نے تو ہر شہری کے ضمیر کو چونکا دیا' اور حکمرانوں پر کچھ نہ کچھ کرنے کے لیے دباؤ بڑھا دیا۔ ورنہ حکمران تو ان سب واقعات سے عرصے سے واقف تھے۔ کینیڈا کی تنظیم ''مدرز فار پیس'' کے بیان کے مطابق: ''ہم نے تو جنوری ۱۹۹۲ء میں سلامتی کونسل کو تمام حقائق وشواہد فراہم کر دیے تھے''۔ مگر اس وقت برطانوی سفیر نے: ''میں کچھ نہیں کر سکتا'' کہنا کافی سمجھا۔ اقوام متحدہ کے سارے اداروں اور مغربی اقوام کی ساری حکومتوں کے پاس بھی سارے حقائق موجود رہے ہیں۔ اس بات کے دستاویزی ثبوت بھی موجود ہیں' اور عقلی طور پر بھی یہ تصور کرنا مشکل ہے کہ وہ خود اپنے پڑوس سے اتنے لاعلم ہوں' جب کہ ان کے مواصلاتی سیارے اور سیٹلائٹ ان کو دنیا کے چپے چپے کی خبریں پہنچا دیتے ہیں۔

یورپی برادری کی طرف سے متعین لارڈ کیرنگٹن [برطانوی وزیر خارجہ] بوسنیا پر برابر یہ دباؤ ڈالتے رہے کہ وہ ان تمام علاقوں کو جہاں سرب اور کروٹ آباد ہیں' خودمختاری دے دے۔ دوسری طرف یورپ اور امریکا مختلف طریقوں سے سربیا کو مکمل یقین دہانی کراتے رہے ہیں کہ ان کی طرف سے کسی فوجی مداخلت کا کوئی امکان نہیں' تاکہ سربیا پورے اطمینان سے اور دھڑلے سے مسلمانوں کا صفایا کرنے کا کام کرتا رہے۔ تیسری طرف وہ اس گھڑی کے انتظار میں ہیں جب دو تہائی سے زیادہ بوسنیا پر سربیوں کا قبضہ ہو جائے (جو بوسنیا کی آبادی کا ۳۰ فی صد ہیں)' مسلمانوں کا انخلا ہو جائے' پھر وہ اپنے سر جنگ بندی اور صلح کا سہرا باندھیں' اور بوسنیا ایک ایسی صورت حال قبول کرنے پر مجبور ہو جائے جب اس کے لیے اپنے باقی ماندہ تھوڑے سے علاقے میں ایک آزاد مملکت کے طور پر باقی رہنا ممکن ہی نہ ہو۔

چنانچہ مغربی اقوام کی ساری کارروائیاں انسانی امداد پہنچانے' مہاجرین کا انخلا مکمل کرنے' اور سربیا کو گیدڑ بھبکیاں دینے تک محدود ہیں۔ ان کو فکر نہ بوسنیا کی سرحدوں کی ہے (جس طرح کویت کی سرحدوں کی تھی)' نہ مسلمانوں کے قتل وغارت کی ہے۔

ٹی وی کی اسکرین پر کیمپوں میں محصور، لرزہ خیز، چلتی پھرتی انسانی لاشیں دیکھنے کے بعد بہت سوں میں وہ ''انسان'' جاگ اٹھا جو ہر فطرت میں موجود ہے۔ اخبارات نے فوجی مداخلت کی حمایت میں اداریے لکھے۔ امریکا میں ۵۳ فی صد افراد نے سربیا کے خلاف جنگی کارروائی کی حمایت کی۔ لیکن امریکی صدر جارج بش سینیر، برطانوی [کنزرویٹو] وزیراعظم جان میجر [۹۷-۱۹۹۰ء] اور دیگر یورپی زعما امدادی قافلوں کو فوجی حفاظت فراہم کرنے کے اعلان سے ایک انچ آگے جانے کو تیار نہیں۔ عرب کے ریگستانوں میں لاکھوں کی فوج اتاری جاسکتی تھی، مگر اب صدر بش نے یہ موقف اختیار کیا: ''میں ایک بھی امریکی فوجی نہیں بھیجوں گا جب تک مجھے یہ نہ معلوم ہو کہ وہ کس طرح نکل کر واپس آئے گا''۔ وہ سربیا کو ہوائی بم باری کی دھمکی بھی دینے کے لیے آمادہ نہیں ہوئے۔ دراصل یہ سب کے سب، بوسنیا کے مسلم تشخص پر فاتحہ پڑھنے کے انتظامات رہے ہیں۔

پھر کوسووا کی باری

اگر کچھ اضطراب ہے تو ان خطرات کے اندیشوں کی وجہ سے ہے جو یورپ کو لاحق ہوسکتے ہیں۔ سربیا کے جنوب میں کوسووا (Kosovo) کی چھوٹی سی ریاست ہے، جس کی ۹۰ فی صد آبادی البانوی مسلمانوں پر مشتمل ہے، جو ابھی تک دم مارنے کی ہمت بھی نہیں کر رہی ہے۔

کیا سربیا، بوسنیا سے فراغت کے بعد، کوسووا کا رخ کرے گا؟[۴]

جرمنی کی سوسائٹی برائے انسانی حقوق کی رپورٹ کے مطابق: وہاں کم و بیش سارے البانوی مسلمان بچوں کو ایسا زہر دے دیا گیا ہے جس سے وہ بانجھ ہو جائیں۔ وہ سارے شہری و انسانی حقوق سے محروم کر دیے گئے ہیں، ملازمتوں سے نکال دیے گئے ہیں ــــــ کوسووا

۴- ۱۹۹۸ء میں سربیا نے کوسووا کے مسلمانوں پر بھی مظالم اور وسیع پیمانے پر قتلِ عام کی وہی تاریخ دہرانا شروع کر دی، جو بوسنیا میں کر چکا تھا۔

سے متصل البانیہ ہے ـــــ پھر کہیں یہ آگ پھیلتی تو نہ چلی جائے گی کہ سارے یورپ کو اپنی لپیٹ میں لے لے۔

۱۹۱۴ء میں بوسنیا کے دارالحکومت' سرائیوو ہی میں وہ گولی چلی تھی جس نے نہ صرف آسٹریا کے آرچ ڈیوک کو ہلاک کر دیا' بلکہ اس نے جنگ عظیم [۱۹۱۴-۱۸ء] کی آگ بھڑکا دی جس میں یورپ کے مسلسل اور لامتناہی ترقی کے خواب خاکستر بن گئے۔ چار سالہ طویل اور تباہ کن' مگر لایعنی جنگ اور کروڑوں لاشوں اور اپاہج و مفلوج جسموں نے یورپ کے جسم و جان پر ایسے کاری زخم لگا دیے' جن سے وہ آج تک صحت یاب نہیں ہو سکا اور سرائیوو میں چلنے والی گولی دوسری تباہ کن جنگ عظیم کا تحفہ بھی دے گئی۔

ایک فرانسیسی مبصر کے الفاظ میں: آج سرائیوو میں امریکی صدر جارج بش کا ''نیا عالمی نظام'' تو دفن ہو چکا ہے۔ سوال پیدا ہوتا ہے' کیا بوسنیا سے تتر بتر کیے جانے والے مسلمانوں کے اندر کا مسلمان جاگ اٹھے گا' اور یورپ کے ہر ملک میں جا کر پناہ لینے والے مسلمان یورپ کو ایک اور مشرق وسطیٰ بنا دیں گے؟ ـــــ اس قسم کے اندیشے ہیں جنھوں نے سابق برطانوی وزیر اعظم [۱۹۷۹-۹۰ء] مسز مارگریٹ تھیچر کو یہ کہنے پر مجبور کر دیا کہ: ''سربیا کو الٹی میٹم دو۔ اس کے فوجی ٹھکانوں پر بم باری کرو' اور بوسنیا کی اصل سرحدیں بحال کراؤ''۔

فرعون کو اپنے گھر میں موسیٰؑ کے وجود سے ڈر لگا ہوا ہے۔ لیکن فرعون کے لیے اپنے انجام سے کوئی مفر ممکن ہے؟

بے حسی اور غفلت

بوسنیا' یورپ کی تہذیب کی پیشانی پر ہی کلنک کا ٹیکا نہیں کہ جس کا دھونا اس کے لیے ناممکن ہے' عالمِ اسلام کے دامن پر بھی ایسا داغ ہے جو دھوئے نہ دھلے گا۔ اس پورے عرصہ قیامت میں مسلمان ممالک کے بادشاہ' جنرل' وزرائے اعظم' ایک کمزور سے احتجاج' مہینوں کے

بعد چند سفیروں کی واپسی سے زیادہ بڑا کوئی کارنامہ سرانجام نہیں دے سکے۔ بے حسی اور ذلت کی بھی حد ہوتی ہے۔

ایک پوری مسلم آبادی کا نام و نشان مٹایا جا رہا ہے' اسے بدترین مظالم کا شکار بنایا جا رہا ہے' وہ جرأت و ہمت سے اپنے اسلامی تشخص کے تحفظ میں جہاد میں مصروف ہے' نہ اس کی مالی مدد ہے' نہ مادی' نہ فوجی۔ جن ملکوں نے اربوں ڈالر پلیٹ پر رکھ کر امریکا' اسرائیل اور روس کی خدمت میں پیش کر دیے' ان کے خزانوں پر سانپ بیٹھے رہے' اور بوسنیا کے مسلمان مرتے رہے۔

بنی اسرائیل کی اسی بے حسی اور برادرکشی' برادرکشی سے تغافل اور بے نیازی پر قرآن نے یہ کہا:

فَمَا جَزَآءُ مَنْ يَّفْعَلُ ذٰلِكَ مِنْكُمْ اِلَّا خِزْيٌ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَيَوْمَ الْقِيٰمَةِ يُرَدُّوْنَ اِلٰٓى اَشَدِّ الْعَذَابِ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ○

(البقرہ ۲:۸۵) تم میں سے جو لوگ ایسا کریں' ان کی سزا اس کے سوا اور کیا ہے کہ دنیا کی زندگی میں ذلیل و خوار ہو کر رہیں' اور آخرت میں شدید ترین عذاب کی طرف پھیر دیے جائیں۔

المیہ' المیہ ہی ہوتا ہے۔ لیکن اس المیہ نے بوسنیا کے مسلمانوں کو اسلام سے آشنا کر دیا' مسلمان ہونے کا شعور ان کے دل و دماغ پر ثبت کر دیا۔ ''تمھارا قصور کیا تھا؟'' اس کا جواب اب ہر ایک کے پاس ایک ہی ہے: ''ہم مسلمان ہیں''۔ عملی طور پر وہ اسلام سے بہت دُور جا چکے تھے۔ اب بے جگری سے ''مسلمان رہنے کے لیے'' لڑ رہے ہیں___ جنت ان کے لیے مطلوب و مقصود بنتی جا رہی ہے۔ بوسنیا کے مفتی صاحب کے الفاظ میں: ''اگر ہم نے اب بھی جنت حاصل کرنے کی سعی نہ کی' تو ہماری قسمت میں دو جہنم ہیں' ایک اس دنیا میں ظلم و ذلت کی جہنم اور دوسرے آخرت میں اللہ کی جہنم''۔

مادی طور پر دونوں کے درمیان کوئی مقابلہ نہیں ہے۔ مگر' اللہ اکبر! اللہ کی طاقت ہر طاقت سے بڑی ہے اور اس کی تدبیر ہر تدبیر پر حاوی۔ وہ نہتوں کو فتح سے ہم کنار کر سکتا ہے۔ اگر بوسنیا کے مسلمان شوقِ شہادت اور طلب جنت کی راہ میں سرفروشی کے نئے باب رقم کرتے رہے' تو ان شاء اللہ صدیوں کے بعد' یورپ کے عین قلب میں ایک آزاد مسلمان ریاست قائم ہو جائے گی: وَمَا ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ بِعَزِيْزٍ [ابراهيم ۱۴:۲۰]' اندھیروں میں بوسنیا سے جس روشنی کے پھوٹنے کے امکانات سامنے ہیں ان کو حقیقت بنانے کے لیے یہی ضروری نہیں کہ بوسنیا کے ہمارے مسلمان بھائی' جو نہ عرب ہیں' نہ ترک' نہ ایرانی' نہ افغانی' نہ پاکستانی بلکہ خالص یورپی ہیں' خاک وخون کے طوفان سے گزریں' بلکہ یہ بھی ضروری ہے کہ ملت اسلامیہ کے جسدِ واحد کا ہر حصہ دامے' درمے' قدمے' سخنے ان کا شریکِ سفر ہو۔ [ستمبر۱۹۹۲ء]

□□□

بوسنیا کا سبق' عبرت کا تازیانہ

بوسنیا کا نام ونشان مٹانے کی خواہش میں برپا کی جانے والی صلیبی جنگ بلاشبہہ اسلام اور مغرب کے درمیان اسی تہذیبی جنگ کی ابتدائی جھڑپ ہے' جس کی خبر مغربی دانش ور اور سیاست دان کچھ عرصے سے بڑے زورشور سے دے رہے تھے۔ لیکن یہ جنگ جس عیاری' مکاری اور درندگی کے ساتھ مسلط کی گئی ہے' اس سے یہ بھی ظاہر ہوگیا ہے کہ ''مہذب'' مغرب کو اپنے تئیں اسلام کے خلاف یہ جنگ لڑنے میں تہذیب اور انسانیت کی کسی ادنیٰ سی قدر کو بھی پامال کرنے میں ذرہ برابر تامل نہ ہوگا۔

بوسنیا کو انسانوں کا' ان کی عصمتوں کا' ان کی املاک اور ان کے تہذیبی ورثے کا مذبح خانہ بنانے کا کام بے شک نسل پرست عیسائی سربوں نے انجام دیا' لیکن مغربی طاقتیں' خصوصاً برطانیہ' فرانس اور امریکا' اس جرم میں ان کے ساتھ برابر کے شریک رہے۔ انھوں نے جس ڈھٹائی سے سربوں کی پشت پناہی کی' ان کے جرائم میں اعانت کی' ان پر پردہ ڈالا' بوسنیا کے ہاتھ پاؤں باندھ کر اسے ذبح کرایا' اس کے حصے بخرے کر کے اس کا نام ونشان مٹانے کے منصوبوں کو عملی جامہ پہنایا' وہ اب کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں رہ گئی۔ مغربی طاقتیں ساتھ نہ دیتیں' تو سربیا ہرگز یہ سب کچھ نہ کرسکتا۔

مغرب کی گواہی

سربوں کی درندگی اور مغرب کی طرف سے ان کی پشت پناہی دیکھ کر مغرب کے اہلِ ضمیر بھی چیخ اٹھے ہیں۔ فرانس کے معروف دانش ور' پروفیسر بروکنر (Bruckner) کہتے ہیں:

یہ قانون کی پسپائی ہے۔ [دوسری جنگ عظیم کے دوران] نازی ازم کی شکست کے ۴۶ سال بعد ہمیں معلوم ہوگیا ہے کہ یورپ تہذیب' امن اور سلامتی کا گہوارہ نہیں' یہاں درندگی اور وحشت کا راج ممکن ہے۔ ہم جن یورپی اقدار پر یقین کے دعوے دار تھے' وہ ایک سراب ثابت ہوئی ہیں۔ اگر یورپ کی زمین پر ایسی درندگی ممکن ہے' تو ہماری پوری تہذیب ہی مشتبہ ہے۔[1]

اسی مجلّے کے اداریہ نگار لکھتے ہیں:

کہا جاتا ہے کہ سرائیوو میں یورپ مر رہا ہے' حقیقت یہ ہے کہ جو کچھ مر رہا ہے وہ یورپ سے کہیں زیادہ قیمتی ہے: انسان کا یہ حق کہ اس کے کچھ حقوق ہیں۔[2]

ڈیوڈ ریلف (David Rielff) اپنی کتاب میں مرثیہ خواں ہے:

گذشتہ ڈھائی سالوں کے دوران بوسنیا میں بے شمار خواب موت کے گھاٹ اتر گئے ہیں: یہ خواب کہ عالمی ضمیر نام کی کوئی چیز پائی جاتی ہے! یہ خواب کہ یورپ ایک تہذیب یافتہ علاقہ ہے! یہ خواب کہ انصاف اسی طرح کمزور کا حق ہے جس طرح طاقت ور کا! یہ خواب کہ سچائی کا علم ہمیں بدی سے نجات کے لیے کافی ہے!۔۔۔۔ کامل شکست! انتہائی شرم ناک![3]

لف شلز (Schultz) اور ربیعہ علی لکھتے ہیں:

۱- مجلّہ *Praxis*' اوکسفرڈ' ج ۱۳' ص ۳۳۹

۲- ایضاً' ص ۳۳۰-۳۳۱

۳- ڈیوڈ ریلف: *Slaughterhouse: Bosnia the Failure of The West*' ناشر: سائمن اینڈ شوسٹر' مارچ ۱۹۹۶ء' صفحات ۲۷۴

بوسنیا اس بات کا منہ بولتا ثبوت ہے کہ طاقت ور ریاستوں کے اقدامات میں اخلاقی اور انسانی اصولوں کے نام کی کوئی چیز نہیں پائی جاتی۔ اس کے باوجود زور وشور سے دنیا کو ان اعلیٰ اخلاقی اقدار کے درس پر درس دیتے رہتے ہیں جن پر' ان کے سوا' ساری دنیا کو کاربند رہنا چاہیے۔ نیورمبرگ کے اصول' بنیادی حقوق کے چارٹر' جنیوا کنونشن' ہیل سنکی اعلامیہ ـــــ یہ سب ان کے نئے "عقائد اور مقدس دستاویزات" ہیں، [اپنے مخالفین کو قابو میں رکھنے کے ہتھیار] لیکن وہ ان کو اپنے معاملات خراب کرنے کی اجازت کبھی نہیں دیتے۔[۴]

یہ ظلم' یہ درندگی

اپریل ۱۹۹۲ء سے [نسل پرست عیسائی] سربوں نے بوسنیا کے مسلمانوں کو' صرف مسلمانوں کو' بدترین وحشیانہ کارروائیوں کا نشانہ بنایا ہوا ہے۔ ڈھائی لاکھ سے زیادہ مسلمان ذبح کیے جا چکے ہیں' ہزاروں کو پکڑ کے اور باندھ کر گولی ماری گئی ہے' ۵۰ ہزار سے زائد عورتوں کی عصمت دری کی جا چکی ہے' ہزاروں بچوں کو دیوار پر مار کر اور ٹینکوں کے آگے ڈال کر قیمہ قیمہ کیا گیا ہے' لاشوں کا مثلہ کیا گیا ہے' ناک کان کاٹ کے اور آنکھیں نکال کے ہار بنائے گئے ہیں' کھوپڑیاں پھاڑ کر مغز نکالا گیا ہے' ۲۰ لاکھ سے زیادہ مسلمان بے گھر کیے جا چکے ہیں' ان کی بستیاں ملبہ بنا دی گئی ہیں (ایک وقت تھا کہ دو سو گاؤں روزانہ کے حساب سے)' ہزاروں مسجدیں' تین بڑی بڑی لائبریریاں' صد[illegible] پرانے مخطوطات' سیکڑوں مدرسے' فنِ تعمیر کے خوب صورت نمونے' مکانات' پُل' بورے کے پورے شہر (مثلاً فوچا' موستر' پرانا سرائیوو) تباہ و برباد کر کے' جلا کے مٹا دیے گئے ہیں۔ مغربی ممالک اور اقوام متحدہ بڑی دلچسپی اور خاموشی سے یہ سارا تماشا دیکھتے رہے ہیں۔

۴- لف شلز اور ربیعہ علی' Why Bosnia: Writings on the Balkan War' ناشر دی پمفلٹر' دسمبر ۱۹۹۳ء' ص۔

ایک کھیل سربرے نیکا (Srebrenica) اور زیپا (Zepa) میں جولائی [۱۹۹۵ء] میں کھیلا گیا' جو مغربی طاقتوں کے عزائم کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ یہ دونوں' ان ۶ شہروں میں متعین کیے گئے تھے جنھیں اقوام متحدہ اور مغربی طاقتوں نے مسلمان شہریوں کے لیے ''محفوظ پناہ گاہ'' (safe havens) قرار دیا گیا تھا کہ جہاں پر وہ سربوں کی غارت گری سے مامون ہوں گے۔ ان کی حفاظت کے لیے اقوام متحدہ کے فوجی دستے موجود تھے۔ تمام بین الاقوامی ضمانتوں اور حفاظتوں کے باوجود' سربوں نے اقوام متحدہ کے فوجیوں کو الٹی میٹم دیا' لیکن اقوام متحدہ کے چند فوجی جو راستے سے نہ ہٹے' انھیں یرغمال بنالیا' اور سربرے نیکا پر قبضہ کرلیا۔ پھر چند دن میں چوبیس ہزار مسلمانوں کا نسلی صفایا (ethnic cleansing) ہوگیا۔

بعدازاں ٹیلی ویژن کیمروں کے سامنے' فاتح کمانڈر جنرل ماکلوشیوچ [م: مارچ ۲۰۰۶ء] نے اقوام متحدہ کے ڈچ کمانڈر کے ساتھ جام فتح نوش کیا۔ کمال عیاری سے مسلمانوں کو دلاسا دیا' ان میں چاکلیٹ تقسیم کیے' انھیں امن و امان کا یقین دلایا' اور پھر کیمروں کے ہٹتے ہی خونی کھیل شروع ہوگیا۔ بوڑھوں اور بچوں کو دوسری محفوظ پناہ گاہ شہر' تزلا [Tuzla] روانہ کر دیا' جو ان مسلمان عورتوں کو عصمت دری کے لیے چُن لیا' تو جوان لڑکوں سمیت جو بھی لڑنے کے قابل تھے انھیں الگ کر کے بے دریغ گولیوں سے بھون دیا۔ اس کے بعد زیپا شہر کی باری تھی' وہ بھی اسی انداز میں فتح کرلیا گیا۔ پھر بیہاج [Behaj] شہر کا نمبر تھا۔

اقوام متحدہ اور ظلم

مغربی طاقتوں کا ردعمل کیا تھا؟

سربرے نیکا کے نزدیک اجتماعی قبروں کی تصویریں اقوام متحدہ میں پیش کر دیں' تو برطانیہ اور فرانس نے سخت ناک بھوں چڑھائی۔ اس سے پہلے' لندن میں ایک روزہ کانفرنس ہوئی' تو اعلان کیا گیا: ''اب اگر گورازدے [Gorazde] پر سربوں نے حملہ کیا تو سخت

کارروائی کی جائے گی''۔ یہ گویا لائسنس تھا کہ باقی محفوظ علاقے تم فتح کر سکتے ہو' گوراز دے بھی۔ کیونکہ کانفرنس کے صدر' برطانوی وزیر خارجہ نے ساتھ ہی یہ وضاحت بھی کر دی: ''ہم جنگ ہرگز نہیں کریں گے''۔ ساتھ ہی اصل عزائم بھی زبان سے اُبل پڑے: ''ٹھیک ہے' اب بوسنیا کے لیے ہماری تازہ پیش کش موجود ہے: سربرے نیکا' زیپا اور گوراز دے سے بالکل دست بردار ہو جاؤ' اور اس کے بدلے ____''۔

''اتنی'' محفوظ پناہ گاہیں وجود میں کیسے آئیں؟ یہ بھی ایک شرم ناک داستان ہے۔

ستمبر ۱۹۹۱ء میں' جب سربوں نے پہلے سلووینیا اور پھر کروشیا پر حملہ کیا' تو برطانیہ اور فرانس کی خواہش پر' اور سربوں کی درخواست پر' اقوام متحدہ کی سلامتی کونسل نے سارے یوگوسلاویہ کو اسلحے کی فراہمی پر پابندی عائد کر دی۔ یہ پابندی سراسر عیسائی سربوں کے مفاد میں گئی' اور سراسر مسلم بوسنیا کے خلاف۔ بوسنیا کے مجبور اور بے دست و پا مسلمانوں نے اپنی آزادی کے لیے امریکا اور یورپ کی ہدایات پر حرف بہ حرف عمل کیا۔ وہ' سلووینیا اور کروشیا کی طرح' یوگوسلاویہ سے علاحدہ نہ ہوا تھا۔ اس نے یورپ کی ہدایات کے مطابق ریفرنڈم بھی کرایا تھا۔ سربوں نے اس کی سرحدوں کو عبور کر کے جارحیت کی تھی۔ وہ اقوام متحدہ کے چارٹر کے تحت اپنے دفاع کے لیے اسلحے کے حصول کا بھی حق رکھتا تھا۔ لیکن' امریکہ اور برطانیہ نے بوسنیا کی سرحدوں کو تسلیم کرنے کے باوجود' بوسنیا پر اپنے دفاع کے لیے اسلحہ حاصل کرنے پر پابندی برقرار رکھی' اور اس پابندی کے اٹھانے کی شدت سے مخالفت کی' اگرچہ انھوں نے اس کے دفاع کا انتظام بھی نہ کیا۔

انٹرنیشنل انسٹی ٹیوٹ آف اسٹرے ٹیجک اسٹڈیز' لندن کے مطابق' بوسنیا میں سرب فوج کی طاقت کو' جسے' یوگوسلاویہ فوج سے سارے ہتھیار مل گئے تھے' بوسنیا کی فوج کے مقابلے میں دس گنا برتری حاصل تھی۔ بوسنیا کے پاس مشکل سے تین ہزار پانچ سو فوج تھی۔ ستمبر ۱۹۹۲ء میں اس کے پاس دو ٹینک' اور دو مسلح گاڑیاں تھیں' جب کہ سرب فوج کے پاس تین سو ٹینک'

دو سو گاڑیاں‘ آٹھ سو توپیں اور چالیس لڑاکا طیارے تھے۔

۱۸ دسمبر ۱۹۹۲ء کو اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی کو اس شرم ناک تضاد کا احساس ہوا کہ ایک‘ رکن ریاست کو چارٹر کی شق ۵۱ کے تحت اپنے دفاع کے لیے اسلحہ حاصل کرنے کا اختیار بھی نہیں۔ چنانچہ اس نے بھاری اکثریت سے ’بوسنیا پر سے پابندی اٹھانے کی قرارداد پاس کی‘ اور اقوام متحدہ کی سلامتی کونسل سے دست بستہ درخواست کی کہ وہ اپنا فیصلہ منسوخ کر کے بوسنیا کی سالمیت کے لیے ہر ممکن ذرائع اختیار کرے‘‘۔ لیکن سلامتی کونسل نے اس کو بالکل نظرانداز کر دیا‘ اور اسلحہ دینے کے بجائے چھ ’’محفوظ مقامات‘‘ قائم کر دیے۔ اس کے بعد اسلحہ پر پابندی ختم کرنے کی تمام کوششیں اور اپیلیں صدا بہ صحرا ثابت ہوئیں‘ یہاں تک کہ امریکی کانگرس کی قرارداد کو بھی امریکی صدر [۲۰۰۱ء-۱۹۹۳ء] بل کلنٹن نے ویٹو کر دیا‘ حالانکہ وہ اپنی انتخابی مہم کے دوران بوسنیا میں فوجی مداخلت کر کے سربوں کو روکنے کی حمایت کر رہے تھے۔

سربرے نیکا پر سرب قبضے کے بعد ایک چشم دید گواہ نے دیکھا: ’’پانچ سو مسلمان نوجوانوں سے پہاڑوں میں گھٹنوں کے بل مارچ کرائی جا رہی ہے‘ اور ان کے ہاتھ پیچھے گردنوں کے ساتھ بندھے ہوئے ہیں‘ پھر ان سب کو گولی ماردی گئی‘‘۔ ہوش کی آنکھوں سے دیکھا جائے تو امریکا‘ برطانیہ‘ فرانس اور یورپ نے بالکل یہی عمل پورے بوسنیا کے ساتھ کیا۔ پہلے اس کے ہاتھ پیچھے باندھے‘ پھر اپنے دفاع کے لیے ہتھیاروں سے محروم کیا‘ پھر اسے دشمن کے آگے گھٹنوں کے بل رینگنے پر مجبور کیا‘ پھر دشمن کو شہ دی اور اس کی پشت پناہی کی کہ وہ اس کا ایک ایک عضو کاٹے اور اس کے سارے جسم کو آگ اور لوہا برساتی گولیوں سے چھلنی کر دے۔

مغرب کی بودی دلیل

بوسنیا کے مسئلے میں‘ مغربی طاقتوں کی دلیل ہمیشہ ایک رہی: ’’اسلحے کی فراہمی سے خوں ریزی اور بڑھ جائے گی‘‘۔ لیکن اس سے زیادہ اور کیا خون ریزی ہوتی جتنی ہو چکی ہے۔

بوسنیا تو اتنا سخت جان ثابت ہوا کہ صرف تین ہزار پانچ سو فوج اور دو ٹینکوں سے شروع کر کے وہ تین سال تک اپنا دفاع کرتا رہا ہے' اور کسی طرح اسے مٹایا نہیں جا سکا۔ اگر اس کے پاس اسلحہ بھی ہوتا تو کیا صرف اسلحے کی موجودگی سرب جارحیت کو روکنے کے لیے کافی نہ ہوتی؟

مغربی ممالک نے اپنی داخلی سیاست کے دباؤ کی وجہ سے ایک طویل جنگ میں الجھنے سے بچنے کی خاطر' بوسنیا کی سالمیت کے تحفظ کے لیے فوجی مداخلت نہیں کی' اور نہ اقوام متحدہ اور نیٹو [۱۹۴۹ء۔ معاہدہ شمالی اوقیانوس] کو سربوں کے خلاف ہتھیار استعمال کرنے کی اجازت دی۔ اس منافقت کا کوئی جواز تو نہیں' پھر بھی یہ قابلِ فہم ہے' لیکن خود بوسنیا کے لوگوں کو اپنے دفاع سے روکنے کا کیا جواز ہے' یہ کس طرح قابلِ فہم ہے؟ یہ سوال پھر پیدا ہوتا ہے کہ کیا مغرب واقعی بوسنیا کے مسلمانوں کی خوں ریزی روکنا چاہتا تھا؟ کیا اسے واقعی بوسنیا کی سالمیت کی حفاظت مطلوب تھی؟ ہمیں یقین ہے کہ نہیں۔ بوسنیا میں جو کچھ ہوا' مغرب کے عزائم اور منصوبوں کے عین مطابق ہوا۔ برطانوی وزیر دفاع نے کہا: اسلحے پر بندش کا خاتمہ تو بدترین حل ہے ___ پوچھا گیا کہ کیوں؟ جواب میں دل کا راز زبان پر آ ہی گیا: ''پھر کنٹرول ہمارے ہاتھ سے نکل جائے گا''۔[۵] گویا پھر بوسنیا میں ہم وہ کچھ نہیں کر پائیں گے جو ہم کرنا چاہتے ہیں۔

مغربی طاقتوں کے لیے مشکل یہ ہو گئی کہ ان کے اندازوں کے برعکس' سرب ''نااہل'' نکلے' بوسنیا سخت جان ثابت ہوا' اس کو جلد ختم کرنا ممکن نہ ہوا۔ نتیجہ یہ کہ انھیں' ساری بے شرمی کے باوجود اپنے ''مہذب'' اور ''انسانی حقوق'' کے علم بردار ہونے کی لاج رکھنے کے لیے مسلسل کچھ نہ کچھ کرنا پڑا۔ یہی ان پر سخت گراں گزرا۔

اسلحے کی فراہمی کے معاملے ہی میں نہیں' ہر معاملے میں مغربی ممالک کھلم کھلا عیسائی سربیا کی حمایت اور مسلم بوسنیا کی مخالفت میں سرگرم رہے۔ وہ زیادہ سے زیادہ اس بات کے

۵- روزنامہ The Nation' لاہور' ۲۴ مارچ ۱۹۹۳ء

لیے تیار رہے کہ مسلمانوں کو ریڈ انڈینوں کی طرح کوئی ''ریزرویشن'' یا افریقہ کے کالوں کی طرح کوئی ''لیسوتھو'' (Lesotho) مل جائے' اور وہ اس پر قانع ہو جائیں۔

جھوٹ پر جھوٹ

دنیا کی آنکھوں میں دھول جھونکنے کے لیے وہ ایک کے بعد ایک جھوٹ گھڑتے رہے' اور اسے زور و شور سے پھیلاتے رہے۔ عملاً ان کا منصوبہ یہ رہا کہ سربوں کی درندگی کی طرف سے چشم پوشی کی جائے اور اس پر پردہ ڈالا جائے۔ ظالم اور مظلوم کو برابر ثابت کیا جائے۔ بوسنیا کو مجبور کیا جائے کہ وہ سربیا کی جانب سے ''مسلم نسلی تطہیر'' اور نام نہاد فتوحات کے نتائج تسلیم کر لے' نسلی بنیادوں پر تقسیم پر راضی ہو جائے' ورنہ مکمل خاتمے کا انجام بھگتنے کے لیے تیار رہے۔ انھی اہداف کے حصول کے لیے' وہ سربوں سے بڑھ کر' سربوں کے مفاد میں جھوٹا پروپیگنڈا کرتے رہے۔

سربوں کی جانب سے بوسنیائی مسلمانوں کے 'نسلی صفایا' بچوں' بوڑھوں اور جوانوں کے بے تحاشا قتل اور عورتوں اور بچیوں کی عصمت دری' ان کے کیمپ اور ان میں ہڈیوں کے رینگتے سسکتے ڈھانچے پہلی دفعہ دنیا کی آنکھوں کے سامنے اگست ۱۹۹۲ء میں ٹی وی اسکرین پر آئے۔ کیا میونخ سے ایک گھنٹے اور پیرس سے دو گھنٹے کی مسافت پر واقع ہونے والی ان بہیمانہ کارروائیوں سے امریکا' برطانیہ اور فرانس جیسے ممالک کی انٹیلی جنس کے ذرائع بے خبر ہو سکتے تھے؟ ہرگز بھی نہیں۔

لیکن یہ سب ممالک جان بوجھ کر خاموشی اختیار کیے ہوئے تھے۔ جب دنیا میں شور مچا تو امریکی وزیر خارجہ جیمز بیکر نے اسے محض ''یورپ کے قلب میں ایک سنگین انسانی مسئلہ'' قرار دیتے ہوئے صرف امدادی کوششوں پر زور دیا' ان مظالم کو روکنے کے لیے کسی مدد یا کارروائی پر نہیں۔ ساتھ ہی یہ بھی کہا کہ ''جب تک سارے ذرائع آزمانہ لیے جائیں' قوت استعمال نہ

ہوگی''۔ امریکی صدر [۹۳-۱۹۸۹ء] جارج بش سینیر نے ان مظالم کو ''انتقام در انتقام'' اور ''صدیوں پرانی دشمنیوں کا ایک نہایت الجھا ہوا نتیجہ'' قرار دیا۔ لیکن صدر بش نے نہ یہ کہا کہ مظالم ختم کیے جائیں' نہ یہ کہ کیمپ بند کیے جائیں' بلکہ صرف ''کیمپوں تک ریڈ کراس کی رسائی'' کی درخواست کی۔ اقوام متحدہ کے انسانی امداد کے ادارے کے سربراہ نے کہا: ''ہاں' کچھ ناخوش گوار حالات ضرور پائے جاتے ہیں''۔

مظلوم مسلمانوں کو ظالم سربوں کا ہم پلہ ثابت کرنے کے لیے 'مہذب مغرب' کے بڑے بڑے لوگوں کو کچھ عار نہیں۔ برطانوی کمانڈر جنرل روز (Rose) نے 'بی بی سی کے پانوراما پروگرام میں' گورازدے کے چند جلے ہوئے مکانوں کو دکھاتے ہوئے کہا: ''یہاں سے مسلمانوں نے بارہ ہزار پانچ سو سربوں کا نسلی صفایا کیا''۔ تاہم' اقوام متحدہ کے سارے ریکارڈ اور یورپ کے تمام قابلِ ذکر اخباروں میں ایسے کسی واقعہ کا ذکر نہیں۔ لیکن ۱۹۹۱ء کی مردم شماری کے ریکارڈ کے مطابق پورے گورازدے ضلع میں دس ہزار سرب تھے' شہر میں مشکل سے پانچ ہزار ہوں گے' پھر جنرل روز یہ من گھڑت جھوٹ کیسے بول دیا؟ پھر ایک جنرل کا بیان اور بی بی سی کی آواز' یہ ''کلامِ مقدس'' ہر ایک نے دہرایا۔ ایک سینیر امریکی سفارت کار کو برطانوی وزارتِ خارجہ میں معلومات فراہم کی گئیں' تو اس نے حیرت زدہ ہوکر کہا: ''اتنی زبردست فراہمی معلومات کا ایک ہی ہدف تھا: زیادہ سے زیادہ الزام مسلمانوں پر رکھا جائے''۔

ایک تکنیک یہ بھی خوب استعمال کی گئی کہ جو مظالم سرب کر رہے ہیں' ان کو بھی مسلمانوں کے سر ڈال دیا جائے۔ جب اقوام متحدہ کے فرانسیسی دستے کی حفاظت میں سفر کرنے والے' بوسنیا کے مسلمان نائب وزیراعظم حاکیہ ترلیلیک کو سربوں نے گولی مار دی' تو تحقیقاتی رپورٹ میں اس کا الزام بھی مسلمانوں پر رکھا گیا کہ انھوں نے ''تشویش کا ماحول پیدا کر دیا تھا''۔ سرائیوو میں سربوں نے ۱۹۹۲ء میں ایک بم روٹی خریدنے والوں پر' اور ۱۹۹۴ء میں ایک بم بازار میں پھینکا۔ کسی شہادت کے بغیر اقوام متحدہ کے پہلے کمانڈر' کینیڈا کے جنرل

میکنزی نے ان واقعات کا کھلم کھلا الزام اسی مظلوم بوسنیا پر لگا دیا۔

اور بھی بے شمار جھوٹ تھے' جو بڑے شدومد سے پھیلائے گئے۔

پہلا یہ کہ ''بلقان میں تو خوں ریزی ہوتی ہی رہتی ہے''۔ حالانکہ یورپ میں جتنی خوں ریزی برطانیہ' فرانس اور جرمنی کے مابین ہوئی ہے' اس کی مثال تو پوری انسانی تاریخ میں نہیں ملے گی۔ پہلی جنگ عظیم میں ۸۵ لاکھ لوگ ہلاک اور دو کروڑ زخمی و معذور ہوئے' جب کہ دوسری جنگ عظیم میں چار کروڑ ۳۰ لاکھ ہلاک ہوئے۔[6]

دوسرا یہ کہ وہاں تو ''پرانی نسلی عداوتیں ہیں جو بار بار بھڑکتی رہتی ہیں''۔ حالانکہ بوسنیا میں تینوں گروہ صدیوں سے صلح و آشتی سے رہتے چلے آئے تھے' اپنی رواداری اور متنوع معاشرے کے لحاظ سے یہ یورپ کے جہنّم میں ایک منفرد جنت اور اس کے ماتھے کا جھومر تھا۔ پھر وہاں' مسلمان' سرب اور کروٹ نسلوں کے درمیان کوئی نمایاں فرق بھی نہیں۔

تیسرا یہ کہ ''بوسنیا نام کا نہ کبھی ملک رہا ہے' نہ قوم۔ اس کو آزاد بننے کا شوق کیوں چرایا' اسے یہ حق کیسے مل سکتا ہے؟'' ___ نیویارک ٹائمز کے سابق ایڈیٹر روزی نتھال (Rosenthal) نے لکھا: ''مسلمان لیڈروں نے ایک ایسے بوسنیا کی آزادی کا اعلان کیا ہے جس کا بحیثیت قوم کبھی وجود نہیں رہا' جہاں مسلمان کبھی اکثریت میں نہیں رہے' جہاں کوئی بوسنیائی نہیں بستے''۔[7]

برطانیہ کے مؤرخ' نویل میلکم (Noel Malcolm) نے اپنی تحقیقی کتاب *Bosnia: A Short History* [ناشر: میک ملن] میں مغربی حکومتوں کے اس سارے کذب و افترا کا پردہ مکمل طور پر اور موثر انداز میں بالکل چاک کر دیا ہے۔

۶- تاہم مغرب کی معروف خبر رساں ایجنسی رائٹر (Reuter) کے مطابق دوسری جنگ عظیم میں ۵ کروڑ ۴۸ لاکھ اور ۸۰ ہزار لوگ موت کے گھاٹ اُترے۔ (۹ مئی ۲۰۰۵ء)

۷- روزنامہ نیویارک ٹائمز' ۱۶ اپریل ۱۹۹۳ء

مغربی طاقتیں، بوسنیا کے خلاف سربیا کی وحشیانہ جارحیت، نسلی صفائی، قتل عام، عصمت دری اور ۷۰ فی صد بوسنیا پر سربیا کے قبضے کو محض ایک ''خانہ جنگی'' قرار دینے پر تلی ہوئی ہیں۔ اس کا مقصد ظالم و مظلوم کو مساوی رکھنے اور جارحیت کے زہر کو مستقل جواز دینے کے علاوہ اور کیا ہوسکتا ہے۔ چنانچہ مغربی حکمرانوں کی ''صلح جوئی'' کی ساری کوششوں کا ہدف صرف یہی رہا ہے: ''بوسنیا کو سربوں اور کرواٹیوں کے درمیان تقسیم کر دیا جائے، مسلمان چند علاقوں میں محفوظ کر دیے جائیں''۔ امریکی اور برطانوی فارمولوں کی غرض و غایت یہی رہی ہے۔

تکلیف دہ مشورے

اپریل ۱۹۹۳ء میں امریکی وزیر خارجہ مسٹر وارن کرسٹوفر نے بوسنیا کے صدر کے نام ایک خط میں زور دیا کہ ''وہ بوسنیا کی وہی تقسیم قبول کرلیں جس پر سربیا کے صدر مائلوشیوچ (Milasovich) اور کروشیا کے صدر ٹج مین (Tudjman) اتفاق کر چکے تھے۔ جس پر صلح کے مشن پر مامور برطانیہ کے ڈاکٹر اوون اور ناروے کے سٹولٹن برگ مہر تصدیق ثبت کر چکے تھے''۔ امریکی وزارت خارجہ کے چند باضمیر افسران نے اس موقف کے خلاف شدید احتجاج کیا، چار افراد نے استعفے بھی دیے، لیکن ۱۹ اگست کو یہ خط چلا گیا۔ اپریل ۱۹۹۳ء میں امریکی صدر بل کلنٹن نے نسل کشی اور بوسنیا کی تقسیم کے خلاف آواز اٹھائی کہ یہ غیر انسانی عمل ہے، یہ غلط اقدام ہے، ہمیں اس کے خلاف کھڑے ہونا چاہیے۔ لیکن جب ستمبر میں بوسنیا کے صدر علی جاہ عزت بیگوچ [م: ۱۹ اکتوبر ۲۰۰۳ء] ان سے ملے، تو صدر کلنٹن کا پیغام بھی یہی تھا: ''جو کہا جا رہا ہے مان لو''۔

یہ بات بھی اہم ہے کہ تینوں بڑوں کے جو وزرا اور افسران اس مسئلے کے حل پر لگے ہوئے تھے، ان سب کے سربیا کے لیڈروں سے گہرے ذاتی تعلقات تھے۔ بوسنیا کے بحران کے

وقت امریکی صدر جارج بش کی انتظامیہ میں ایگل برجر نائب وزیرخارجہ تھے' یہ صاحب ۱۹۷۰ء کے عشرے کے اواخر میں بلغراد میں امریکی سفیر ہوا کرتے تھے' اور مائلوشیوچ کے گہرے دوست۔ ریٹائرمنٹ کے بعد وہ ہنری کسنجر ایسوسی ایٹس میں شامل ہوگئے اور اس فرم کے صدر بھی بن گئے۔ اس فرم کو سربیا کے بڑے بڑے منصوبے ملا کرتے تھے۔ ایگل برجر' یوگو امریکا (Yogo America) کے ڈائرکٹر بھی تھے' جو سربیا کے کارساز کارخانے کی امریکی شاخ تھی' جب کہ سکوکرافٹ' نیشنل سیکورٹی کے ایڈوائزر تھے۔ یہ بھی ۱۹۶۰ء میں بلغراد میں امریکا کے ہوائی اتاشی تھے' اور سربیا کے لیڈروں کے گہرے دوست۔

بوسنیا پر سربیا کے حملے کے بعد برطانوی وزیراعظم [۱۹۹۰-۹۷ء] جان میجر نے لندن میں کانفرنس بلائی' تاکہ ایک ایسی ''پالیسی'' کو عملی جامہ پہنایا جائے' جس کا نہ اعلان ہوا تھا اور نہ کوئی مباحثہ۔ اس کانفرنس میں ایگل برجر نے کلیدی خطاب کیا۔ انھوں نے بھی صدر بش کی طرح تمام وقت' تاریخ میں سربوں کے بے پناہ مصائب کا رونا رویا اور اس 'کش مکش' کو 'قدیم' اور 'الجھا ہوا' قرار دیا' مگر نہ بوسنیا کا ذکر کیا' نہ اس کے بقا کی امید کا کوئی اظہار کیا۔

حقیقی ہدف' مسلم ریاست

مغربی حکمرانوں کی جانب سے بوسنیا میں اتنی شرمناک اور اتنی منظم' مسلم دشمنی اور مسلم کشی کے کردار کی تہہ میں اصل سبب کیا ہے؟ وہ خود تو کھل کر کہتے نہیں ــــــ کہ کہیں ان کے دعویٰ تہذیب پر داغ نہ لگ جائے ــــــ لیکن یہ 'راز' کوئی راز نہیں رہا ہے۔ بلاشبہہ سربوں کا استدلال اور موقف ہی ان کے دل کی بھی آواز ہے۔

بوسنیا کے سرب لیڈر کراڈزچ (Karadzic) نے ایک انٹرویو میں کہا ہے:

ہمارا جنگی مقصد' یورپ کو بوسنیا میں ایک مسلمان ریاست کے خطرے سے بچانا

ہے۔ہمیں یقین ہے کہ کسی بھی مسلم ریاست کا یورپ میں وجود' مسلم دہشت گردی کا مرکز بنے گی۔[8]

چنانچہ سرب قوم پرست دہشت گرد بالعموم یہ سمجھتے ہیں' اور برملا کہتے ہیں:

ہم اسلام' مسلمان اور ترک کے خلاف یورپ کی جنگ لڑ رہے ہیں۔ہم عیسائیت کی جنگ لڑ رہے ہیں۔ہم آخری صلیبی جنگ لڑ رہے ہیں۔ بوسنیا میں مسلم ریاست قائم ہوگئی تو انتہا پسند' دہشت گرد' بنیاد پرست 'مجاہدین' سارے یورپ پر چھا جائیں گے۔

اسی بات کو فوچا کی ایک سرب عورت نے عالمی خبر رساں ایجنسی رائٹر کے نامہ نگار سے ان الفاظ میں کہا: وہ رہا میدان' یہاں سے جہاد شروع ہونا تھا۔فوچا ایک اور مکہ بنتا' ان سربوں کی فہرستیں بن گئی تھیں جنھیں موت کے گھاٹ اتارا جاتا۔ان میں دو میرے بیٹے بھی تھے' جنھیں سور کی طرح مارا جاتا۔[9]

فرانسیسی حکومت کے ایوانوں میں بھی اس کی صدائے بازگشت سنی جا سکتی تھی۔

ہفت روزہ نیویارکر کے جان نیوہاؤس سے ایک اعلیٰ سفارت کار نے کہا:

ہم نہ صرف جنگ کو پھیلنے سے' بلکہ یورپ میں ایک مسلمان ریاست کے قیام کو بھی روکنا چاہتے ہیں' جو جلد ایک خوش حال' جنگ جو' اور ہر جگہ لڑائی جھگڑے کا مرکز بن جائے گی۔[اس لیے بوسنیا کا نام و نشان مٹنا چاہیے' اس طرح کہ مستقبل میں ایسے کسی خطرے کا اندیشہ بھی باقی نہ رہے] ہم مسلمانوں کو' فلسطینیوں کی طرح' یورپ میں تتر بتر بھی نہیں ہونے دینا چاہتے [کہیں وہ ایک خطرہ نہ بن جائیں' اس لیے مسلمانوں کی نسل کو بھی ختم کرنا ضروری ہے]۔تم سوچ نہیں سکتے ہمارے مفادات سرب مفادات سے کتنے قریب ہیں۔ہمیں سربوں کے بارے میں کوئی پریشانی

۸- روزنامہ نیویارک ٹائمز' ۱۸ جولائی ۱۹۹۳ء

۹- نویل میلکم' Bosnia: A Short History' (میک ملن' صفحات: ۳۴۰) ص ۲۴۷

نہیں' مسلمانوں کے بارے میں ہے۔[10]

یہی بات جون ۱۹۹۳ء میں' روس کے صدر [۹۱-۱۹۹۹ء] بورس یلسن کے مشیر برائے امور بلقان' ولادی میر فاکوف نے ییل (Yale) یونی ورسٹی میں تقریر کرتے ہوئے کہی:

سربوں کی چند' کارروائیاں' قابلِ افسوس ضرور ہیں' لیکن دراصل تو دنیا کو ـــــ اور یورپ کو ـــــ دھوکے باز' ناقابلِ اعتماد اور دوغلے مسلمانوں پر نگاہ رکھنا چاہیے۔ بوسنیا' یورپ میں ترک اور البانوی امپریلزم کے لیے ایک پُل ثابت ہوگا۔[11]

کہاں وہ نہتا بوسنیا کہ جس کے ۷۰ فی صد علاقے پر سرب قبضہ کر چکے ہیں' جس کو سربیا کے مائلوشیوچ اور کروشیا کے ٹج مین' شدید دشمنی کے باوجود' باہم تقسیم کر کے ہڑپ کر جانے کا معاہدہ کر چکے ہیں۔ بوسنیا جس کو ختم کرنے پر ساری مغربی طاقتیں تلی ہوئی ہیں' اور کہاں یورپ میں ترک [مسلم] امپریلزم کا امکان! لیکن ماضی اور مستقبل کی یہ تعبیر مغرب کے دماغ پر اس طرح نقش ہے کہ چودہ سو سال گزر جانے کے باوجود یہ نقش مدہم نہیں پڑا ہے۔

دشمن سے خیر کی توقع؟

افسوس اور تعجب ہے تو اس بات پر' کہ بوسنیا کے مسلمان لیڈروں نے' سلووینیا اور کروشیا کی طرح' اپنی آزادی کا اعلان کرنے سے پہلے' اپنے دفاع کی کوئی بھی تیاری نہیں کی تھی' جس کے باعث وہ ''لڑتے ہیں اور ہاتھ میں تلوار بھی نہیں'' کا مصداق بن گئے۔ انھوں نے اپنی حفاظت اور بقا کے لیے مغرب' امریکا' یورپ' اقوام متحدہ' عالمی ضمیر' یورپ کی تہذیبی اقدار اور انسانیت پر 'توکل' کیا' جو سب کے سب تارِ عنکبوت ثابت ہوئے۔

وہ یہ بھی یاد نہ رکھ سکے کہ مغرب نے آج تک کوئی جنگ کسی مظلوم کی امداد یا کسی

۱۰- New Yorker، ۳ جولائی ۱۹۹۳ء

۱۱- روزنامہ واشنگٹن پوسٹ، ۴ جون ۱۹۹۳ء

اخلاقی اصول کی خاطر نہیں لڑی ہے۔ دوسری جنگ عظیم نہ پولینڈ کے غم میں تھی' نہ یہودیوں کو بچانے کے لیے' نہ جمہوریت اور آزادی کی خاطر۔ مکھی' مکڑی کے جال میں پھنس گئی اور اب مادی اندازوں کے مطابق اس کا زندہ بچ نکلنا ممکن نہیں۔ لیکن اللہ کی تدبیر کے آگے کس کی تدبیر ٹھیر سکتی ہے' وہ اس جالے کو توڑ سکتا ہے' اسی جالے کو نجات کا ذریعہ بھی بنا سکتا ہے' وَمَا ذٰلِکَ عَلَی اللّٰہِ بِعَزِیْزٍ [ابراھیم ۱۴:۲۰] ''ایسا کرنا اُس پر کچھ بھی دشوار نہیں ہے۔

بوئے خوں

مغرب نے جو مسلم کشی کی روش اختیار کی ہے' اس میں تعجب کی کوئی بات نہیں۔ آج کے حکمراں کل کی ''تہذیب'' کے وارث ہیں۔ اس ''تہذیب'' کے پور پور سے خون آشامی ٹپکتی ہے' اس نے اپنے مفادات کے لیے آبادیوں کی آبادیوں کو نیست و نابود کر دیا' اور ضمیر میں ادنیٰ سی بھی خلش محسوس نہ کی۔ یہ یورپی ہی تھے جنھوں نے ۶۰ لاکھ سے بھی زائد فلسطینیوں کو دہشت گردی کا نشانہ بنایا' ان کا خون بہایا' انھیں گھر بدر کر کے تتر بتر کر دیا اور ان کے سارے حقوق غصب کر لیے۔

یہ یورپی ''مہاجر'' تھے جنھوں نے امریکا کے [حقیقی باشندوں] ریڈ انڈینوں کا نسلی استیصال کیا' ان کے اموال و املاک کو چھین لیا' اور ان کو ''محفوظ علاقوں'' [؟] میں دھکیل کر بند کر دیا۔ انھوں نے ہی لاکھوں سیاہ فام باشندوں کو افریقہ سے پکڑ کر غلام بھی بنایا اور زندہ بھی جلایا۔ انھی یورپیوں کے اسلاف نے لاکھوں افراد کو زندہ جلا کر اپنے فرقہ وارانہ اختلافات کی بھینٹ چڑھایا۔

ان کے اولین اسلاف رومن حکمران تھے: انھوں نے کارتھیج فتح [۱۴۶ ق م] کیا تو چھے دن تک قتل عام ہوتا رہا اور پورے شہر کو خاکستر کر دیا۔ بیت المقدس فتح [۶۴ ق م] کیا تو ۱۰ لاکھ سے زائد یہودی تہ تیغ کر دیے' اور ایچ جی ویلز کے مطابق: ''وہ اپنے دشمنوں کے

بارے میں اتنے بے محابا اور جوش و خروش سے جھوٹ بولتے تھے کہ آج کا پروپیگنڈسٹ بھی شرما جائے...... جب وہ کسی قوم کے خلاف الزامات عائد کرتے تھے تو یہ درحقیقت ان کے قتل عام کا پیش خیمہ ہوتا تھا" (اور آج بوسنیا میں بالکل یہی کہانی دہرائی جارہی ہے)۔

ہم گڑے مردے اُکھاڑ کر نفرت کا الاؤ نہیں سلگانا چاہتے۔ ہم چاہتے ہیں کہ انسانوں کے درمیان امن و آشتی اور محبّت عام ہو۔ ہم چاہتے ہیں کہ سارے انسان ایک خدا کے بندے بن کر اُس کا خاندان بن کر ساتھ رہیں۔ ہم مغرب کو یہی پیغام دینا چاہتے ہیں اور اس کے ساتھ محاذ آرائی کے بجائے خوش گوار تعلقات کے خواہاں ہیں۔

ہم سمجھتے ہیں کہ دنیا بھر کے مسلمانوں کو بوسنیا کے مسلمانوں کی طرح حقائق سے آنکھیں بند نہیں کرنا چاہییں۔ انھیں تلخ تہذیبی حقائق سے واقف ہونا چاہیے۔ اگر وہ تاریخ سے ناواقف ہیں تو انھیں کم سے کم آج کے بوسنیا سے ضرور سبق سیکھنا چاہیے۔ انھیں انسانیت کے نام پر مغرب کے اہلِ ضمیر کے ساتھ یک جہتی ضرور استوار کرنا چاہیے۔ لیکن مغرب کے معبودانِ باطل سے جھوٹی امیدیں نہیں وابستہ رکھنا چاہییں، انھیں اِدْفَعْ بِالَّتِیْ ھِیَ اَحْسَنُ [حٰم السجدۃ ۴۱:۳۴] "تم بدی کو اس نیکی سے دفع کرو جو بہترین ہو"۔ اور وَاِنْ جَنَحُوْا لِلسَّلْمِ فَاجْنَحْ لَهَا وَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ [الانفال ۸:۶۰] "اور اے نبیؐ، اگر دشمن صلح و سلامتی کی طرف مائل ہیں تو تم بھی اس کے لیے آمادہ ہو جاؤ اور اللہ پر بھروسا کرو" کے ساتھ ساتھ وَاَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّةٍ [الانفال ۸:۶۱] "جہاں تک تمھارا بس چلے، زیادہ سے زیادہ طاقت مہیا رکھو"۔ اور حَرِّضِ الْمُؤْمِنِيْنَ عَلَى الْقِتَالِ [الانفال ۸:۶۵] "مومنوں کو جنگ پر اُبھارو" کی ہدایت پر بھی کان دھرنا چاہییں۔ ورنہ وہ بھی بوسنیا کے مسلمانوں کی طرح نہتے کر کے، ہاتھ پیچھے باندھ کر مارے جائیں گے اور ان کا پورا جسد بھی چھلنی اور ٹکڑے ٹکڑے کر دیا جائے گا۔ [اکتوبر ۱۹۹۵ء]

❑❑❑

یہ ایک زلزلہ

یہ ۱۷ جنوری ۱۹۹۵ء کا دن تھا۔

ابھی صبح کی روشنی نمودار ہونے میں تھوڑی ہی دیر تھی' کہ پانچ بج کر ۴۶ منٹ پر اچانک زمین تھرتھرائی' ایک جھٹکا لگا' اور صرف بیس سیکنڈ میں زلزلہ جاپان کے انتہائی ماڈرن' خوب صورت اور آباد و خوش حال شہر ''کوبے'' کو کھنڈرات کا ڈھیر بنا گیا۔ روشنی ہونے سے پہلے' آناً فاناً شہر ہلاکت اور تباہی کے گہرے اور طویل اندھیروں میں ڈوب گیا۔ پانچ ہزار سے زائد آدمی پلک جھپکنے میں موت کی آغوش میں چلے گئے۔ ۵۰ ہزار سے زائد گھر اور بلند و بالا عمارتیں پتوں کی طرح بکھر گئیں۔ ٹکنالوجی کی شہ کار سڑکیں ٹوٹ پھوٹ کر رہ گئیں' اور آہنی ریلوے لائنوں کو جیسے کسی نے توڑ مروڑ کر رکھ دیا۔

ہم جاپان سے مرعوب ہیں' اس کی معاشی ترقی نے ہماری آنکھوں کو چندھیا دیا ہے' ہم جاپان جیسا بننے کی آرزو میں سلگتے رہتے ہیں' (اگرچہ ہمیں ان اخلاقی صفات کا پتا ہے' نہ جستجو' جنھوں نے جاپان کو ''جاپان'' بنایا ہے) حالانکہ وہ ہم سے بہت دُور واقع ہے' اور اس سے ہمارا ربط برائے نام ہے۔ کوئی تعجب کی بات نہیں اگر ہم اس قیامت کی تباہی پر ایک نگاہ غلط انداز ڈال کر گزر گئے' اور یہی سوچتے رہے کہ ہمیں اس سے' یا اس جیسے دوسرے حوادث سے' کیا سروکار۔

قدرتی آفات میں سبق

اجتماعی آفات وحوادث انسان کی زندگی کا ایک مستقل اور لازمی حصہ ہیں۔ یہ آفات سماوی ہوں' جیسے زلزلے' طوفان' سیلاب' سائیکلون' وبائیں اور قحط یا انسان کے اپنے ہاتھوں لائی ہوئی' جیسے باہمی بغاوت وعداوت' جنگ وخوں ریزی' ظلم وفساد اور دلوں کی قساوت ـــــ قرآن مجید نے یہ واضح کر دیا ہے کہ ان کا تعلق اجتماعی اخلاق واعمال سے ہے۔ لیکن یہ ہمیشہ صرف عذاب کا کوڑا بن کر ہی نہیں آتیں' یہ خالق فطرت کے اسکول کی معلّم بھی ہیں۔

سورہ المرسلات میں ان ہواؤں کی طرف متوجہ کیا گیا ہے' جو خدا کے حکم پر تیز وتند ہو کر بستیوں کا نام ونشان مٹا دیتی ہیں' ریت کے پہاڑوں کو بہا لے جاتی ہیں' پہاڑوں کی طرح موجیں اُٹھا کر لاکھوں لوگوں کو چشم زدن میں غرقِ آب کر دیتی ہیں۔ پھر فرمایا گیا ہے: فَالْمُلْقِيٰتِ ذِكْرًا ۝ عُذْرًا اَوْ نُذْرًا ۝ [المرسلات ۷۷:۵-۶]'' پھر (دلوں میں خدا کی) یاد ڈالتی ہیں عذر کے طور پر یا ڈراوے کے طور پر''۔ اس طرح یہ ہوائیں تذکیر وتعلیم کا سامان کرتی ہیں۔ غافلوں پر اتمامِ حجت کرتی ہیں' ان کو جگاتی ہیں' کان ودل رکھنے والوں کو ہوشیار اور آگاہ کرتی ہیں۔

جن کو فَسِيْحُوا فِي الْاَرْضِ [التوبہ ۹: ۲] کی ہدایت کی گئی ہے' تاکہ وہ مدرسۂ فطرت کے ان معلّموں سے استفادہ کریں۔ آج کا میڈیا ان معلّموں کو گھر بیٹھے ان تک پہنچا دے تو وہ اپنا شمار ان لوگوں میں کیوں کرائیں' جو ''زمین اور آسمانوں میں کتنی ہی نشانیاں ہیں جن پر سے یہ لوگ گزرتے رہتے ہیں' اور ذرا توجہ نہیں کرتے'' [یوسف ۱۲:۱۰۵]۔

اس زلزلے پر توجہ

کوبے کا زلزلہ کوئی انوکھا یا غیر معمولی واقعہ نہیں تھا۔ زلزلے آتے ہی رہتے ہیں۔ اندازہ ہے کہ زمین کو ایک سال میں ایک لاکھ چھوٹے بڑے جھٹکے لگتے ہیں۔ گذشتہ ۲۵ سال ہی

میں کوبے کے زلزلے سے کہیں زیادہ تباہ کن زلزلے آئے ہیں۔ ۱۹۹۳ء میں مہاراشٹر (بھارت) میں ۳۰ ہزار' ۱۹۹۰ء میں ایران میں ۴۰ ہزار' ۱۹۸۸ء میں آرمینیا میں ۵۵ ہزار' ۱۹۷۶ء میں چین میں دو لاکھ ۴۲ ہزار اور ۱۹۷۰ء میں پیرو میں ۶۷ ہزار انسان زلزلوں میں ہلاک ہوئے۔

لیکن جس طرح کوبے کے زلزلے کی تصاویر اور تفصیلات ساری دنیا کی' کم سے کم مغربی دنیا کی' نگاہوں کا مرکز بن گئیں' اس طرح کسی دوسرے زلزلے کی نہ بنیں' سوائے گذشتہ سال [۱۹۹۴ء] لاس انجلز (امریکا) کے زلزلہ کے۔ یقیناً اس میں میڈیا کی روز افزوں قوت کو بڑا دخل ہے۔ لیکن میڈیا کی دلچسپی کی بھی اصل وجہ یہ ہے کہ یہ آفت ایک ماڈرن شہر میں آئی اور اس میں مرنے والے ترقی یافتہ اور مغرب زدہ انسان تھے' جب کہ دوسری آفتوں کا شکار پس ماندہ علاقے' غیر ترقی یافتہ اور غیر مغربی لوگ تھے۔ اس رویے کی تہہ میں تصور یہ ہے کہ لاس انجلز اور کوبے جیسے شہر اس سائنس و ٹکنالوجی کی کارفرمائیوں اور کامرانیوں کا مظہر ہیں' جس سائنس کے بارے میں یہ ایمان ہے کہ وہ ہر چیز کی توجیہہ کر سکتی ہے' ہر پیش آنے والے واقعہ کی خبر دے سکتی ہے' ہر مشکل میں کارگر اور ہر مسئلے کا حل ہے' ہر کام کر سکتی ہے یا کر سکے گی' گویا: فَعَّالٌ لِّمَا يُرِيدُ ۝ [ھود ۱۱:۱۰۷] جو چاہے کرے ہے۔

کوبے کے زلزلے جیسے واقعات سائنس کی اَن دیکھی' لامتناہی قوت پر اس ایمان کو جڑوں سے ہلا دیتے ہیں' اور اس کے تار و پود بکھیر دیتے ہیں۔ جو رب کے بجائے اسباب پر ایمان رکھتے ہیں۔ وہ اسباب کی شکست و ریخت دیکھتے ہیں تو زیادہ ہی حیرت زدہ ہو جاتے ہیں' زیادہ ہی صدمے سے دوچار ہوتے ہیں۔ مغرب کا انسان بھی مجبور ہو جاتا ہے [illegible] کے تھے' نوٹس لے' سوچے اور اپنی بے بسی اور محتاجی کا اعتراف کرلے۔ خواہ چند لمحوں ہی کے لیے سہی اور خواہ دماغ اسی کا قائل رہے کہ "اچھے اور برے دن تو تاریخ میں ہمیشہ ہی آتے رہے ہیں" [الاعراف ۷:۹۵]۔ ان کا کسی اَن دیکھی بالاتر قوت کے ارادے' تدبیر' قدرت اور حکمت سے کیا تعلق۔ یہ اندھے طبیعی قوانین کا نتیجہ ہیں' ان سے گھبرا کر کسی اَن دیکھی قوت کے

آ گے جھک جانا اور تضرع کرنے لگنا' نفسی کمزوری کی علامت ہے۔

الاماں الاماں

کوبے کے زلزلہ کو قیامت کے زلزلہ (زلزلة الساعة) سے کیا نسبت' مگر ایک مغربی نامہ نگار کے الفاظ میں' تباہی کے مناظر ''دوسری دنیا کے قیامت کے مناظر کی طرح عجیب وغریب اور خوف ناک ودہشت ناک تھے''۔ رات بھر لوگ نیند اور رنگ رلیوں میں پڑے رہے' مگر منہ اندھیرے چشم زدن میں صفایا ہوگیا: ''رات کو وہ سوئے پڑے تھے کہ تمھارے رب کی طرف سے ایک بلا اس باغ پر پھر گئی' اور اس کا ایسا حال ہو گیا جیسے کٹی ہوئی فصل ہو'' [القلم ۶۸:۱۹-۲۰]۔ ہوائی بم باری اور میزائلوں کی بارش ہو' زلزلہ اور سائیکلون ہو' شب آخر ہی عموماً وقت موعد ہوتا ہے اور: ''صبح ہوتے اب دیر ہی کتنی ہے!'' [ھود ۱۱:۸۱]۔ لیکن لوگ لمبی تانے پڑے رہتے ہیں' خوابِ غفلت میں مدہوش' گویا وہ گھڑی اب ان پر آئے گی ہی نہیں۔

دیو پیکر عمارتیں جدید ترین معیاراتِ تحفظ کے مطابق بنائی گئی تھیں' لیکن ان کے تلے سے زمین سرک گئی' جو بہتی' بکھری ریت (كثيبًا مهيلًا) بن گئی' اور عمارتیں زمین بوس ہوگئیں۔ زمین خود دو' دو میٹر اُونچے ریت کے فواروں کی صورت میں بہہ نکلی۔ جن عمارتوں کا کچومر زلزلے کے جھٹکے نے نکالا' وہ ایسی ہوگئیں جیسے'' کاغذی گلاسوں (كطي السجل) کو توڑ مروڑ کر کوڑے کرکٹ کی طرح ڈال دیا گیا ہو''۔ زمین نے ابھی ہلنا بند نہ کیا تھا کہ ہر طرف آگ کے شعلے بھڑک اُٹھے' گیس کے پائپ پھٹ گئے' اور آگ پھیلتی گئی۔

۲۰ سیکنڈ پہلے جن لاکھوں لوگوں کے پاس سازوسامان سے آراستہ وپیراستہ گھر تھے اب وہ بے گھر تھے' سڑک پر پناہ کی تلاش میں سرگرداں تھے' پیٹھوں پر سامان لدا ہوا تھا' ہر طرف ملبہ بکھرا ہوا تھا' شعلے بھڑک رہے تھے' چاروں طرف پڑوسیوں اور چاہنے والوں کی لاشیں تھیں۔ جن کے پاس کھانے پینے اور پہننے کے لیے سب کچھ تھا' اب ان کو ایک وقت کا پیٹ بھر کھانا

بھی میسر نہ تھا۔ لازوال خوش حالی، سلامتی اور تحفظ کی دنیا بھسم ہوگئی۔ صرف ۲۰ سیکنڈ میں وہ ایسے ہوگئے جیسے اس شہر میں کبھی رہے ہی نہ ہوں: کَاَنْ لَّمْ یَغْنَوْا فِیْھَا [الاعراف ۷:۹۲]۔

ایک نفسیاتی حادثہ

بظاہر شک کرنے کی کوئی وجہ نہیں کہ جاپان اس دنیاوی جنت کو دوبارہ تعمیر کرلے گا۔ ۲۰ ہزار کروڑ روپے کے اخراجات کا تخمینہ ہے: اس کے پاس دولت کی کوئی کمی نہیں، ٹکنالوجی اور وسائل وذرائع کی بھی نہیں، اور حوصلوں اور عزائم کی تو فراوانی ہے، جو سب سے بڑھ کر درکار ہوں گے۔ لیکن صرف شہر اور انسان ہی نہیں ٹوٹے، ٹکنالوجی اور معیشت میں بے مثال ترقی کی، اور عروج کی چوٹیوں پر پہنچ جانے کی، جو ذہنی جنت دل و نگاہ نے بسالی تھی، اس میں بھی زلزلہ آگیا۔ ۲۰ سیکنڈ میں وہ بھی ایک سراب بن گئی، وہ بھی ٹوٹ پھوٹ گئی۔ کیا وہ اتنی ہی آسانی سے بحال ہوجائے گی؟ دانش وروں کا خیال ہے کہ یہ زلزلہ جاپان کے لیے بیسویں صدی کا سب سے بڑا نفسیاتی حادثہ ہے۔ اس ذہنی صدمے سے ایک طویل عرصے تک بحالی بہت مشکل ہے۔ لیکن دانش ور یہ بھول جاتے ہیں کہ انسان خوش حالی حاصل ہوتے ہی سب کچھ بھول جاتا ہے، سمجھتا ہے کہ سب کچھ اس کے علم اور زور بازو کا نتیجہ ہے، مصیبت تو ایک اتفاقی حادثہ تھی، جو آئی اور گزر گئی۔

جاپان زلزلوں کی زد میں ہے۔ ٹوکیو میں ہر سال ایک ہزار جھٹکے لگتے ہیں، تقریباً ۷۰ سال میں ایک بڑا زلزلہ آجاتا ہے۔ ۱۹۲۳ء میں آخری آیا تھا، جس میں ایک لاکھ ۴۳ ہزار آدمی ہلاک ہوئے تھے۔ اس حساب سے اب کسی وقت بھی وہ 'بڑے والا' (Big One) زلزلہ آسکتا ہے۔ اس کی تیاری کے لیے ہر سال یکم ستمبر کو پورے شہر میں بچاؤ اور امداد کی مشق ہوتی ہے۔ پیش بینی اور بچاؤ کی تیاریاں مکمل ہیں، ملک کے طول و عرض میں زلزلہ پیما آلات لگے ہوئے ہیں، زلزلوں کے ممکنہ خطرے کے نقشے بنے ہوئے ہیں، لیکن ان نقشوں کے مطابق

کوبے میں تو زلزلے کا بہت کم امکان تھا (لاس اینجلز میں بھی گذشتہ سال زلزلہ ایسے مقام پر آ گیا' جہاں نقشہ کے مطابق گمان بھی نہ تھا)۔ سائنس' ٹکنالوجی کی ساری ترقی اور دولت کے انبار کے باوجود ساری تیاریاں دھری رہ گئیں اور کسی تدبیر نے کام نہیں کیا۔ ۵۰ سال سے کوئی بڑا زلزلہ نہ آیا تھا' لوگ مطمئن ہو گئے تھے کہ بس اب: مَآ اَظُنُّ اَنْ تَبِيْدَ هٰذِهٖٓ اَبَدًا ۝ [الکھف ۱۸:۳۵] میں نہیں سمجھتا کہ یہ دولت کبھی فنا ہو جائے گی۔ اچانک جھٹکا لگا: ترقی' تحفظ' اطمینان کے سارے خواب چکنا چور ہو گئے۔

ہر زلزلے سے سبق سیکھے جاتے ہیں کہ آیندہ زلزلے کا مقابلہ کس طرح کیا جائے۔ سب سے زیادہ دہشت اس بڑے زلزلے کی ہے جو ٹوکیو (یا سان فرانسسکو) جیسے شہر میں کسی وقت بھی متوقع ہے۔ ایک نامہ نگار لکھتا ہے: ''سب سے بڑا سبق تو یہ حاصل ہوتا ہے کہ کوئی سبق ایسا نہیں جو ایک بڑے شہر کو Big One سے تحفظ کی ضمانت دے سکے''۔ لیکن ایسے سبق تو ہر زلزلہ دیتا ہے' اور ان سب سے بڑا زلزلہ جو فی الواقع Big One (شئی عظیم) ہوگا' اس سے تحفظ کا کیا سامان ہو سکے گا۔

کردار کا مظاہرہ

اس حادثۂ عظیم میں بھی جاپان نے اس کردار کا ثبوت دیا' جس میں دراصل اس کی ترقی کا راز پوشیدہ ہے۔

انھوں نے صبر اور خاموشی سے ہر مصیبت برداشت کر لی۔ فوراً تعمیرِ نو کا کام شروع ہو گیا۔ کوئی لوٹ مار نہیں ہوئی (جب کہ لاس اینجلز میں پہلے ہی دن پولیس نے ۲۵ وارداتیں پکڑی تھیں)' لوگ سامان اس طرح چھوڑ کر چلے گئے جیسے کوئی خطرہ ہی نہ ہو۔ کوئی ہڑبونگ نہ مچی۔ حکومت کی کارکردگی بڑی ناقص تھی' مگر کوئی فساد نہ مچا۔ لوگوں نے چونک کر کہا: ''ہم کو اپنی ترقی اور خوش حالی پر پھول نہیں جانا چاہیے' ہم تو اُدھار کے وقت پر جی رہے ہیں''۔ یوکوہاما کے

حاکمِ شہر (میئر) نے کہا: ''یہ خطرے کی آسمانی گھنٹی تھی''۔

سیلاب بلاخیز

جاپان ایک سرے پر ہے تو یورپ دوسرے سرے پر۔ ۳۰ جنوری اور ۲ فروری کے درمیان، یورپ میں بپھرے ہوئے اور طغیانی پر اُترے ہوئے دریاؤں نے ہالینڈ میں ڈھائی لاکھ لوگوں کو مال و اسباب سے بھرے، پانی میں ڈوبے ہوئے گھروں سے پناہ گاہوں کی طرف نکل جانے پر مجبور کر دیا۔ اس سے پہلے جرمنی میں کولون اور بون جیسے شہر، اور فرانس میں ۹۶ میں سے ۴۳ اضلاع زیرآب آ چکے تھے، اور بالترتیب ۳۰ ہزار اور ۴۰ ہزار لوگوں کو گھر چھوڑنے پر مجبور ہونا پڑا تھا۔ ہلاک ہونے والوں کی تعداد تو ۶۰ ہی تھی، لیکن بے گھر ہونے والوں کی تعداد کوبے کے برابر ــــــ تین لاکھ تک پہنچ گئی۔

بیسویں صدی کے بدترین سیلاب میں یورپ کا قلب ڈوب رہا تھا۔ جنوری کے دن برفانی دن ہوتے ہیں، اور پہاڑوں پر برف کے انبار لگتے ہیں۔ اچانک، ایک طرف مسلسل بارشیں شروع ہوگئیں اور زمین پر ندی نالے بہہ نکلے۔ دوسری طرف وقت سے بہت پہلے درجۂ حرارت اتنا بڑھ گیا کہ پہاڑوں پر برف پگھلنے لگی اور اُوپر سے پانی کے دھارے اترنا شروع ہوگئے۔ سب سے بڑا دریا، دریائے رائن ہے۔ انسان نے متوقع طغیانی سے تحفظ کی خاطر، کانٹ چھانٹ کر اس کا راستہ مختصر کر کے اور دونوں طرف اُونچے اُونچے بند تعمیر کر کے، اپنی دانست میں اسے اپنے قابو میں کر لیا تھا۔ لیکن پانی کی سطح اُونچی ہوتی گئی، اور جلد ہی اس نے بند کی اُونچائی کو جا لیا، شگاف پڑ گئے، اور دریا کی طغیانی نے چاروں طرف فساد برپا کر دیا۔

غیر معمولی بارشیں تو، کوبے کے زلزلے کی طرح، انسان کی کسی کارستانی کا نتیجہ نہیں، مگر برف کے جلد پگھلنے میں شاید اس کاربن کا دخل ہے جو جدید ٹکنالوجی نے غیر معمولی مقدار میں فضا میں داخل کر دی ہے۔ اور دریا کی سطح میں روز افزوں بلندی یقیناً اس کے بہاؤ کے

فطری راستے میں مداخلت کا نتیجہ ہے۔ اب سوچا جارہا ہے کہ دریا کو فطری راستے پر واپس لے آیا جائے۔

افسوس، تہذیب کے اس دھارے کے بارے میں نہیں سوچا جارہا کہ اسے بھی فطرت کے راستہ پر واپس لایا جائے، جس کی طغیانی اور سرکشی نے انسان کی زندگی کو ظلم، فساد اور خون سے بھر دیا ہے۔

ایک نظر چیچنیا پر

۱۹ جنوری ۱۹۹۵ء کو سات ہفتے کی مسلسل ہزیمتوں کے بعد روس جیسی عالمی طاقت بالآخر چھوٹے سے ملک چیچنیا کے دارالحکومت گروزنی میں واقع صدارتی محل پر دو بم گرانے میں کامیاب ہوگئی، اور روسی فیڈریشن کے صدر [۹۹-۱۹۹۱ء] بورس یلسن نے نہ صرف گروزنی پر قبضہ کرنے، بلکہ چیچنیا میں جنگ کے خاتمے کی خوش خبری سنا دی۔ جنگ تو کیا ختم ہوتی، گروزنی پر مکمل قبضہ بھی نہیں ہوا۔ نہ کوبے کی طرح زلزلہ آیا اور نہ یورپ کی طرح سیلاب، مگر اس ''عظیم الشان'' فتح کے حصول کے لیے روس کے ہاتھوں (کوبے کے) ۵ ہزار سے کہیں زیادہ چیچن مسلمان شہادت سے سرفراز ہو چکے ہیں، تین لاکھ سے کہیں زائد لوگ بے گھر ہو چکے ہیں، گروزنی کا بیش تر حصہ روس کی وحشیانہ بم باری کے نتیجہ میں ملبے کا ڈھیر بن چکا ہے۔ جنگ میں جو ہوا، سو ہوا۔ روسیوں نے بے شمار بے گناہ شہریوں کو پکڑ پکڑ کر اور ان مسلمان جنگی قیدیوں کو بلادریغ گولیوں سے اُڑا دیا، انھیں بدترین تعذیب کا نشانہ بنایا، مار مار کر ان کے اعضا توڑ ڈالے، بھیڑ بکریوں کی طرح ٹرکوں میں ٹھونس ٹھونس کر بھرا اور ایک جگہ سے دوسری جگہ لے گئے ہیں۔[1]

۱- مزید تفصیل کے لیے دیکھیں: ''اشارات''، از پروفیسر خورشید احمد۔ ماہ نامہ ترجمان القرآن، اپریل ۲۰۰۰ء

چیچنیا کی تباہی' جو کوبے اور یورپ کی تباہی سے کہیں زیادہ بڑھ گئی' کسی آفت سماوی کا نتیجہ نہیں' یہ تو خود انسان کے اپنے ہاتھوں لائی ہوئی بربادی ہے۔ جب وہ خلافتِ ارضی کا مقام بھول گیا' شیطان کے پھندے میں گرفتار ہو گیا' علم الاسما سے فلاح کے بجائے فساد مچانے کا کام شروع کر دیا' تو زمین فساد سے بھر گئی اور انسانی خون پانی کی طرح بہنے لگا: اَلَّذِیْنَ طَغَوْا فِی الْبِلَادِ ○ فَاَکْثَرُوْا فِیْهَا الْفَسَادَ ○ [الفجر ۸۹:۱۱-۱۲۔ ان لوگوں نے شہروں میں سرکشی کر رکھی تھی اور فساد مچایا ہوا تھا]____ ٹوکیو کے متوقع زلزلے سے بچاؤ ممکن نہ ہو مگر جو زلزلے انسان خود لاتا ہے ان سے بچاؤ ممکن ہے۔

چیچن مسلمانوں کے لیے یہ بھی راہ کھلی تھی کہ وہ اپنی جانوں' آبادیوں اور شہروں کو ہلاکت و تباہی سے بچا لیتے۔ مگر اس کے لیے انھیں روس کی غلامی قبول کرنا پڑتی۔ انھوں نے سوچ سمجھ کر آزاد رہنے کا' مسلمان کے طور پر آزاد رہنے کا فیصلہ کر لیا' اور اس کی خاطر جان و مال کی ہر قربانی پیش کرنے کے لیے تیار ہو گئے۔

قومیں دوسری قوموں پر بھی ظلم ڈھا سکتی ہیں' تفرقہ اور انتشار کا شکار ہو کر' ذلیل و پست مقاصد کے لیے اپنے اندر ہی عداوت و خوں ریزی کی جہنم بھڑکا سکتی ہیں' لیکن جو اعلیٰ مقاصد کے لیے' جینے کا عزم کر لیتی ہیں' ان کے لیے زندگی کی راہیں کھل جاتی ہیں' الا ماشاء اللہ' کہ ع

خونِ صد ہزار انجم سے ہوتی ہے سحر پیدا

کراچی میں

ہم سے بہت قریب' نگاہوں کے سامنے' اپنے گھر میں روز لاشیں گر رہی ہیں' اور انسان خاک و خون میں لوٹ رہے ہیں۔

۵ فروری [۱۹۹۵ء] کا دن تھا' اور رمضان کا چوتھا روزہ۔ پاکستان میں پوری قوم کشمیر میں مجاہدین کے جہاد اور ان کی قربانیوں کے ساتھ یک جہتی کا اظہار کر رہی تھی' اور

بھارتی فوجوں کے ہاتھوں مسلمانوں کی جانوں کی ہلاکت' ان پر وحشیانہ مظالم اور ان کی عزتوں کی پامالی کے خلاف صدائے احتجاج بنی ہوئی تھی۔ کراچی میں' لیاقت آباد میں شارع عام پر' کشمیر فنڈ جمع کرنے کے لیے کیمپ لگا ہوا تھا کہ روز روشن میں ایک سرخ گاڑی نمودار ہوئی' اس میں بیٹھے لوگوں نے کیمپ میں جمع لوگوں پر گولیوں کی بارش کر دی اور ان کو خون میں نہلا دیا۔ کم سے کم ۱۱ افراد ہلاک ہو گئے' اور ۱۴ شدید زخمی۔ چند گھنٹے گزرے تھے' تراویح کی نماز ہو رہی تھی کہ نارتھ کراچی کی مسجد باب الاسلام کے صدر دروازے پر ایک سفید رنگ کی گاڑی نمودار ہوئی' اور نمازیوں پر فائر کھول دیا' ۶ افراد یہاں ہلاک ہو گئے۔ یہ کراچی کی ساتویں مسجد تھی جو اس طرح قتل و غارت کا نشانہ بنی۔ اس روز کراچی میں ۱۹ لاشیں گریں۔ ایک دن بعد مہاجر قومی موومنٹ کے دو گروپوں کے درمیان خوں ریزی کے نتیجے میں ۹ آدمی ہلاک ہوئے' جن میں ۷ شیعہ تھے۔

کراچی میں یہ سلسلہ ایک طویل عرصہ سے چل رہا ہے۔ مرنے والوں کی تعداد ہزار سے تجاوز کر چکی ہے۔ اگرچہ ابھی کوبے اور چیچنیا کے برابر نہیں پہنچی' لیکن اچانک مر جانے کے مقابلے میں آہستہ آہستہ روز مرنے کا زخم اور گھاؤ جسد اجتماعی کے لیے زیادہ اذیت ناک اور خوف ناک ہوتا ہے۔

پاکستان اسی اذیت' دہشت اور ہلاکت کے عمل سے دوچار ہے۔ یہ آفت کوبے اور یورپ کی طرح سماوی نہیں' بلکہ ہمارے اپنے ہاتھوں کی لائی ہوئی ہے۔

یہ قیامت چیچنیا کی طرح روسیوں کی مسلط کردہ نہیں' یہ ہماری اپنی مسلط کردہ ہے۔

اس سے انکار نہیں کہ اس میں دشمن کا ہاتھ ہو سکتا ہے۔ حکومت بھی برسوں سے یہی کہہ رہی ہے' اگرچہ آج تک کسی حکومت نے بھی اپنا الزام پبلک کے سامنے ثابت نہیں کیا ہے۔ لیکن دشمن بھی اسی وقت گھستا ہے' جب ہم شگاف پیدا کر دیتے ہیں۔ چیچنیا کے مسلمانوں کی طرح جانوں کی یہ قربانی ہم اپنے ارادے سے کسی اعلیٰ مقصد کے لیے بھی پیش نہیں کر رہے۔

اس موت سے کسی زندگی کے مقدر ہونے کا امکان نہیں' اس خون سے کوئی سحر پیدا نہیں ہوگی۔ نہ مہاجر یا سندھی کے لیے' نہ کراچی کے لیے' اور نہ پاکستان ہی کے لیے۔

بچاؤ کیسے!

یہ تفرقہ' باہمی بغض و عداوت اور دنیا کی پست اغراض کی خاطر: اَفَتُؤْمِنُوْنَ بِبَعْضِ الْكِتٰبِ وَتَكْفُرُوْنَ بِبَعْضٍ [البقرہ ۲:۸۵' تم کچھ کتاب پر ایمان رکھتے ہو' اور کچھ کا انکار] کی روش کا نتیجہ ہے' اور قانونِ الٰہی کے تحت اس کا انجام دنیا میں رسوائی' ذلت و مسکنت' دشمنوں کا تسلط اور اللہ کا غضب ہے: وَمَنْ اَصْدَقُ مِنَ اللّٰهِ قِيْلًا [النساء ۴:۱۲۲' اور اللہ سے بڑھ کر کون اپنی بات میں سچا ہوگا]۔

زلزلہ پیماؤں کا جال بھی زلزلے کی خبر نہیں دے سکتا' لیکن ہم جس زلزلے کے جھٹکوں سے روز دوچار ہیں' ان کی خبر قرآن چودہ سو سال سے دے رہا ہے' اہلِ دانش بھی عرصے سے دہائی دے رہے ہیں۔ لاس اینجلز اور کوبے کے زلزلے ایسے مقامات پر آسکتے ہیں جہاں وہم و گمان نہ ہو' مگر یہ زلزلے تو ٹھیک انھی مقامات (fault lines) پر آرہے ہیں' جہاں نقشہ بتا رہا ہے کہ آنا چاہئیں۔ سائنس اور ٹکنالوجی کی بے پناہ ترقی اور بے مثال اقتصادی ترقی' دولت کے انبار' کارخانوں کے ہجوم اور بنکوں کی عالی شان عمارات' کوبے اور یورپ کو تباہی اور غرقابی سے نہیں بچا سکے' ہمیں کیسے بچا سکیں گے' جب کہ ہمارے زلزلے ہمارے اعمال و اخلاق کا پھل ہیں۔ بلکہ اگر یورپ کا سیلاب اس زہر کا نتیجہ ہے جو ٹکنالوجی نے فضا میں گھول دیا ہے' تو فکرِ معیشت جو زہر ہمارے دلوں کی اور قومی زندگی کی رگوں میں گھول رہی ہے' اس کے سیلاب سے ہم کیسے بچیں گے۔

لیکن ہمارے لیے بچنا (ٹوکیو کی طرح) ناممکن نہیں' بلکہ راستہ صاف اور سیدھا ہے' آسان بھی۔ ہاں' اس کے لیے ہمارے چودہ کروڑ باشندوں کو چیچنیا کے ۱۲ لاکھ مسلمانوں کی

طرح پہاڑوں جیسا حوصلہ اور عزم ضرور چاہیے: ''اگر بستی والے ایمان اور تقویٰ اختیار کریں' تو ہم ان پر آسمانوں اور زمین سے برکتوں کے دروازے کھول دیں گے'' [الاعراف ۷:۹۶]۔

مغرب کا انسان اسباب و علل کے چکر میں پھنسا ہوا ہے' اور اسباب ہی کو اس نے ارباب من دُون اللّٰہ بنا رکھا ہے۔ لیکن اسباب کے پیچھے غیب میں 'رب السموات والارض [صٓ ۳۸:۶۶] کے حقیقی دست کارفرما کا جلوہ' انسان انبیا علیہم السلام کی انگلی پکڑے بغیر نہیں دیکھ سکتا۔ نجات کا یہ راستہ اور ترقی کا یہ نسخہ اس ربِ حقیقی کا بتایا ہوا راستہ اور نسخہ ہے۔

ایمان اور تقویٰ ہی ہمیں اس مقام پر پہنچائے گا کہ ہم اللہ کے علاوہ ہر شے کی غلامی ترک کر کے ___ چاہے وہ: سیم و زر ہو' سائنس اور ٹکنالوجی ہو' یا مغرب اور امریکا ہو ___ آزادی و حریت حاصل کر لیں گے۔ پھر ہماری تقدیر کی تشکیل کسی کی مٹھی میں نہ ہوگی' ہماری زندگی کی نقشہ گری کسی کے اختیار میں نہ ہوگی' کوئی سامری ہمیں سیم و زر کے جال میں باندھ کر بے بس نہیں کر سکے گا۔ پھر ہمیں ان حکومتوں سے بھی نجات مل سکے گی' جو ایک کے بعد ایک' پے در پے ہمیں غلامی کی زنجیروں میں جکڑتی چلی جا رہی ہیں۔

زیادہ مناسب اور بہتر یہ ہوگا کہ ہم عزمِ مصمم کر کے' خلوصِ نیت کے ساتھ' جوش اور جذبے سے بھرے ہوئے' قوم کے ایک ایک مرد' عورت' جوان اور بچے کو اس سرفرازی کی راہ پر گامزن کرنے کے لیے کھڑے ہو جائیں' جو صراطِ مستقیم قرآن نے ہمارے سامنے کھولی ہے۔ [مارچ ۱۹۹۵ء]

□□□

پاک امریکا تعلقات: پس منظر اور منظر

پاکستان کو بنے ابھی مشکل سے دو ماہ ہوئے تھے کہ حکومت پاکستان کے خصوصی ایلچی' میر لائق علی [م: ۲۳ اکتوبر ۱۹۷۱ء] دو ارب ڈالر قرض حاصل کرنے واشنگٹن پہنچے۔ ان کے فائل میں ''حکومت پاکستان کی یادداشت بنام وزارت خارجہ'' تھی۔ پاکستان نے امریکا سے امداد کیوں مانگی؟ میمورنڈم میں اس کی وضاحت یوں کی گئی:

سب سے پہلے دفاع کے لیے' اور پھر معاشی ترقی کے لیے ___ کہ انھی دونوں پر اس کی بقا کا انحصار ہے۔ پاکستان اگر کسی کی طرف دیکھ سکتا ہے تو پہلے امریکا' اور پھر برطانیہ کی طرف۔ (اسٹیٹ ڈیپارٹمنٹ کا داخلی خط نمبر ۸۴۵' ایف ۵۱/۱۰-۴۷-۲۷' مورخہ ۱۸ اکتوبر ۱۹۴۷ء)[1]

۱- کے عارف (مرتب) America-Pakistan Relations: Documents' جلد اول [امریکی وزارت خارجہ کے خفیہ کاغذات جو ۱۹۴۷-۴۸ء کے دور پر مشتمل ہیں اور انھیں امریکی حکومت نے ۱۹۷۷ء میں افادہ عام کے لیے کھولا]۔ ناشر: وین گارڈ' لاہور ۱۹۸۴ء۔ اس مضمون میں مذکورہ کتاب کا حوالہ دستاویزات کے طور پر درج کیا جا رہا ہے۔ مرتب

دوستی کی خواہش کا حشر

آخر میں دست سوال یوں دراز کیا گیا:

> اس مقصد کے لیے بس ضرورت ہے تو صرف مالیات کی' بلکہ دراصل مالیات کے مستقل سرچشمہ کی۔[2]

گویا اپنی آزادی و سلامتی کے تحفظ اور معاشی ترقی کی موہوم توقعات کے لیے پاکستان نے تخلیق پاتے ہی بلاجھجک اپنا مقدر مغرب اور امریکا کے ساتھ باندھ دیا' جو بالآخر ایک سراب ثابت ہوئیں۔ دوسرے لفظوں میں پاکستان نے اپنی اسٹرے ٹیجک آزادی سے ہاتھ دھونے اور ایشیا میں اشتراکی روس کے خلاف امریکا کا حلیف بننے کی پیش کش کر دی' وہ آزادی' جو مسلمانان برصغیر نے خاک وخون کے سمندر سے گزر کر انگریز اور ہندو سے حاصل کی تھی۔

پاکستان کی جانب سے دو ارب ڈالر کے تقاضے پر مشتمل اس درخواست کو امریکی وزارت خارجہ کے افسران نے بلاتوقف مسترد کر دیا' اور میر لائق علی خالی ہاتھ واپس لوٹ آئے۔[3] لیکن یہ میمورنڈم ایک سوچ اور فکر کا حامل تھا' اور اس کے ذریعے پاکستان کے مستقبل کی مستقل حکمت عملی کی داغ بیل ڈالی گئی تھی۔ چنانچہ وزیراعظم [۱۵ اگست ۴۷ء۔ ۱۶ اکتوبر ۱۹۵۱ء] لیاقت علی خان' بعدازاں گورنر جنرل [۱۹ اکتوبر ۱۹۵۱ء۔ ۱۵ اکتوبر ۱۹۵۵ء] ملک غلام محمد' اور سب سے بڑھ کر [پہلے پاکستانی] کمانڈر ان چیف جنرل محمد ایوب خاں [م: ۲ اپریل ۱۹۷۴ء] مایوس نہ ہوئے' اور انھوں نے واشنگٹن کا دامن جو ایک دفعہ پکڑ لیا تو پھر چھوڑنے سے انکار کر دیا۔ وہ مکمل اخلاص کے ساتھ امریکا پر اعتماد کرتے رہے کہ وہ اسلحے اور دیگر دفاعی اور اقتصادی امداد کے عوض' اشتراکی روس کے گرد حصار باندھنے (containement) کے لیے

۲- کے عارف: دستاویزات' ص ۷

۳- ایضاً' ص ۷

پاکستان کی خدمات قبول کرلے اور اسے کسی نہ کسی دفاعی معاہدے کے "عقد" میں باندھ لے۔

اس بات سے انکار ممکن نہیں کہ کمزور ہو یا طاقت ور دنیا کی ہر قوم حلیفوں کی محتاج ہوتی ہے۔ اور پاکستان تو انگریز اور ہندو کے ہاتھوں بنا ہی ایسی کسمپرسی کے عالم میں تھا' کہ اس کے لیے شاید کسی بڑے ملک کی مدد حاصل کرنے کے علاوہ کوئی چارہ نہ تھا۔ خزانہ خالی تھا' مرکزی ملازمین کے دفاتر میں فرنیچر تک مفقود تھا' اسلحہ اور اسلحہ ساز فیکٹریاں سب بھارت کے پاس رہ گئے تھے' ملک میں کوئی صنعتی ڈھانچا نہ تھا۔ دوسری جانب یہ کہنا بھی غلط نہیں ہوگا کہ پاکستان جیسے نوزائیدہ اور کمزور ملک اور امریکا جیسی عالمی طاقت کے درمیان برابر کے لین دین کی بنیاد پر کوئی معاہدہ دشوار تھا۔

فدویانہ سپردگی

جس طرح ہمیں اپنے ابتدائی لیڈروں کی نیت اور اخلاص کے بارے میں کوئی شک نہیں۔ بالکل اسی طرح یہ بات بھی کہے بغیر نہیں رہ سکتے' کہ جس ناعاقبت اندیشی' ملک وملت کے مفادات سے لاپروائی' اور بے مثال فدویانہ خود سپردگی کے ساتھ پاکستان کو امریکا کے ساتھ فوجی معاہدوں میں باندھنے اور اقتصادی امداد کی بھیک حاصل کرنے کی حکمت عملی اختیار کی گئی' بہر حال اس کی چنداں ضرورت نہ تھی۔ پاکستان ایسا تہی دامن بھی نہ تھا کہ موہوم فائدوں کی خاطر اتنی بڑی قیمت ادا کرتا' امریکا کے بھی اپنے اسٹرے ٹیجک مفادات کے تقاضے تھے' جنھیں وہ نظر انداز نہ کرسکتا تھا۔

آخرکار پاکستانی قیادت کی کوششیں رنگ لائیں' ان کی کاوشوں کی وجہ سے نہیں' بلکہ امریکا کی اپنی اسٹرے ٹیجک مجبوریوں کی وجہ سے۔ اشتراکی روس سے "سرد جنگ" شروع ہوچکی تھی' اور امریکا بھی اب حلیفوں کا محتاج تھا۔ اس کے باوجود اگر اسے اپنا مطلوب حلیف بھارت ہاتھ آجاتا' تو وہ غالباً پاکستان سے ہرگز کوئی دفاعی معاہدہ نہ کرتا۔

ایسا ہو جاتا تو کیا زیادہ اچھا نہ ہوتا؟ اس کا جواب اب تاریخ نہیں دے سکتی۔

خیال آتا ہے کہ پھر شاید ہمیں اتنی آزادی نصیب رہتی کہ ہمارے پہلے وزیراعظم لیاقت علی خاں، روس کا دورہ کر سکتے، چین کی کمیونسٹ حکومت کو ہم بروقت تسلیم کر سکتے، پچاس کے عشرے ہی میں مسلمان ممالک کو ناراض کرنے کے بجائے ان سے مستحکم تعلقات استوار کر لیتے، سویز کے مسئلے پر مصر کے بجائے برطانیہ کی حمایت کرنے پر مجبور نہ ہوتے، ۱۹۶۲ء میں [بھارت چین محاذ آرائی کے دوران] کشمیریوں کو حق خود ارادیت دلانے کے لیے نتیجہ خیز اقدام کر سکتے۔ پھر شاید ہم اتنے بے دست و پا بھی نہ ہوتے کہ 'سرد جنگ' کے دنوں میں فرانس سے ایٹمی ری پراسسنگ پلانٹ نہ خرید سکتے۔ کشمیری مجاہدین بھائیوں کی امداد سے دست کش نہ ہونا پڑتا۔ نقد قیمت ادا کر دینے کے باوجود ہمارے ایف ۱۶ طیارے امریکا میں کھڑے رہتے اور ہم کچھ بھی نہ کر سکتے۔ حتیٰ کہ ہم اپنے قانون کے تحت توہینِ رسالتؐ کے ملزموں پر مقدمہ بھی نہ چلا پائیں۔ پھر شاید ہم دو ٹکڑے نہ ہوتے، سیاسی عدم استحکام کا شکار بھی نہ ہوتے، معاشی طور پر خود کفیل بھی ہو سکتے، کم سے کم اپنا بجٹ بنانے کا اختیار ورلڈ بنک اور آئی ایم ایف [عالمی مالیاتی فنڈ] کے بجائے ہمارے ہی پاس رہتا اور شاید ـــــ پھر ہم اپنے دین اور ثقافت کی راہ پر بھی گامزن ہو سکتے۔ لیکن تاریخ کے دھارے میں بہتے ہوئے، ماضی کے بارے میں سنہرے خواب دیکھنے کا کیا حاصل!

اکتوبر ۱۹۴۷ء میں میر لائق علی تو خالی ہاتھ واپس آ ئے لیکن بہت جلد امریکا کی سوچ اور رویے تبدیل ہونا شروع ہو گئے۔ ۹ فروری ۱۹۵۰ کو امریکا نے پاکستان کے ساتھ ''پوائنٹ فور'' (Point Four) پروگرام کے تحت ٹیکنیکل تعاون کا معاہدہ، اور پھر ۱۵ دسمبر ۱۹۵۰ء کو باہمی امداد کا غیر رسمی معاہدہ کر لیا۔ پھر اکتوبر اور نومبر ۱۹۵۳ء میں جنرل محمد ایوب خان کی واشنگٹن یاترا کے بعد ۱۹ مئی ۱۹۵۴ء کو، پاکستان کی فوجی امداد کی درخواست قبول کر کے، امریکا نے ''امریکا۔ پاکستان باہمی دفاعی معاہدہ'' پر دستخط کر دیے۔ ایک سال بعد ستمبر ۱۹۵۴ء میں، فوجی امداد کی

''قیمت'' کے طور پر پاکستان نے امریکا کی خواہش پر ''منیلا پیکٹ'' پر دستخط کر کے اس کی بنائی ہوئی جنوب مشرقی ایشیا کے لیے دفاعی تنظیم' سیٹو (SEATO) میں شرکت اختیار کر لی۔ پھر مزید فوجی امداد کے وعدے پر ایک سال بعد' اکتوبر ۱۹۵۵ء میں مشرق وسطیٰ کے لیے امریکی دفاعی تنظیم ''بغداد پیکٹ'' (CENTO) میں بھی پاکستان شریک ہو گیا (اگرچہ اس میں امریکا خود باقاعدہ شریک نہ ہوا' اسرائیل کی خاطر)۔ یہ وہ وقت تھا جب پاکستان کو ''روس کے خلاف شمالی محاصرے کا مشرقی بازو' ایشیا میں امریکی دفاعی نظام کا محور' اور امریکا کے یاروں میں سب سے گہرا یار (most allied ally) قرار دے کر سراہا جا رہا تھا[۴]۔ مسٹر ذوالفقار علی بھٹو [م: اپریل ۱۹۷۹ء] نے ایوب حکومت میں وزیرخارجہ کی حیثیت سے ۲۷ نومبر ۱۹۶۲ء کو نیشنل اسمبلی میں تقریر کرتے ہوئے بجا طور پر اس لمحے کو ایسا لمحہ قرار دیا: ''جب ہماری تاریخ ایک فیصلہ کن موڑ مڑ گئی تھی''۔[۵]

لیکن اس مختصر سے ہنی مون [۱۹۵۴ء-۶۲] کے بعد' جب ۱۹۶۲ء میں امریکی صدر [۱۹۶۱ء-۶۳ء] جان ایف کینیڈی نے دیکھتے ہی دیکھتے پاکستان کے دشمن ملک بھارت کو چھ ڈویژن فوج کے لیے ساز و سامان اور پندرہ سکواڈرن جہاز فراہم کر دیے' جس سے ان بظاہر گہرے تعلقات پر تاریکی کے سائے پڑنا شروع ہو گئے۔ پھر تاریکی کے یہ سائے گہرے ہی ہوتے چلے گئے۔ اگرچہ بیچ میں افغان جہاد (۱۹۷۹-۹۲ء) کی وجہ سے کچھ عرصے کے لیے دیا ٹمٹمایا اور ان تعلقات نے سنبھالا لیا' لیکن بگاڑ بڑھتا ہی گیا۔ اسلحے کی فراہمی پر بار بار پابندی لگائی گئی' اور پھر ہر طرح کی امداد بند کر دی۔ امداد قرضوں میں بدلی' قرضے نقد فروخت میں' اور مال کی نقد قیمت لینے کے باوجود مال دینے سے انکار بھی کیا جاتا رہا۔ پاکستان کا دفاع تو کجا'

۴- پروفیسر رابرٹ جی ورسنگ: Pakistan's Security Under Zia: 1977-88، ناشر: پال گریو میک ملن' لندن' ۱۹۹۱ء' ص ۶۔ (اس مضمون میں مذکورہ کتاب کا حوالہ بطور پاکستان سیکورٹی درج کیا جائے گا)

۵- دستاویزات' اوّل' ص ۲۱۶

اسے دو ٹکڑے کرنے کی بھارتی کارروائی کو امریکا کی حمایت حاصل رہی۔ ایٹمی صلاحیت کے حصول پر پاکستان کو ''عبرت ناک مثال'' بنانے کی کارروائی شروع کی گئی۔ کشمیر پر کوئی مؤثر حمایت تو کیا ملتی' اُلٹا پاکستان کے سر پر ''دہشت گرد'' قرار دیے جانے کی تلوار لٹکا دی گئی۔

تعلقات میں بگاڑ کے طویل دور کے بعد' پھر اسلام آباد اور واشنگٹن کے درمیان آمدورفت اور بات چیت زور وشور سے جاری ہوتی دیکھنے میں آئی ہے۔ یہ سب کچھ حسب سابق تاریکی کے دبیز پردوں کے پیچھے ہو رہا ہے۔ ہمارے ملک میں' اہم قومی معاملات میں قوم کو باخبر رکھنے کی روایت کبھی بھی نہیں رہی۔ عوام بے چارے اس قابل کہاں! یہ تاریکیاں' مغالطہ آمیزیوں' غلط بیانیوں اور طفل تسلیوں سے اور گہری ہی ہوتی جا رہی ہیں' لیکن ماضی کا آئینہ ہمارے پاس ہے۔ اس آئینے ہی میں مستقبل کی جھلک نظر آ سکتی ہے۔ اس آئینے پر نظر ڈالنا ہی آج ہمارے پیش نظر ہے۔

مذاکرات پہلے بھی ہوئے ہیں اور آیندہ بھی ہوتے رہیں گے' معاہدات بھی ہوئے ہیں اور ہوتے رہیں گے' لیکن اس بیل کا اس طرح منڈھے چڑھنا کہ پاکستان کے اہداف کسی درجے میں بھی حاصل ہوں' ممکن نظر نہیں آتا۔ کیونکہ پاکستان اور امریکا کے اہداف و مقاصد کے درمیان روز اول ہی سے بنیادی تضاد اور تفاوت رہا ہے۔ امریکا ایک بہت طاقت ور ملک ہے' اور طاقت ور اپنے مفادات حاصل کرنے میں کامیاب رہتا ہے۔ امریکا نے اس معاملے میں کبھی پاکستان کو دھوکے میں نہیں رکھا' کہ وہ یہ معاہدات کیوں کر رہا ہے۔ مگر' پاکستانی حکمرانوں نے ہمیشہ خود فریبی کو ترجیح دی' قوم کو ناواقفیت اور غلط فہمیوں میں مبتلا رکھا' اور حقیقت کو تسلیم کرنے سے گریز کیا

کل کے حکمرانوں کے مقابلے میں' وہ جیسے کچھ بھی تھے' آج کے حکمران بونے ہیں اور مسائل دیو قامت ہو گئے ہیں۔ اشتراکی روس اور اشتراکیت کے نام پر پاکستان نے جس ایک کارڈ سے اپنا کھیل کھیلا تھا' وہ اشتراکی روس کے زوال [دسمبر ۱۹۹۱ء] کے بعد اس کے ہاتھ سے نکل

گیا۔ گویا پاک امریکا تعلقات کے پاؤں تلے سے زمین سرک گئی۔ حکمران خود تو شاید کسی غلط فہمی کا شکار نہ ہوں' لیکن انھیں قوم کو خوش فہمیوں میں مبتلا رکھنے سے یقیناً کوئی دریغ نہیں۔

امریکی 'احسان' کے اسباب

امریکا کی سوچ اور رویوں میں تبدیلی کیوں رونما ہوئی؟

کہاں ۱۹۴۷ء میں گورنر جنرل قائداعظم محمد علی جناح مرحوم کی تجویز اس قابل بھی نہ سمجھی گئی تھی کہ اسے اوپر بھیج دیا جاتا' اور اسٹیٹ ڈیپارٹمنٹ [وزارت خارجہ] کے نیچے کے چار افسران نے اسے ازخود ہی مسترد کر دیا[۶] اور کہاں ۱۹۵۵ء کہ پاکستان کو امریکا نے اپنا یار وفادار بنالیا۔ اس کے کیا مفادات تھے کہ وہ پاکستان کو اسلحہ دینے پر تیار ہوگیا' اور اسے اپنے ساتھ دفاعی معاہدوں میں باندھ لیا؟

یہ تبدیلی تیزی سے بدلتی ہوئی عالمی سیاست اور روس اور کمیونزم کے خطرے کی وجہ سے رونما ہوئی۔ دوسری جنگ عظیم کے دوران میں امریکا اور اشتراکی روس کے درمیان جو مجبوری کے حلیفانہ تعلقات قائم ہوگئے تھے' وہ جلد ہی ٹوٹنا پھوٹنا شروع ہوگئے' اور دونوں کے درمیان سرد جنگ کا آغاز ہوگیا۔ جولائی ۱۹۴۷ء کے رسالے Foreign Affaris میں جارج ایف کینان نے مشہور زمانہ مضمون ''سوویت طرزِ عمل کے سرچشمے'' میں روسی خطرے کی نشان دہی کی تھی' اور اس کو ''محدود رکھنے'' کی حکمت عملی پیش کی تھی (یہ بات دلچسپ ہے کہ رسالہ فارن افیئرز ہی میں ''اسلامی خطرہ'' کے خلاف پروفیسر سیموئل ہن ٹنگٹن کے مضمون: 'The Clash of Civilizations?' (گرما ۱۹۹۳' ج ۷۲' عدد ۳) کو اس مضمون کا ہم پلہ قرار دیا گیا ہے)۔ امریکی تعبیر تاریخ کے مطابق ایران' یونان اور ترکی میں روسی مداخلت'

۶- دستاویزات' اوّل' ص ۶

فروری ۱۹۴۸ء میں چیکوسلواکیہ میں کمیونسٹ انقلاب' ۴۹-۱۹۴۸ء میں برلن کی ناکہ بندی' یکم اکتوبر ۱۹۴۹ء کو چین میں کمیونسٹ حکومت کے قیام' اور پھر ۲۵ جون ۱۹۵۰ء کو جنگ کوریا کے آغاز[7] نے سرد جنگ کو عروج پر پہنچا دیا۔ چنانچہ امریکا نے سرگرمی کے ساتھ اشتراکی روس کو محدود رکھنے کی حکمت عملی کو عملی جامہ پہنانا شروع کر دیا۔ اس حکمت عملی کے لیے امریکا کو:

۱- ایسے اڈے درکار تھے' جہاں سے روس اور چین پر نگاہ رکھی جا سکے' اور وقت آنے پر ان کے خلاف جنگی کارروائیاں بھی کی جا سکیں۔

۲- امریکا سے باہر ایسے میدانِ جنگ درکار تھے' جہاں ان کے خلاف جنگ لڑی جا سکے۔ (اب تک کوئی ''امریکی جنگ'' خود امریکا کی سرزمین پر نہیں لڑی گئی ہے)

۳- ایسی اطاعت گزار فوجیں درکار تھیں' جو اپنے اپنے مقام پر امریکا کی جنگ لڑ سکیں' اور امریکا کو' کوریا کے میدانِ جنگ کی طرح اپنی فوجیں موت کے منہ میں نہ بھیجنا پڑیں۔

۴- ایسے حلیف ممالک درکار تھے' جو اشتراکی روس اور اشتراکی چین کے گرد حصار بنا لیں تاکہ روس محدود ہو کر رہ جائے اور مزید پیش قدمی نہ کر سکے۔

پاکستان' امریکا کی یہ ساری اسٹرے ٹیجک ضروریات بدرجہ اتم پوری کرتا تھا۔ روس اور چین کی سرحد پر اس کا محل وقوع انتہائی موزوں تھا' اڈوں کے لیے بھی اور میدانِ جنگ کے لیے بھی۔ پاکستان کے فوجی اچھی نسل کے لڑنے والے شمار ہوتے تھے۔ اس کے حکمران مغرب کے کاسہ لیس اور اطاعت گزار تھے۔ چنانچہ پہلی درخواست مسترد کر دینے کے چند ماہ بعد ہی

۷- جزیرہ نمائے کوریا' ۱۹۴۸ء کے دوران دو حصوں میں تقسیم کر دیا گیا۔ امریکا' جنوبی کوریا کا پشت پناہ بنا' جب کہ کمیونسٹ چین' شمالی کوریا کا طرف دار ٹھیرا۔ یہ آویزش اس علاقے میں ایک طویل اور خوں ریز جنگ کا پیش خیمہ ثابت ہوئی۔ نتیجہ یہ کہ ۱۹۵۰ء سے ۱۹۵۳ء کے دوران' جنگ کوریا' میں ۵۰ لاکھ انسان موت کے گھاٹ اُتار دیے گئے' جو کم و بیش کوریا ہی کے لوگ تھے۔

امریکا کے اعلیٰ ترین حلقوں کی دوربین نگاہیں پاکستان کی ان 'خوبیوں' پر پڑنا شروع ہوگئیں۔

بیچ میں صرف ایک مشکل حائل تھی' پاکستان کے اصل حریف بھارت کی۔ بھارت ہر لحاظ سے امریکا کے لیے زیادہ پُرکشش اور سودمند متبادل تھا۔ امریکا اسے [امریکی وزیرخارجہ جان فاسٹر ڈلس کے الفاظ میں] اس کی ''غیراخلاقی (immoral) غیر جانب داری کے باوجود' نہ صرف بے انتہا چاہتا تھا' بلکہ کسی قیمت پر [بھارت کو] ناراض کرنے کے لیے تیار نہ تھا۔ یہ تو پاکستان کی 'قسمت' تھی کہ وہ امریکا کی ساری ضروریات سے لیس' موزوں محل وقوع کے ساتھ' صحیح وقت پر' دوستی کا ہاتھ پھیلائے ہوئے کھڑا تھا۔ دوسری جانب ایسی 'خدمت' کی انجام دہی کے لیے امریکا کو اس کا اصل محبوب (بھارت) ہاتھ نہ آ رہا تھا' اس کے اسٹرے ٹیجک مفادات کا دباؤ برابر بڑھ رہا تھا' چنانچہ وہ پاکستان کا ہاتھ تھامنے پر مجبور ہوگیا۔

امریکا کو پاکستان کے کسی اسٹرے ٹیجک مفاد سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ خصوصاً بھارت کے معاملے میں اس کا مفاد پاکستان کے مفاد سے متصادم تھا۔ چنانچہ وہ صرف پاکستان کے فوجی اڈوں' جنگی میدانوں' اطاعت شعار فوجی جوانوں اور جنگی سامان کی بلامقابلہ منڈی اور مغرب سے اس کی وابستگی کے بارے میں سوچ رہا تھا۔

امریکی دوستی کا فوری ہدف

سب سے پہلے ۲/اگست ۱۹۴۸ء کو امریکی جائنٹ چیفس آف اسٹاف (JCS) نے اپنے ایک میمورنڈم میں: کراچی سے مشترکہ فوجی کارروائیاں کرنے کے حقوق حاصل کرنے کی ضرورت پر زور دیا۔[۸] پھر ۲۴ مارچ ۱۹۴۹ء کے ایک دوسرے میمورنڈم میں انھوں نے پھر کہا:

۸- امریکی وزارت خارجہ: Foreign Relations of United States, 1958-60 جلد ۱۵۔ ناشر: وزارتِ خارجہ' ریاست ہائے متحدہ امریکا' واشنگٹن' ۱۹۷۲ء' (اس مضمون میں مذکورہ کتاب کا حوالہ بطور فارن ریلیشنز درج کیا جائے گا) بحوالہ دستاویزات' اوّل' ص ۱۱۔

روس سے متصل جنوبی ایشیا کے ممالک کے ذریعے' روس کے اندر نظریاتی اور جاسوسی کارروائیوں کے روشن امکانات ہیں۔ کراچی سے لاہور تک پاکستان کا علاقہ اسٹرے ٹیجک اہمیّت اختیار کرسکتا ہے۔ یہاں سے وسط روس پر ہوائی حملے کیے جاسکتے ہیں' اور مشرق وسطیٰ کے تیل کے علاقوں کے دفاع یا ان کو دوبارہ فتح کرنے کے لیے فوجیں روانہ کی جاسکتی ہیں۔[9]

بالآخر امریکی صدر [۱۹۴۵-۵۳ء] ہیری ایس ٹرومین نے دسمبر ۱۹۵۱ء میں پاکستان کی اہمیّت تسلیم کرتے ہوئے اعلان کیا کہ: بحرہند' اپنے محل وقوع اور وسط ایشیا کے زمینی راستوں پر کنٹرول کی وجہ سے جنوبی ایشیا میں پاکستان ہمارا ایک قیمتی حلیف ہے۔[10]

امریکا صرف اڈے ہی نہیں چاہتا تھا' بلکہ اس سے زیادہ اسے فوجیں مطلوب تھیں جو اس کی جنگ لڑسکیں اور تجارتی منڈیاں بھی۔ نیشنل سیکورٹی کونسل کی ایک اسٹاف اسٹڈی میں' جسے ۲۵ جنوری ۱۹۵۱ء کو صدر ہیری ٹرومین نے منظور کیا' امریکی اہداف متعین کرتے ہوئے کہا گیا: ''ایک طرف امریکا اور اس کے دوست ممالک کو' اس علاقے کے وسائل اور منڈیاں دست یاب ہونے چاہییں' دوسری طرف ایسے حالات پیدا کیے جائیں کہ ـــــ یہ اپنے وسائل روسی بلاک کو فراہم کرنے سے انکار کردیں۔ پاکستان میں کراچی' راولپنڈی اور لاہور جیسے مقامات پر ہوائی اڈے' ایشیا یا شرق قریب میں کسی بھی ملک کے اڈوں کے مقابلے میں' روس کے بیش تر علاقوں سے (بشمول صنعتی علاقوں کے) زیادہ قریب ہوں گے''۔[11] امریکا اور برطانیہ کے اعلیٰ عہدے داران بھی آپس میں انھی خطوط پر خفیہ منصوبہ بندی کر رہے تھے۔[12] اس سے پہلے سیلون [سری لنکا] میں' ۲ مارچ ۱۹۵۱ء کو امریکا کے سفارتی افسران متفقہ طور پر یہ سفارش

۹- ایضاً، ۱۹۴۹ء' بحوالہ: دستاویزات' اوّل' ص ۱۵

۱۰- دستاویزات' ص ۴۲

۱۱- ایضاً' ص ۴۵

۱۲- ایضاً' ص ۴۷' ۵۰

کر چکے تھے:

امریکا جلد از جلد پاکستان سے سمجھوتہ کر کے پاکستانی فوجوں کو مسلح اور مضبوط بنائے' تاکہ (کسی) جنگ کے آغاز ہی میں مغربی بازو پر [روس کے مقابلے کے لیے] پاکستانی فوجوں کا دستیاب ہونا یقینی ہو۔[13]

دُوررس اہداف

پاکستان کے بارے میں امریکا کے اندازے اور بدلتی ہوئی سوچ' امریکی وزارت خارجہ کے بالکل آغاز ہی کے ۳ اپریل ۱۹۵۰ء اور یکم جولائی ۱۹۵۱ء کے پالیسی بیانات میں صاف دیکھی جا سکتی ہے:

۱- پاکستان سے تعلقات میں ہمارا اصل مقصد یہ ہے کہ اس کی حکومت اور لوگوں کا رخ امریکا اور دیگر مغربی جمہوریتوں کی طرف رہے۔[14]

۲- پاکستانی سیاسی طور پر آزاد ضرور ہے' لیکن وہ دفاع اور معاشی ترقی کے لیے بیرونی امداد کا محتاج ہے۔

۳- پاکستان میں ہمارا اطلاعاتی پروگرام —— مغرب دوست رائے عامہ پروان چڑھانے کے لیے وضع کیا گیا ہے۔

۴- ہمارا ایک اہم ہدف یہ ہے: پاکستان میں ایسا رویہ پروان چڑھائیں کہ وہ امریکا اور اس کے اتحادیوں کو وہ تمام سہولتیں' وسائل و ذرائع اور منڈیاں فراہم کرے' جو انھیں حالتِ امن میں مطلوب ہوں یا حالتِ جنگ میں درکار۔

۵- پاکستان کے پاس جنگجو افرادی قوت ہے' جو روسی جارحیت کا راستہ روکنے میں

۱۳- دستاویزات' ص ۴۴

۱۴- فارن ری لیشنز' ۱۹۴۹ء' بحوالہ دستاویزات' ص ۲۷

شرق قریب کے ممالک کی مدد کر سکتی ہے' پاکستان ایران کی مدد کے لیے بھی فوجیں بھیج سکتا ہے۔[15]

امریکا نے اپنے اہداف کے حصول میں پاکستان کی اہمیت تسلیم کی' تو فوجی اور اقتصادی امداد دینے کے بارے میں بھی سوچنا شروع کر دیا۔ پاکستان کی پہلی درخواست کے مسترد کرنے کے تقریباً دو ہی سال بعد' ۱۶/اگست ۱۹۴۹ء کو امریکی وزیر خارجہ میک گی (Mcghee) نے بیرونی فوجی امداد کے کوارڈی نیٹر [رابطہ کار] کو لکھا: ''پالیسی کے بارے میں ہمارے تمام مطالعات سے یہی نتیجہ نکلتا ہے کہ جنوبی ایشیا کے ممالک میں اپنے قومی سیاسی اہداف کے حصول کے لیے ضروری ہے کہ ہم ان کی فوجی امداد کی درخواستوں پر ہمدردی کے ساتھ غور کریں''۔[16]

ڈیوڈ آئزن ہاور کے صدر امریکا [۶۱-۱۹۵۳ء] بن جانے کے بعد' وزیر خارجہ ڈلس' اشتراکی روس کے گرد حصار باندھنے کے لیے سرگرم ہو گئے۔ جنگی ماہرین کے مطابق 'شمالی حصار' [Northern Tier] پاکستان کے بغیر ممکن نہ تھا۔ ڈلس نے ترکی اور پاکستان کے دورے سے واپس آنے کے بعد امریکی سینیٹ کے سامنے تقریر کرتے ہوئے کہا:

ترکی ـــــ ہمارا ایک مضبوط مورچہ ہے۔ وہاں لوگ لڑنے کے لیے بالکل تیار ہیں' قوی ہیں' بہادر ہیں اور روح وجذبہ میں ہمارے حلیف ہیں ـــــ دوسرے سرے پر پاکستان ہے جو بہت مضبوط مورچہ بن سکتا ہے ـــــ ہمیں اسی 'شمالی حصار' پر اعتماد کرنا چاہیے۔ [یہاں ترکی' وہاں پاکستان] مشکل ہے کہ کوئی بھی ان کے درمیان پہاڑی دروں سے اندر گھس سکے ـــــ مگر پاکستان کے معاملے میں مشکل یہ ہے کہ ہمارے پاس اب تک اس کو فوجی امداد دینے کا کوئی پروگرام نہیں' ہم یہ مدد دینے کی

۱۵- فارن ری لیشنز '۱۹۵۱ء' بحوالہ دستاویزات' ص ۵۵-۵۷

۱۶- دستاویزات' ص ۴۲

ہمت اس لیے نہیں کر پا رہے کہ ہمیں بھارت کے ردعمل کا ڈر ہے۔[17]

بالآخر امریکا نے اپنے اہداف کی خاطر ۱۹۵۴ء کے باہمی دفاعی معاہدے پر دستخط کر دیے۔ پاکستان کے لیے مطلوبہ فوجی اور اقتصادی امداد ملنے کا دروازہ کھل گیا' اور امریکا کو اشتراکی روس کے خلاف معاہدوں میں پاکستان بطور مہرہ حاصل ہو گیا۔

شروع ہی سے امریکا کا ایک ہدف اور تھا' جو اب زیادہ واضح ہو کر سامنے آنا شروع ہوا۔ امریکی وزارتِ خارجہ کے جولائی ۱۹۵۱ء کے پالیسی بیان میں کہا گیا:

پاکستان میں ہمارے اہداف کے لیے ایک خطرہ اور ہے' جو [فی الحال] کمیونزم کی طرح عیاں نہیں ہے۔ یہ خطرہ جاگیرداروں کے رجعت پسند گروہوں اور غیر تعلیم یافتہ مذہبی راہنماؤں (ملاؤں) کی طرف سے ہے' جو موجودہ مغرب پسند حکومت کی مخالفت کر رہے ہیں' اور اسلام کے دقیانوسی اصولوں کی طرف واپس لوٹنا چاہتے ہیں۔ ان کی قوت کا سرچشمہ عوام کے مذہبی جذبات اور جاہل لوگوں کی طرف سے تغیّر و تبدل کی مخالفت ہے۔ اگر یہ غالب آ گئے تو پاکستان ایک مذہبی ریاست بن جائے گا' جو واضح طور پر مغرب دشمن ہو گی۔ اس لیے ہمیں جمہوری (لادینی) دستور اور جدید تعلیم کے لیے موجودہ حکومت کی کوششوں کی مکمل حمایت کرنا چاہیے۔[18]

پاکستان' یار وفادار

پاکستان کے وجود میں آتے ہی' کیوں پاکستانی قیادت نے آنکھیں بند کر کے یک طرفہ طور پر اپنا مقدر امریکا کے ساتھ نتھی کرنے کے لیے ہاتھ پاؤں مارنا شروع کر دیے؟

ان مقتدر طبقوں کے اہداف اسٹرے ٹیجک بھی تھے اور تہذیبی بھی۔ تہذیبی طور پر' یہ

۱۷- دستاویزات' ص ۷۸

۱۸- ایضاً' ص ۶۴

حکمراں انگریزی تعلیم یافتہ تھے' انگریز کے یار وفادار رہے تھے' مغربی تہذیب میں رنگے ہوئے تھے' مغرب سے سخت مرعوب تھے' مغرب کے نقش قدم پر چلنے ہی کو فلاح و ترقی کی راہ سمجھتے تھے۔ ان کی نظروں میں پاکستان کے لیے مطلوب ماڈل' سیکولر ترکی کا لیڈر مصطفیٰ کمال پاشا [م: ۱۰ نومبر ۱۹۳۸ء] تھا۔ اس طبقے کے لیے مغرب سے جڑنا ضروری تھا۔

مغرب کی معاشی ترقی اور سربلندی سے بھی ان کی نگاہیں چکاچوند ہو رہی تھیں۔ وہ اندھا دھند اس کے پیچھے بھاگنا چاہتے تھے۔ اس وقت ساری نو آزاد دنیا کی ریت بھی یہی تھی۔ یہ مقصد حاصل ہونا مغرب کے سرمائے' مغرب کے ماہرین' مغرب کی ٹکنالوجی' اور مغرب کی ثقافت امپورٹ کیے بغیر ممکن نہ تھا۔ اسی لیے انھوں نے امریکا کو لکھا تھا:

> معاشی ترقی پر ہماری بقا کا انحصار ہے' اور اس کے لیے ہمیں آپ ہی کی طرف دیکھنا ہوگا۔[19]

برطانوی دور استعمار کے دوران یہاں ہمارے اہل حل و عقد نے انگریز سے یاری' اس کی مکمل وفاداری' اس کی فوجوں کے لیے اپنے جوانوں کی فراہمی اور اس کے دربار میں کرسی ہی سے انھوں نے اپنی قسمت کے ستارے کو چمکتے دیکھا تھا۔ چنانچہ ان کے دیرینہ ''تجربے'' اور نفسیات نے انھیں یہی سمجھایا: اب جب کہ پاکستان کی صورت میں ایک بہت بڑی جاگیر ان کے ہاتھ میں آ گئی ہے' تو اس کی قسمت چمکانے کا نسخہ بھی یہی ہے۔ اسی میں اس کی سلامتی' اور دفاع' اس کے قومی اہداف کے حصول' اور اس کی ترقی کا راز پوشیدہ ہے۔ چنانچہ وہ بلا جھجک امریکا کی سرپرستی حاصل کرنے اور اس کا یار وفادار بننے کے لیے کوشاں ہو گئے۔

وہ جاگیردار تھے' دولت مند اور خوش حال تھے' اس لیے فطری طور پر وہ کمیونزم سے' بلکہ پہلے سے قائم نظام (status quo) میں کسی قسم کی بھی تبدیلی کے اندیشے سے' یا کسی بھی غیر مغربی (non western) تہذیب کے غلبے سے سخت خائف تھے۔ (ملحوظ رہے کہ فکری

۱۹- دستاویزات' ص ۵

اور عملی اعتبار سے مغربی ہونے کے باوجود اشتراکی روس ہمیشہ غیر مغربی' بلکہ مخالف مغرب صف میں شمار کیا جاتا رہا ہے' اور اسلام تو ہے ہی)۔ چنانچہ کمیونزم (اور اسلام؟) کے خلاف مزاحمت میں وہ پوری طرح مخلص اور سنجیدہ تھے' اور اس معاملے میں ان کا مفاد امریکا کے اسٹرے ٹیجک مفاد سے پوری طرح ہم آہنگ تھا۔ امریکا نے پاکستان کے ساتھ جو کچھ اور جیسی کچھ بھی دوستی رکھی ہے' یا مدد دی ہے' اس کی بنیاد پاکستان سے ہمدردی یا اس کی وفاداریوں کا صلہ نہیں' بلکہ اشتراکی روس سے دشمنی بنیاد رہی ہے۔

لیکن اس کے باوجود پاکستان کے حکمراں یہ حقیقت بھی جانتے تھے کہ پاکستان کو اصل خطرہ کمیونزم سے نہیں' بھارت سے ہے۔ بھارت کے خلاف دفاع' اپنی سالمیت کا تحفظ' اور بھارت کے ساتھ تنازعات میں حمایت و مدد کا حصول' اس کی اولین اسٹرے ٹیجک ضروریات تھیں۔ اگست ۱۹۴۷ء میں ہندستان تقسیم ہوتے ہی بھارت نے مالیات اور اسلحے میں پاکستان کا حصّہ غصب کر کے' اور فوج کشی کے ذریعے کشمیر پر ناجائز قبضہ کر کے یہ ثابت کر دیا تھا' کہ وہ پاکستان کو کمزور رکھنا اور اس کی شہ رگ پر قابض رہنا چاہتا ہے۔ پاکستان آغاز ہی سے اس کے ساتھ شدید عدمِ توازن کا شکار تھا۔ اس کے فوجی جوانوں کے پاس بندوقیں چلانے کے لیے گولیاں تک نہ تھیں۔

یہ پاکستان کی بدقسمتی تھی کہ اس کی اسٹرے ٹیجک کشش محدود تھی' جب کہ اس کا دشمن بھارت' امریکا کے لیے کہیں زیادہ پُرکشش' اور اس کے عالمی مفادات کے لیے بھی ضروری تھا۔ جب اس نے مجبوراً پاکستان کا ہاتھ تھاما' تب بھی وہ کسی قیمت پر بھارت کو ناراض کرنا نہیں چاہتا تھا' اور نہ کسی معاملے میں اس کے مقابلے میں پاکستان کی حمایت یا مدد کرنا چاہتا تھا۔ پاکستان کی دوسری بدقسمتی یہ تھی کہ اسے جتنی ضرورت امریکا کی تھی' اتنی امریکا کو اس کی ضرورت نہ تھی' اور امریکا جتنا طاقت ور تھا' پاکستان اتنا ہی کمزور تھا۔ اس لیے برابری کے کسی لین دین یا دباؤ کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔

دھوکے میں نہیں رکھا

اسی طرح امریکا نے کبھی پاکستان کو دھوکے میں نہیں رکھا' کہ جو اسلحہ وہ اسے دے رہا ہے' وہ اسلحہ کمیونزم کے خلاف ہے بھارت کے خلاف نہیں۔ اس کے کسی معاہدے کا اطلاق بھارت سے پاکستان کی کسی جنگ کی صورت میں نہیں ہوگا' بلکہ وہ ہرگز پسند نہیں کرتا کہ پاکستان کی بھارت سے جنگ ہو___ بھارت کے ساتھ پاکستان کے کسی بھی تنازعے میں وہ مکمل غیر جانب دار رہے گا (اگرچہ دونوں کے درمیان عدم توازن کی وجہ سے یہ ''غیر جانب داری'' درحقیقت بھارت کے حق میں ''جانب داری'' ہی رہی ہے)۔

پاکستانی وزیراعظم نواب زادہ لیاقت علی خاں کے پہلے دورہ امریکا کے دوران' ۸ مئی ۱۹۵۰ء کو نیویارک ٹاؤن ہال میں ان کی تقریر کے جواب میں جارج ایف کینان نے صاف صاف کہہ دیا تھا:

> ہم چاہتے ہیں کہ ہمارے دوست ہمارے مقام کی نزاکتوں کو سمجھیں' اور ہم سے وہ کام کرنے کی توقع نہ رکھیں جو ہم نہیں کر سکتے۔ صرف باہمی تعلقات ہی میں نہیں' بلکہ عمومی طور پر ایک عالمی طاقت کے طور پر اپنی ذمہ داریاں ادا کرتے ہوئے بھی۔[۲۰]

جب پاکستان نے کسی تحفظ کے بغیر جنگ کوریا میں امریکا کے موقف کی مکمل حمایت کی' تو امریکی وزیر خارجہ ڈین ایچی سن نے ۱۱ مئی ۱۹۵۱ء کو کراچی میں امریکی سفیر کو تار بھیجا:

> [پاکستانی] وزارت خارجہ میں جا کر زور دیں کہ پاکستان اپنی فوج کوریا بھیجے' کہ یہی پاکستان کے اپنے مفاد میں ہے۔[۲۱]

۲۰- دستاویزات' ص ۳۳

۲۱- ایضاً' ص ۵۲' ۵۳

امریکی سفیر اب سیانا ہو چکا تھا' وہ سیدھا وزیراعظم کے پاس پہنچ گیا۔ جناب لیاقت علی خاں نے ایک ڈویژن فوج بھیجنے کے لیے آمادگی ظاہر کی' لیکن صاف صاف اس کی قیمت بھی مانگ لی: ''یہ فیصلہ کی گھڑی ہے۔ پاکستان صرف کوریا میں ہی نہیں' شرق اوسط میں بھی امریکا کے ساتھ چلنے کو تیار ہے ___ بشرطیکہ امریکا' پاکستان کا ساتھ دے ___ بالخصوص کشمیر میں ___ اور پختونستان کے مسئلے پر''۔ امریکی سفیر نے کشمیر پر ایک بیان کی سفارش کر دی۔

لیکن امریکی وزیرخارجہ ڈین ایچی سن نے پاکستانی وزیراعظم لیاقت علی خاں کی جانب سے معاملہ فہمی کی اس تجویز پر اپنے ۲۴ مئی ۱۹۵۱ء کے تار میں سخت ناراضی کا اظہار کرتے ہوئے کہا:

> کشمیر اور افغانستان پر امریکا کی مکمل اور غیرمشروط حمایت کے بدلے لیاقت کی فوجی دستوں کی پیش کش ہم قبول نہیں کر سکتے ___ پاکستان کو قائل کرنے کے لیے امریکا زیادہ سے زیادہ کوریا میں پاکستانی ڈویژن کو اسلحہ اور خرچ دینے کی پیش کش کر سکتا ہے [گویا جنگ کوریا میں اپنے جوانوں کے ساتھ دیگر اخراجات بھی پاکستان کو اٹھانا تھے]۔ لیاقت کی تجویز اس لیے ناقابلِ قبول ہے کہ امریکا کی طرف سے اس قسم کے مسائل پر پاکستان کی حمایت کا منطقی نتیجہ یہ ہوگا کہ (الف) بھارت اور افغانستان ہم سے بالکل کٹ جائیں گے' (ب) ایشیا میں آج کے اور کل کے مسائل پر امریکا کی آزادی عمل محدود ہو جائے گی ___ جب کہ فوجی دستے فراہم کرنا تو اقوام متحدہ کے چارٹر کے تحت پاکستان کی ذمہ داری بنتی ہے۔[22]

معلوم نہیں کہ پاکستانی حکمرانوں کو بین الاقوامی سیاست کا صحیح ادراک نہیں تھا' یا وہ خودفریبی کا شکار تھے' یا پھر جان بوجھ کر خودفریبی میں مبتلا رہنا چاہتے تھے۔ بسا اوقات یہ گمان گزرتا ہے کہ قوم سے جھوٹ بولنے اور اس کو فریب دینے کی روایت بھی یہاں بڑی دیرینہ اور

۲۲- دستاویزات' ص ۵۵

مستحکم ہے' شاید وہ اسی میں مشغول ہوں۔ بہر حال یہ مفروضہ حرز جاں بنائے رکھنا کہ امریکا کی ترجیحات کبھی وہ بھی ہو سکتی تھیں جو پاکستان کی ہیں' احمقانہ بھی تھا اور تباہ کن بھی۔ چنانچہ پاکستان نے اپنے اسٹرے ٹیجک مفاد کے لیے جتنا مکمل اعتماد اپنے حلیف امریکا پر کیا' امریکا کبھی اس اعتماد پر پورا نہ اترا۔

سلامتی کی ضمانت

پاکستانی حکمران امریکا سے صرف اسلحے کے طالب نہ تھے' بلکہ وہ مسلسل بھارت کے خلاف اپنی سلامتی کے لیے بھی اس کی ضمانت کے خواہش مند رہے ہیں۔ خصوصاً جب امریکا کی جنگ لڑنے کے لیے 'کرائے کے سپاہی' دینے کا سوال اٹھتا تو پاکستان ایسی ہی ضمانت کا مطالبہ کرتا۔ مگر امریکا یہ قیمت دینے کے لیے کبھی تیار نہیں ہوا' بلکہ اس نے کبھی تسلیم ہی نہیں کیا کہ پاکستان کو اصل خطرہ بھارت سے ہے۔[۲۳] شروع میں ایوب خاں کے مطالبے کے جواب میں' امریکا نے اس مشکل کا حل یہ نکالا کہ ۱۹ مئی ۱۹۵۴ء کے دفاعی معاہدے میں ''خطرہ'' کا تعین مبہم چھوڑ دیا' اور بھارت یا کمیونسٹ روس کا ذکر کرنے کے بجائے اقوام متحدہ کے چارٹر کے خوش نما الفاظ کا سہارا لیا۔

پاکستانی مسلح افواج کے کمانڈر انچیف جنرل محمد ایوب خاں نے اکتوبر ۱۹۵۸ء میں پاکستان میں مارشل لا لگانے کے بعد یہ مسئلہ پھر اٹھایا۔ ۵ مارچ ۱۹۵۹ء کے باہمی تعاون کے معاہدے میں بھی امریکا' پاکستان کی سلامتی کی ضمانت دینے پر آمادہ نہ ہوا' البتہ یہ کہنے پر رضا مند ہو گیا:

۲۳- شیریں طاہر خیلی: The United States and Pakistan: The Evolution of an Influence Relationship۔ ناشر: پریگر نیویارک' ۱۹۸۲ء' ص ۴'۵ (اس مضمون میں مذکورہ کتاب کا حوالہ بطور ایولیوشن دیا جائے گا)

امریکا، پاکستان کی آزادی اور سالمیت کی بقا کو اپنے قومی مفاد اور عالمی امن کے لیے ضروری سمجھتا ہے اور" پاکستان کے خلاف جارحیت کی صورت میں ــــــ ایسے مناسب اقدامات کرے گا ــــــ جن پر فریقین باہم متفق ہوں۔[۲۴]

ان خوش نما الفاظ کی خیرات دینے کے بدلے میں امریکا نے صدر جنرل ایوب خاں سے پشاور میں جاسوسی کا اڈہ حاصل کرلیا۔ پاکستان میں معاہدہ ۱۹۵۹ء کے ان الفاظ کو ضمانت ہی سمجھا گیا، اور پہلے پہل امریکا نے بھی اس کی تردید کرنا خلاف مصلحت سمجھا۔ لیکن حقیقت جلد کھل کر سامنے آگئی۔

۱۹۶۲ء میں امریکی صدر جان ایف کینیڈی نے طیاروں کے ذریعے بھارت کو بھاری تعداد میں اسلحہ بھیجنے میں لمحہ برابر دیر نہ لگائی، اور صدر ایوب خاں سے وعدے کے باوجود پاکستان سے کوئی مشورہ تک نہ کیا۔ ستمبر ۱۹۶۵ء میں جب بھارت نے پاکستان پر حملہ کیا، تو مدد تو درکنار، امریکا نے پاکستان کو ہر قسم کا اسلحہ دینے پر پابندی عائد کردی۔ [نومبر، دسمبر] ۱۹۷۱ء میں جب بھارت نے مشرقی پاکستان پر حملہ کرکے پاکستان کو دو ٹکڑے کردیا تو امریکا نے انگلی تک نہ ہلائی۔

صاف بات ہے کہ امریکا کو متحدہ پاکستان کی سالمیت سے کوئی دلچسپی نہ تھی، اور بنگلہ دیش بننے پر بھی کوئی اعتراض نہ تھا۔ امریکی صدر [۱۹۶۹-۷۴ء] رچرڈ نکسن نے بعد میں کہا:

> ہم یہ تسلیم کرتے تھے کہ کسی سیاسی سمجھوتے کے نتیجے میں مشرقی پاکستان آزاد ہوگا اور ہم اس مقصد کے لیے کام کرنے کو بھی تیار تھے۔[۲۵]

امریکی وزیر خارجہ ڈاکٹر ہنری کسنجر کی سربراہی میں 'واشنگٹن اسپیشل ایکشن گروپ' کی رودادوں میں یہ وضاحت بھی موجود ہے:

۲۴- دستاویزات، ص ۱۵۶، ۱۵۷

۲۵- ایضاً، ص ۲۲، اور ۲۰۱

پاکستان کی سلامتی کے لیے امریکا کی کوئی قانونی ذمہ داری نہیں۔[۲۶]

ہاں' دسمبر ۱۹۷۱ء کے دوران جب یہ خدشہ ہوا کہ بھارت' آزاد کشمیر اور مغربی پاکستان پر بھی قبضہ کرلے گا' تو امریکا نے اسے' اپنے مفاد میں' روکنے کی ضرور کوشش کی۔

۱۹۸۰ء میں مارشل لا ایڈمنسٹریٹر اور پھر صدر [جولائی ۱۹۷۷ء- اگست ۱۹۸۸ء] جنرل محمد ضیا الحق نے' افغانستان پر روسی حملے سے پیدا شدہ امکانات میں امریکی صدر [۱۹۷۷-۸۱ء] جمی کارٹر کی انتظامیہ سے بات چیت کے دوران پھر ایک ایسے باقاعدہ معاہدے پر زور دیا جو پاکستان کی مشرقی سرحد کے تحفظ کی ضمانت دے' اور جس کی توثیق کانگرس بھی کرے۔ مگر امریکا نے پوری ڈھٹائی سے یہ مطالبہ ماننے سے پھر انکار کر دیا۔ صدر جمی کارٹر نے پاکستان کو بہلانے کے لیے کانگرس کے سامنے صرف ۱۹۵۹ء کے معاہدے کو دہرا دیا' جو ۱۹۶۵ء اور ۱۹۷۱ء کی پاک بھارت جنگوں کے دوران پاکستان کے لیے کھوکھلا ثابت ہو چکا تھا۔

حصول اسلحہ فطری مجبوری' مگر......

جس بے سروسامانی کے عالم میں پاکستان بنا' اس کی وجہ سے امریکا کے در تک جانے میں اس کا ایک اہم ہدف اسلحے کا حصول تھا۔ ۱۹۵۵ء- ۱۹۶۵ء کے دوران امریکا کے فراہم کردہ ۹۰ کروڑ ڈالر کے اسلحے نے یقیناً پاکستان کی دفاعی صلاحیت میں نمایاں اضافہ کیا۔ لیکن اسلحہ جس مقدار میں ملا' اس کی بڑی گراں سیاسی قیمت ''پہلے'' یا ''بعد'' میں وصول کر لی گئی' مگر اسلحہ نہیں دیا گیا' اور پھر جس رفتار سے فراہم کیا' اس میں جس طرح بار بار بندشیں لگتی رہیں' وہ یہ ظاہر کرنے کے لیے کافی ہے کہ فی الواقع یہ اسلحہ پاکستان کے دفاع اور سلامتی کے لیے نہ تھا ـــــ یہ سوال اپنی جگہ قابلِ غور ہے کہ کیا اس اسلحے کے لیے پاکستان کو وہ گراں اسٹرے ٹیجک قیمت ادا کرنا چاہیے تھی جو اس نے کی؟

۲۶- دستاویزات' ص ۲۲' ۱۶۶' ۱۸۴

امریکا نے پاکستان کو اسلحے کی فراہمی پر پہلی بار پابندی ۱۲ مارچ ۱۹۴۸ء میں لگائی۔ کشمیر میں فوجی کارروائیوں کے آغاز کے نتیجے میں' امریکی وزیر خارجہ جارج مارشل کی سفارش پر صدر [۵۳-۱۹۴۵ء] ٹرومین نے 'بغیر اعلان کے یہ غیر رسمی پابندی عائد کی'[۲۷] غیر جانب داری کے نام پر یہ پابندی اتنی شدید تھی کہ جب مئی ۱۹۴۸ء میں برطانوی حکومت نے کچھ کارتوس پاکستان کو بیچنا چاہے تو امریکا نے اس کو بھی منع کر دیا۔ یہ پابندی ۲۹ مارچ ۱۹۴۹ء کو اٹھائی گئی۔

اسلحہ فراہم کرنے کے تقریباً دس سالہ دور کے بعد' جس دوران پاکستان نے امریکا کے علاوہ کسی سے کوئی اسلحہ نہیں لیا' اور اس اسلحے سے پاکستان کی دفاعی صلاحیت اس 'مقام' پر پہنچ گئی تھی کہ وہ بھارت کے حملہ کو '۱۷ دن' [۶ ستمبر-۲۲ ستمبر ۱۹۶۵ء] تک روک سکے۔ ۸ ستمبر ۱۹۶۵ء کو امریکی صدر [۶۸-۱۹۶۳ء] لنڈن بی جانسن نے دوسری بار پاکستان کو ہر قسم کے اسلحے کی ترسیل پر' بلکہ تمام معاشی امداد پر مکمل پابندی عائد کر دی۔ عملاً یہ پابندی اس وقت سے اب تک تقریباً مسلسل ہی چلی آرہی ہے' سوائے چند بے نتیجہ عارضی وقفوں کے' یا امریکی صدر [۸۹-۱۹۸۱ء] رونالڈ ریگن کے دور میں افغان جہاد کی وجہ سے چند سال کچھ امداد کے شمار کر لیے جائیں۔

صدر جانسن نے یہ پابندی بھی امریکا کی مکمل 'غیر جانب داری' کے نام پر لگائی۔ لیکن وہ پاکستان سے صرف اس لیے ناراض نہ تھے کہ اس نے کشمیر میں کیوں مداخلت کی' بلکہ وہ اسے اس بات کی سزا بھی دے رہے تھے کہ اس نے ۱۹۶۲ء میں بھارت کو دی گئی امریکی امداد کو خاموشی سے کیوں قبول نہیں کیا اور اس پر کیوں احتجاج کیا۔ چین سے تعلقات کیوں استوار کیے' اور فضائی سروس کیوں شروع کی۔ پھر امریکی فوجوں کی معاونت کے لیے ویت نام میں فوجی دستے بھیجنے سے کیوں انکار کیا۔ یہ پابندی بھی جانب دارانہ تھی' کیونکہ بھارت تو صرف

۲۷- دستاویزات' ص ۹۸

۱۰ فی صد سپلائی امریکا سے لیتا تھا' جب کہ پاکستان کا انحصار مکمل طور پر امریکا پر تھا۔ اشتراکی روس نے ۱۹۶۵ء کی جنگ ختم ہوتے ہی بھارت کو اعلیٰ قسم کے اسلحہ کی ترسیل شروع کر دی' لیکن امریکا کی پالیسی میں پاکستان کے لیے کوئی نرم گوشہ نہ پیدا ہوا۔

پھر صدر نکسن نے سوشلسٹ عوامی جمہوریہ چین سے تعلقات استوار کرانے میں پاکستان کی مدد کے صلے میں' ۱۹۶۹ء میں ''صرف ایک دفعہ'' کی بنیاد پر' نہ کہ ''دروازہ کھول دینے'' کے لیے' پاکستان کو نقد ادائیگی پر تین سو مسلح فوجی بردار گاڑیاں (APC) فراہم کرنے کی منظوری دینے کا ''عظیم احسان'' کیا۔ لیکن ۷۱-۱۹۷۰ء میں مشرقی پاکستان میں فوجی کارروائی اور کانگرس کی شدید مخالفت کے باعث صدر رچرڈ نکسن بات اس سے آگے نہ بڑھا سکے' بلکہ اپریل ۱۹۷۱ء میں پھر مکمل پابندی لگا دی گئی' اور ان تین سو گاڑیوں کی فراہمی بھی معطل کر دی' جن کی قیمت پاکستان ادا کر چکا تھا۔ ان گاڑیوں کی فراہمی ۱۹۷۵ء میں جا کر مکمل ہوئی۔

صدر اور پھر وزیراعظم [۷۷-۱۹۷۱ء] ذوالفقار علی بھٹو نے بھی امریکی اسلحے کی 'کھڑکی' کھلوانے کے لیے جان توڑ کوشش کی۔ ان کے واشنگٹن کے دورے کے بعد اپریل ۱۹۷۲ء میں ''کھڑکی'' ذرا سی کھولی گئی' اور کچھ فاضل پرزے فراہم کیے گئے۔ اس کے لیے مسٹر بھٹو نے کھلے دل سے امریکا کا شکریہ ادا کیا۔ اس کے بعد جب امریکا نے دیکھا کہ پاکستان: روس' فرانس اور چین سے اسلحہ خرید رہا ہے' اور ایران اور سعودی عرب نے بھی پاکستان کی سفارش کی ہے' تو درمیانی مدت میں صدر نکسن کے جانشین صدر [۷۷-۱۹۷۴ء] جیرالڈ فورڈ نے فروری ۱۹۷۵ء میں یہ پابندی اٹھالی۔ لیکن اس سے پہلے کہ اس اقدام سے پاکستان کو کچھ مل سکتا' مارچ ۱۹۷۶ء میں پاکستان نے فرانس سے ایٹمی ری پراسسنگ پلانٹ کا معاہدہ کر لیا۔ اس طرح پاکستان کے ایٹمی پروگرام کا قضیہ کھڑا ہو گیا۔

اگست ۱۹۷۶ء میں امریکی وزیرخارجہ ہنری کسنجر پاکستان آئے اور پاکستان کو فرانسیسی ایٹمی ری پراسسنگ پلانٹ کی خریداری سے باز رہنے کی قیمت کے طور پر ایک سو اے-۷

جیٹ لڑاکا طیارے پاکستان کو فروخت کرنے کا لالچ دیا۔ تب پاکستانی فوج ''غیر یقینی'' ایٹمی پروگرام کے بجائے ''نقد'' لڑاکا طیاروں کو قبول کرنے کے حق میں تھی' مگر پاکستان کے وزیراعظم جناب ذوالفقار علی بھٹو کو بجاطور پر امریکی وعدے پہ یقین نہ تھا کہ یہ جہاز مل بھی جائیں گے۔ چنانچہ جب بڑے سوچ بچار کے بعد پاکستان نے یہ طیارے خریدنے کی درخواست دے ہی دی تو صدر جمی کارٹر نے اسے مسترد کر دیا۔

دلچسپ بات یہ ہے کہ امریکی صدر جمی کارٹر نے زور شور کے ساتھ اسلحہ کی فروخت پر پابندی کی ایک عمومی پالیسی بنائی' اس کے باوجود پہلے چار مہینوں (مئی تا ستمبر ۱۹۷۷ء) میں ۱۸ ملکوں کو ۴ ارب اور ۱۰ کروڑ ڈالر کے اسلحے کی فروخت کے ۴۵ معاہدے ہوئے۔ ہاں' پروپیگنڈا کے اس سارے زور شور کا ہدف صرف ایک ملک بنا' اور وہ تھا پاکستان۔ یہ حشر ہوا ہنری کسنجر کی پیش کش کا۔ یہ بات بھی دلچسپ ہے کہ اسلحے کی برآمد پر کنٹرول کے قانون میں صرف پاکستان کو ہدف بنانے کے لیے قانون بنایا گیا کہ: ''جو ملک ایٹمی پلانٹ خریدے اسے کوئی اسلحہ فراہم نہ کیا جائے'' ___ اس قانون کے تحت اپریل ۱۹۷۹ء میں ایک بار پھر پاکستان کو ہر قسم کی فوجی امداد کی فراہمی بند کر دی گئی۔ یہاں تک کہ جو پاکستانی افسر پیشہ ورانہ تربیت کے لیے امریکا گئے ہوئے تھے' ان کو بھی واپس بھیج دیا گیا۔

دسمبر ۱۹۷۹ء میں افغانستان پر اشتراکی روس نے حملہ کیا' تو امریکا کے رویے میں راتوں رات تبدیلی آ گئی۔ اب پٹرول کی دولت سے مالا مال جزیرہ نمائے عرب میں امریکی مفادات کو شدید خطرہ لاحق ہو گیا تھا۔ لیکن اس کے باوجود کہ امریکا کے پاس پاکستان کا کوئی متبادل نہ تھا' انھوں نے پاکستان کو دو سال کی مدت میں صرف ۱۰۰ ملین ڈالر سالانہ کی فوجی امداد کی پیش کش کی۔ صدر رونالڈ ریگن نے اس پیش کش کو ذرا معقول صورت دی۔ پاکستان کے اصرار پر ایف-۱۶ طیاروں کے تین اسکواڈرن فروخت کرنا منظور کیا' قیمت بھی لے لی' لیکن وہ طیارے امریکا ہی میں کھڑے رہے۔

۱۹۶۵ء میں امریکا کی طرف سے بھارت کو اسلحے کی زبردست فراہمی' ۱۹۶۵ء میں پاکستان جوہری پر مکمل پابندی' ۱۹۷۱ء میں بھارت کے حملے اور بنگلہ دیش کے قیام کا پاکستان نے صدمہ برداشت کیا۔ پھر [۱۸ مئی]۱۹۷۴ء کو بھارت نے ایٹم بم کا دھماکا کر دیا۔ اس ایٹم بم کی قوت ۱۹۴۵ء میں ہیروشیما اور ناگاساکی پر پھینکے جانے والے امریکی ایٹم بم[۲۸] کے لگ بھگ تھی۔ اس تباہ کن صورت حال کو دیکھ کر پاکستان کے وزیراعظم ذوالفقار علی بھٹو نے ایٹم بم بنانے کی پاکستانی صلاحیت پیدا کرنے کا فیصلہ کیا۔ یاد رہے کہ پاکستانی قیادت کے اس نتیجے پر پہنچنے سے پیش تر یہ ایٹم بم اسرائیل بنا چکا تھا' بھارت بنا چکا تھا' جنوبی افریقہ بنا چکا تھا لیکن امریکا کا سارا نزلہ پاکستان پر گرا۔

۱۹۷۶ء میں پاکستان نے فرانس سے ایٹمی ری پراسسنگ پلانٹ خریدنے کا معاہدہ کیا' جس سے وہ بم کے لیے مطلوب یورینیم حاصل کر سکتا تھا۔ امریکا نے اپنے 'یار وفادار' پاکستان کو ایک عبرت ناک مثال (horrible example) بنانے کے لیے کارروائیاں شروع کر دیں۔ ۱۹۷۶ء میں ہنری کسنجر دھمکی دے کر چلے گئے' صدر جمی کارٹر نے پاکستان کو روکنے کے لیے اقدامات شروع کر دیئے' بیچ میں افغان جہاد کی وجہ سے ایک وقفہ آیا' [جس کے دوران میں صدر جنرل محمد ضیاء الحق نے ایٹمی پروگرام تیزی سے آگے بڑھانے کی سودمند کوششیں کیں] مگر پھر امریکا کی امتیازی کارروائیاں شروع ہو گئیں۔

ایک طرف امریکا پاکستان کو اسلحہ بیچنے کے لیے تیار نہ تھا' اور دوسری طرف وہ اسے ایٹمی صلاحیت حاصل کرنے کی کوشش کے جرم میں سبق سکھانے پر تل گیا تھا۔ ایک طرف صرف

۲۸- دوسری جنگ عظیم کے اواخر میں امریکا نے جاپان کے ان دونوں شہروں پر بالترتیب ۶ اور ۹ اگست ۱۹۴۵ء کو ایٹم بم گرائے' جن کے نتیجے میں ۲ لاکھ سے زیادہ عورتیں' بچے اور مرد چشم زدن میں ہلاک ہو گئے۔ ان ہلاک شدگان کی ۹۲ فی صد تعداد نہتے سویلین پر مشتمل تھی۔ لاکھوں افراد زخمی ہوئے یا ایٹمی تابکاری کے نتیجے میں سرطان' ٹی بی اور جلدی امراض میں مبتلا ہو کر اگلے پندرہ برسوں میں سسک سسک کر زندہ رہنے پر مجبور ہوئے' یا پھر مر گئے۔

پاکستان کو چھانٹ کر اس کے خلاف کارروائیاں کی جاتی رہیں' دوسری طرف اپنے سارے قوانین کو بالائے طاق رکھ کر' بھارت کے تاراپور ایٹمی پلانٹ کے لیے صدر جمی کارٹر نے اپنے خصوصی اختیارات استعمال کرتے ہوئے یورینیم فراہم کرنے کی اجازت دی۔

سادہ لوحی کا تسلسل

کشمیر' پاکستان کی شہ رگ ہے۔

امریکا سے پاکستان کی وابستگی کا ایک بڑا ہدف یہ بھی تھا' کہ کشمیر میں رائے شماری کرانے کے لیے امریکا اپنا وزن ڈالے گا۔ لیکن شہادتوں کے نہ ختم ہونے والے سلسلے کے باوجود امریکا نے کشمیر کے مسئلے کے لیے چند رسمی کارروائیوں اور خوش نما الفاظ کے علاوہ نہ کچھ کیا اور نہ کرنا چاہا۔ یہ امر ناقابلِ فہم ہے کہ ہمارے حکمران اس باب میں اس سے جھوٹی توقعات کیوں باندھتے رہے' اور کلی طور پر صرف اس پہ کیوں انحصار کیا؟

وزیراعظم لیاقت علی خاں اپنی سادہ لوحی میں سمجھتے تھے کہ امریکا' کشمیر میں بھارت کی جارحیت کو کوریا کی جارحیت کے مساوی سمجھے گا' جیسے لوگ توقع رکھتے رہے کہ امریکا' بوسنیا میں اسی طرح کارروائی کرے گا جس طرح اس نے خلیج میں کی۔ وہ یہ بھول جاتے ہیں کہ کوریا اور خلیج میں مغربی مفادات اور تیل بستے تھے' جب کہ کشمیر اور بوسنیا میں صرف مظلوم انسان' اور وہ بھی مسلمان۔

پاکستانی حکمران جانتے تھے کہ امریکا کے ساتھ دفاعی معاہدوں میں شرکت سے وہ اشتراکی روس' عوامی جمہوریہ چین اور 'غیر جانب دار تحریک' [NAM - جون ۱۹۶۱ء] کے دیگر ممالک کی حمایت کھو دیں گے۔ لیکن وہ یہ مخالفت مول لینے کی بھاری قیمت ادا کرنے کے لیے آمادہ ہو گئے۔ اس لیے کہ وہ اس غلط فہمی میں مبتلا تھے: 'کشمیر پر امریکا کی حمایت ان سب کی مخالفت پر بھاری ہو گی' ـــــ بھارت کو بھی ان معاہدوں کا بہانہ ہاتھ آ گیا' جس سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اس نے اشتراکی روس کا ویٹو کارڈ استعمال کیا' جو کامیاب رہا۔ پھر بھارت نے

وعدہ کرنے کے باوجود جموں وکشمیر میں رائے شماری کرانے سے انکار کر دیا۔ مسلم ممالک کی حمایت بھی پاکستان نے کھودی۔ مصر کے صدر جمال عبدالناصر نے پاکستان کو 'مغربی سامراج' کا پٹھو قرار دیا' اور اعلان کیا کہ: ''نہر سویز' ہمیں اتنی ہی عزیز ہے' جتنا بھارت کو کشمیر''۔[۲۹]

جب اشتراکی روس' اقوام متحدہ میں رائے شماری کے حق میں اپنے موقف سے پھر گیا' تو امریکا نے کسی ردعمل کا اظہار نہیں کیا۔ ابتدا میں پاکستان نے بھی اس کو کوئی اہمیت نہ دی۔ وہ امریکا کی حمایت کو کافی سمجھتا تھا۔ بالآخر روسی وزیراعظم [۵۸-۱۹۵۵ء] بلگانن اور وزیراعظم [۶۴-۱۹۵۸ء] خروشیف نے یہ اعلان کیا: ''کشمیر' بھارت کا اٹوٹ انگ ہے''____اس درفنطنی پر بھی امریکا ٹس سے مس نہ ہوا۔ ۱۹۶۲ء میں بھارت اور چین کی لڑائی شروع ہوئی' تو امریکا نے سب سے بڑھ کر اس بات کی کوشش کی کہ ''اس مرحلے پر پاکستان' بھارت کے لیے کوئی مشکل نہ پیدا کرے' بلکہ کشمیر کے بارے میں منہ سے بھاپ بھی نہ نکالے''۔ امریکی صدر جان ایف کینیڈی نے اس مقصد کے لیے پاکستانی صدر محمد ایوب خاں کو خط لکھے اور اپنے خصوصی ایلچی بھیجے۔

[روسی ثالثی میں پاکستان اور بھارت کے مابین] معاہدہ تاشقند [۱۰ جنوری ۱۹۶۶ء] کے بعد کشمیر کا مسئلہ گویا سب کے ایجنڈے سے محو ہو گیا' یہاں تک کہ کشمیری مجاہدین نے ۱۹۸۸ء میں اپنے خون سے مسئلہ کشمیر کے المیے کو دوبارہ رقم کرنا شروع کیا۔ اس مرحلے پر جب بھارت کشمیر میں بدترین مظالم ڈھا رہا ہے' امریکا یا تو پاکستان کو 'دہشت گرد' قرار دینے کی دھمکیاں دے رہا ہے' یا ایسے حل تلاش کرنے میں مصروف ہے' جن سے بھارت ناراض نہ ہو' جہاد بھی ٹھنڈا پڑ جائے اور امریکا کے مفادات پورے ہونے کا بھی کوئی راستہ نکل آئے۔

......نقش پا کے سجدے

پاکستانی حکمرانوں نے شروع ہی سے یہ طے کر کے امریکا سے تعلقات قائم کیے تھے'

۲۹- شیریں طاہر خیلی: ایولیوشن' ص ۱۳

کہ انھیں صرف امریکا ہی کا بن کر رہنا ہے، کسی اور کی طرف نگاہ اٹھا کر نہیں دیکھنا۔ بیچ میں روٹھنے اور خود ہی مان جانے کے کچھ مراحل آئے، لیکن حکمرانؔ وفاداری بشرط استواری اصل ایمان ہے، کی راہ پر گامزن رہے اور اب بھی اسی راستے پر گامزن ہیں۔

امریکی صدر ہیری ایس ٹرومین نے ۱۹۴۹ء میں بھارتی وزیراعظم [۱۹۴۷-۶۴ء] پنڈت جواہر لعل نہرو [م: مئی ۱۹۶۴ء] کو امریکا کے دورے کی دعوت دی، اور پاکستان کی طرف سے خواہش کے باوجود پاکستان کے وزیراعظم لیاقت علی خاں کو نظرانداز کر دیا۔ جب لیاقت علی خاں نے روس کی طرف سے ماسکو کے دورے کی دعوت قبول کر لی، تو صدر ٹرومین نے ۲۳ نومبر ۱۹۴۹ء کو انھیں دورۂ امریکا کی دعوت دے دی۔ لیاقت علی خاں نے فوراً ماسکو کا دورہ منسوخ کر دیا۔ یہ دورہ ایسا منسوخ ہوا کہ پھر اس کے ۱۶ سال بعد صدر ایوب خان پہلے پاکستانی سربراہ تھے، جو اپریل ۱۹۶۵ء میں ماسکو گئے۔ تلخی کی یہ فضا اتنی دیر تک برقرار رہی۔ جب کہ روس ایک عالمی طاقت اور پاکستان کا پڑوسی بھی تھا۔

امریکا سے تعلقات کی خاطر پاکستان نے مسلم ممالک کو بھی نظرانداز کر دیا، یہاں تک کہ نہر سویز کے مسئلے پر بھی وہ مغرب کی صف میں کھڑا ہو گیا ـــــ تحریکِ پاکستان کے ممتاز رہنما اور پاکستان کے وزیراعظم [۱۲ ستمبر ۵۶ء - ۱۸ اکتوبر ۱۹۵۷ء] حسین شہید سہروردی [م: ۱۹۶۴ء] نے دسمبر ۱۹۵۶ء کو قومی اسمبلی میں تقریر کے دوران کہا:

ـــــ امریکا اور برطانیہ جیسی بڑی طاقتوں کے ساتھ بندھنے کے بجائے ہم مسلمان ملکوں کے ساتھ متحد کیوں نہیں ہوتے؟ میرا جواب ہے کہ صفر+صفر+صفر، بہرحال صفر ہی رہے گا۔[۳۰] [۲۲ فروری ۱۹۵۷ء کو انھوں نے فرمایا:] ''یہ ہماری بڑی خوش قسمتی ہے کہ ہماری پشت پر ایک طاقت ور ملک ہے جو ہماری سالمیت اور سیاسی

۳۰- دستاویزات، ص ۱۲۵

آزادی کی ضمانت دے رہا ہے۔[31] [پھر ۲۵ فروری کو جناب سہروردی نے مزید لب کشائی کی:] ''وہ یہ یاد رکھیں کہ ہم دل وجان سے ان کے ساتھ ہیں ــــــ اگرچہ ہم چھوٹے ہیں ــــــ ان کو ہم سے زیادہ بڑا وفادار دوست نہیں ملے گا۔[32]

پاکستانی صدر' فیلڈ مارشل' محمد ایوب خاں نے جولائی ۱۹۶۰ء کے مجلّہ فارن افیئرز میں لکھا: پاکستان نے کھلم کھلا اور غیر مشروط طور پر اپنی قسمت مغرب کے ساتھ وابستہ کر دی ہے۔[33] بعدازاں ۱۷ جولائی ۱۹۶۱ء کو فیلڈ مارشل ایوب خان نے [امریکی سینیٹ سے خطاب کرتے ہوئے] فرمایا: ''میں آپ کو بتا رہا ہوں کہ [امریکا کے لیے] اگر سچ مچ کوئی مصیبت اٹھ کھڑی ہوئی تو ایشیا میں پاکستان کے علاوہ کوئی قوم ایسی نہ ملے گی جس پر اعتماد کیا جا سکے''۔[34]

امریکا نے جب آنکھیں پھیرنا شروع کیں' تو ایوب حکومت کے مرکزی وزیر ذوالفقار علی بھٹو نے ۲۴ جولائی ۱۹۶۳ء کو قومی اسمبلی میں خطاب کرتے ہوئے گلہ کیا:

ــــــ ہم نے مغرب کے لیے قربانیاں دی ہیں۔ مسٹر خروشیف نے ہمیں دھمکی دی کہ پاکستان کو نیست و نابود کر دیا جائے گا۔ ہم نے اپنا پورا مستقبل مغرب کے ساتھ اتحاد کر کے داؤ پر لگا دیا۔ دونوں [یعنی امریکا اور روس] کے درمیان جنگ کی صورت میں ہم نے ایٹمی جنگ [کی تباہ کاری تک برداشت کرنے] کا خطرہ مول لیا' لیکن آج کیا ہو رہا ہے؟[35]

پاکستان نے' جو امریکا کا یارِ وفادار رہا ہے اور اب بھی ہے۔ اس نے امریکا کے علاوہ

۳۱- دستاویزات' ص ۱۳۴

۳۲- ایضاً' ص ۱۲۸

۳۳- ایضاً' ص ۱۱۸

۳۴- ایضاً' ص ۲۰۳

۳۵- ایضاً' ص ۲۲۳

کسی دوسرے ملک کے دروازے پر دستک دینے کے لیے نگاہ اٹھا کر بھی دیکھا تو امریکا نے پاکستان کی تذلیل وتحقیر کرنے میں لمحہ بھر تاخیر نہ کی' اور سزا بھی دی۔ جب ۱۹۶۲ء میں امریکا نے بھارت کو زبردست مقدار میں اسلحہ دیا' تو صدر محمد ایوب خان نے جوابی کارروائی کے طور پر مارچ ۱۹۶۳ء میں عوامی جمہوریہ چین کے ساتھ سرحدی معاہدہ کرلیا' پھر بیجنگ تک فضائی سروس شروع کردی' اور ۱۹۶۴ء میں امریکی صدر لنڈن بی جانسن کی طرف سے ویت نام [کی جنگ ۷۵-۱۹۵۴ء] میں پاکستانی فوجی دستے بھجوانے کی خواہش کی تعمیل سے انکار کردیا۔

صدر جانسن نے اپنی ناراضی ظاہر کرنے کے لیے اپریل ۱۹۶۵ء میں صدر ایوب خان کا مجوزہ دورہ امریکا منسوخ کردیا' اور ۱۹۶۵ء میں ہونے والی پاکستان کے امدادی کنسورشیم کی میٹنگ بھی منسوخ کرادی۔ گویا امریکا ایک عالمی طاقت ہونے کی حیثیت سے آزاد تھا کہ جس سے چاہے "تعلق" قائم کرے اور پاکستان سے' جب اور جیسا چاہے سلوک کرے۔ پاکستان کو ایک چھوٹے محتاج اور باج گزار ملک ہونے کی وجہ سے یہ اجازت نہ دی جاسکتی تھی کہ وہ ذرہ برابر اپنی مرضی کا مظاہرہ کرے۔

امریکا سے ہم کوئی گلہ شکوہ کرنا صحیح نہیں سمجھتے۔ اس نے ہمیں کبھی دھوکے میں نہیں رکھا۔ اس کی پالیسی آغاز ہی سے یکساں اور واضح رہی ہے۔ ہم ہی نے جھوٹی توقعات باندھیں' اور خودفریبی میں مبتلا رہے۔ اس کی پالیسی بین الاقوامی سیاست کے اس معروف اصول کے عین مطابق رہی ہے کہ: "کوئی دوست' مستقل دوست نہیں ہوتا' اصل دوستی صرف اپنے مفادات سے ہوتی ہے"۔ ہمارا گلہ شکوہ ہے تو اپنے حکمرانوں سے ہے۔ انھوں نے اپنے مفادات کو فراموش کردیا' آنکھیں بند کر کے امریکا سے مستقل دوستی استوار کرلی۔ اس کی پشت پناہی کو کافی سمجھا اور پے درپے بین الاقوامی سیاست کی تلخ حقیقتوں سے دوچار ہونے کے باوجود انھی پتوں پر آج بھی تکیہ کیے ہوئے ہیں۔

تعلقات کی تشکیل نو کا چیلنج

آج درون پردہ کیا ہو رہا ہے؟ ــــ اس سے ہم کوئی بہت زیادہ باخبر نہیں' لیکن محسوس یہی ہوتا ہے کہ ماضی کے سارے اسباق' سیاست عالم میں دُوررس تبدیلیوں' اور دنیا میں برپا تہذیبی کش مکش کے باوجود' یہ تعلقات ماضی کی نہج سے کچھ زیادہ مختلف انداز میں پروان نہیں چڑھ رہے۔

امریکا کی طرف سے پاکستان پر چاند ماری (Pakistan-bashing) ہے' دوسری جانب کھلی بھارت نوازی۔ پاکستان کے لیے ایٹمی پروگرام سے دست برداری اور منڈیاں کھول دینے پر اصرار ہے' کہ کمیونزم کے زوال کے بعد' جنگی ڈون' میدانِ جنگ اور کرائے کے سپاہیوں کی ضرورت ختم ہوگئی ہے۔ پاکستان کی طرف سے ڈالروں اور اسلحہ کے لیے گدائی' اور اس کے عوض امریکی مطالبات کی تکمیل کے لیے اپنا جواز پیش کرنے کی تگ ودو۔

بلاشبہہ امریکا کے ساتھ خوش گوار تعلقات ہماری قومی وسیاسی ضرورت بھی ہیں۔ اس لیے ہم سمجھتے ہیں کہ ان تعلقات کی نئے خطوط پر تشکیل نو کی ضرورت ہے:

۱- اس تشکیل نو کے لیے سب سے پہلے سیاست عالم کا صحیح ادراک ضروری ہے۔ پاکستان کے ہاتھ ترپ کا پتا امریکی حکومت کے لیے اشتراکیت [کمیونزم] کی توسیع کا خوف تھا۔ اب یہ پتا پاکستان کے ہاتھ میں نہیں رہا۔ بھارت کی بڑھتی ہوئی فوجی طاقت کی روک تھام کرنا' یا اس کے ساتھ پاکستان کے عدمِ توازن کو کم کرنا' امریکا کے ایجنڈے میں کوئی مقام نہیں رکھتا۔ بلکہ' اس کے برعکس اس کا مفاد یہ ہے کہ بھارت کی طاقت بڑھتی رہے۔ پاکستان اپنی حدود میں رہے' ایٹمی صلاحیت اور جارحانہ اسلحہ حاصل نہ کرے' اور علاقے میں بھارت کی بالادستی تسلیم کرے۔ لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ اب پاکستان کے پاس کوئی کارڈ نہیں رہ گئے۔

۲- اسی طرح مستقبل کی تہذیبی کشمکش کے امکانات اور نہج کا صحیح ادراک بھی ضروری

ہے: مغرب کے اندازے اور منصوبے' اور پاکستان کے اپنے اہداف اور کرنے کے کام کیا ہیں؟ اس لیے کہ مغرب نے ''اسلامی خطرہ'' کا جو تصور بنالیا ہے' اس کے پاکستان کے خارجہ تعلقات پر گہرے اثرات مرتب ہو رہے ہیں' اور یہ مزید گہرے ہوتے جائیں گے۔ لیکن مغرب کے سامنے اسلام کو ایک ''خطرہ'' کے بجائے ایک خوش گوار امکان کی حیثیت سے پیش کرنا ممکن ہے۔

۳- یہ جاننا چاہیے کہ ان تعلقات کو خوش گوار رکھنے کے لیے یہ ضروری نہیں ہونا چاہیے کہ پاکستان امریکا کا دست نگر بھی ہو' اور اس کے ہر مطالبے کے آگے سر جھکاتا چلا جائے۔ اپنے اہداف کے واضح شعور کے ساتھ' ثقافتی و معاشی محتاجی و گدائی سے نجات پاکر پاکستان کے لیے یہ ممکن ہونا چاہیے کہ اپنے اہم اور حساس قومی مفادات اور اپنی دینی و نظریاتی حیثیت قربان کیے بغیر بھی' لین دین کے اصول پر خوش گوار تعلقات رکھ سکے۔

۴- امریکا ایک بڑا طاقت ور ملک ہے' اور آج کی غالب مغربی تہذیب کا لیڈر ہے۔ اگرچہ اس کے مقابلے میں پاکستان ایک بہت چھوٹا ملک ہے' جسے پاکستانی مقتدر طبقے کی بے تدبیریوں اور غلط کاریوں نے بہت ''چھوٹا'' کر دیا ہے۔ ۱۹۸۷ء کے ایک امریکی تجزیے کے مطابق: ''ایک انتہائی ضعیف حلیف' مفلس اور قلاش' جس کی تاریخ سیاسی افتراق و عدمِ استحکام کی تاریخ ہے''۔[۳۶] پاکستان کے ہاتھ میں کارڈ پہلے بھی زیادہ نہ تھے' اب اور تھوڑے رہ گئے ہیں۔ اس لیے اہلِ پاکستان کو یہ شعور ہونا چاہیے کہ یہ لین دین برابر کا ہونا دشوار ہے۔ لیکن تاریخ میں اس کی بے شمار مثالیں موجود ہیں کہ ایک کمزور فریق' اگر حکمت اور واضح حکمت عملی رکھتا ہو' تو کچھ

۳۶- ورسنگ: پاکستان سیکورٹی' ص ۱۱' ۱۲

زیادہ نہ دے کر بھی آگے بڑھنے کا راستہ بنالیتا ہے' بشرطیکہ وہ ہمارے ماضی وحال کے حکمرانوں کی طرح' پہلے ہی دل و جان سے غلام بننے کو تیار نہ ہو۔ صلاح الدین ایوبی [م: ۱۱۹۳ء] نے لین دین میں جس نشیب و فراز سے گزر کر بیت المقدس دوبارہ [۱۱۸۷ء] فتح کیا' اس سے واقفیت رہنمائی کے لیے کافی ہے۔

۵- قومی سطح پر' مختلف سیاسی و مذہبی پارٹیوں کی جانب سے جذباتی انداز میں امریکا پر بیانات کی چاند ماری کو بھی ختم کرنا چاہیے۔ قرآن نے بتوں کو بھی برا بھلا کہنے سے منع کیا ہے۔ امریکا سے اختلاف ہوسکتا ہے' اس پر سنجیدہ اور مدلل تنقید ہونا چاہیے' اس کی دوعملی سیاست کی نقاب کشائی بھی' لیکن دشنام طرازی اور غیر منصفانہ تنقید ہمارے دین وایمان کے بھی منافی ہے' ہمارے قومی مفاد کے بھی' اور اس سے کچھ حاصل بھی نہیں۔

۶- ہمیں امریکی سیاسی نظام میں طاقت کے ہر مرکز سے اپنے اہداف کے حصول کے لیے رجوع کرنا چاہیے۔ ابتدائی دور کی دوستی کے ''سنہرے لمحات'' ایوب خاں جیسے لوگوں کے آئزن ہاور' جان فاسٹر ڈلس اور ایڈمرل ریڈفورڈ جیسے لوگوں سے ذاتی تعلقات پر قائم تھے۔ جب ڈلس کا انتقال ہوگیا اور آئزن ہاور کی جگہ جان ایف کینیڈی صدر بن گئے' تو ان کے تعلقات کے نیچے سے زمین سرکنا شروع ہوگئی۔ پاکستانی حکمرانوں نے امریکی حکومت کی دوسری شاخ' کانگرس اور سینیٹ سے تعلقات کو کوئی اہمیّت نہ دی' اور امریکا میں پاکستان کی کوئی لابی سرگرم کار نہ رہی۔ اب پاکستان کو وہاں پر اپنی مضبوط لابی بنانا چاہیے۔ پروفیشنل لابی بھی' اور پاکستانی نژاد امریکی شہریوں کی لابی بھی۔

۷- باہمی تنازعات موجود ہیں' اور رہیں گے۔ لیکن ہمیں امریکی حکمرانوں اور پالیسی سازوں' جن سے ہم معاملات کرتے ہیں اور عام امریکی افسران اور عوام کے

درمیان فرق ملحوظ رکھنا چاہیے۔ انصاف اور حق کے حوالے سے براہ راست ان کے دل و دماغ سے اپیل کرنا چاہیے۔ امریکا میں یہ ممکن ہے کہ بوسنیا کے مسئلے پر امریکی وزارت خارجہ کے تین اعلیٰ افسران استعفیٰ دے دیں' اور امریکی عوام امریکا کو ویت نام اور صومالیہ سے نکلنے پر مجبور کر دیں۔

۸- ہمیں امریکا کی تاریخ' اس کی جڑوں (roots) اور نفسیات سے بھی آگاہ ہونا چاہیے۔ یہ ملک 'اللہ سے عہد' (Covenant of God) کے ایفا اور 'حکومت الٰہیہ' (Kingdom of God) کے قیام کی جستجو میں قائم ہوا تھا۔ اگرچہ اب مشہور ماہر سماجیات رابرٹ بیلا (Robert Bellah) کے الفاظ میں: ''نقض عہد کے نتیجے میں یہ میثاق' میثاق شکستہ (broken covenant) بن چکا ہے''۔ اور امریکا میں مادہ پرستی کا غلبہ ہے' لیکن اس سے انکار ممکن نہیں کہ اس ''میثاق'' کے ورثے میں ہمیں ایسی بے شمار چیزیں مل جائیں گی' جو کَلِمَةٍ سَوَآءٍۢ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُم [آل عمرٰن ۳:۶۴' آؤ ایک ایسی بات کی طرف جو ہمارے اور تمھارے درمیان یکساں ہے] کا مصداق ہوں۔ اپنی کمزوری اور عدمِ توازن کے باوجود ہم یہ مشترک اقدار و مفادات تلاش کر سکتے ہیں' اور خوش گوار تعلقات میں یہ اپنا حصہ ادا کر سکتے ہیں۔

ہم ڈپلومیٹک عمل میں نئے متعین اقدامات کی نشان دہی نہیں کرنا چاہتے کہ یہ اس عمل سے پوری آگاہی کے بغیر' اندھیرے میں تیر چلانے کے مترادف ہوگا۔

قرآن سے رہنمائی

تقریباً نصف صدی کی غلط پالیسیوں' بدعملیوں اور امریکا کے ساتھ اندھا دھند وابستگی اور مکمل انحصار کے نتیجے میں جو تنکے بکھر چکے ہیں' ان کو جوڑ کر ہم اپنا آشیاں پھر سے تعمیر کر سکتے

ہیں۔ ضعف و شباب قوموں کا اٹل مقدر نہیں۔ صحیح سمت و مقصد اختیار کر کے اور صبر و حکمت کے ساتھ مناسب اقدامات کر کے، ہم اپنی پس ماندگی، ذلت اور محتاجی کی موجودہ حالت میں عظیم تغیر برپا کر سکتے ہیں۔

۱- صحیح سمت و مقصد سب سے مقدم ہے۔ ہم دفاع اور سلامتی کے لیے، بقا و ترقی کے لیے، صرف اللہ کی طرف دیکھنے کا فیصلہ کرلیں، امریکا کی طرف نہ کسی اور کی طرف:

وَمَنْ يَّتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ فَهُوَ حَسْبُهٗ ؕ [الطلاق ۶۵:۳] جو اپنے کو اللہ کے سپرد کر دے، اللہ اس کے لیے کافی ہے۔ اَلَّذِيْنَ قَالَ لَهُمُ النَّاسُ اِنَّ النَّاسَ قَدْ جَمَعُوْا لَكُمْ فَاخْشَوْهُمْ فَزَادَهُمْ اِيْمَانًا ۖۗ وَّ قَالُوْا حَسْبُنَا اللّٰهُ وَنِعْمَ الْوَكِيْلُ ○ [آل عمرٰن ۳:۱۷۳] جن سے لوگوں نے کہا کہ تمھارے خلاف بڑی فوجیں جمع ہوئی ہیں، ان سے ڈرو، تو یہ سن کر ان کا ایمان اور بڑھ گیا اور انھوں نے جواب دیا کہ ہمارے لیے اللہ کافی ہے اور وہی بہترین کارساز ہے۔

دجالی تہذیب کے غلبے کے اس دور میں، جب اسباب ہی ارباب بن گئے ہیں، یہ بات ''ملا کی بڑ'' لگے گی۔ جب کارڈینل ولزے [م: ۱۵۳۰ء] کو، جس نے برطانیہ کے فرماں روا ہنری ہشتم [۱۵۰۹ء-۱۵۴۷ء] سے وفاداری اور یکے بعد دیگرے اس کی شادیوں کا جواز فراہم کرنے کے لیے اجتہاد و تحریف کے لیے اپنی جان لڑادی تھی۔ انجام کار بادشاہ نے جب اسے موت کی کوٹھڑی میں پہنچا دیا، تب اس نے کہا کہ: ''اگر میں نے اتنی ہی جاں نثاری سے اپنے خدا کی خدمت کی ہوتی، تو وہ مجھے اس حسرت ناک بلکہ عبرت ناک انجام تک نہ پہنچاتا''۔ جس یکسوئی اور اخلاص سے ہم نے امریکا کی طرف دیکھا، اگر خدا کی طرف دیکھتے اور اس کا دامن پکڑتے تو اس انجام تک نہ پہنچتے۔

۲- دوسرا قدم یہ ہے کہ ہم یہ فیصلہ کرلیں کہ ہماری ترقی اور دفاع کا انحصار صرف اسلحے پر نہیں ہے جو امریکا ہمیں دے، نہ معاشی ترقی پر جو سودی قرضے لے کر ہو۔ اس مقصد کے

لیے عصائے موسوی ہماری بغل میں ہے' اور ہم رسی کے سانپوں کو دیکھ دیکھ کر کانپ رہے ہیں یا ان کے آگے سجدہ ریز ہو رہے ہیں ـــــ اِنْ يَّنْصُرْكُمُ اللّٰهُ فَلَا غَالِبَ لَكُمْ [آل عمرٰن ۳:۱۶۰] اللہ تمھاری مدد پر ہو تو کوئی طاقت تم پر غالب آنے والی نہیں' اِنْ تَنْصُرُوا اللّٰهَ يَنْصُرْكُمْ [محمد ۴۷:۷]' اللہ تمھاری مدد اس وقت کرے گا جب تم اللہ کی مدد کرو گے' وَاِنْ تَصْبِرُوْا وَتَتَّقُوْا لَا يَضُرُّكُمْ كَيْدُهُمْ شَيْئًا [آل عمرٰن ۳:۱۲۰] اگر تم صبر اور تقویٰ اختیار کر لو تو (تمھارے دشمنوں کا) کوئی حربہ تمھیں نقصان نہ پہنچا سکے گا۔

۳- اپنے پاؤں پر کھڑا ہونے یا شریعت نافذ کرنے کے لائحہ عمل میں سب سے پہلا اقدام یہ ہے کہ ہم زبان میں' لباس میں' رسوم و رواج میں' میڈیا میں مغربی ثقافت کی غلامی سے نجات حاصل کریں۔ ثقافت کا بیرا زبان کے قالب میں ہوتا ہے۔ سب سے اہم بات یہ ہے کہ ہم مناسب سطح پر بہترین انگریزی ضرور پڑھائیں' لیکن ہر درجے کے طالب علم کو لازماً نہ پڑھائیں اور نہ یہ فتویٰ ہی دیں کہ جو انگریزی نہ پڑھ سکے' وہ جاہل ہے۔ مزید یہ کہ دفاتر' عدالتوں' فوج اور بازاروں کے عمومی نظام کار کو انگریزی کے بجائے آئین پاکستان کی منشا کے مطابق قومی زبان اُردو میں روبہ عمل لائیں۔

۴- دوسرا اہم عملی اقدام یہ ہے' کہ ہم نعرہ بازی کے بجائے ٹھوس بنیادوں پر معاشی خود کفالت کی فکر کریں۔ جلد از جلد بتدریج سودی قرضوں سے نجات حاصل کریں' فضول خرچی ختم کر دیں' ترقی کے اجتہادی 'ماڈل' اختیار کریں' 'پیداوار' سے زیادہ 'انسان' کو ترقی دیں' اور جو اللہ نے ہمیں دیا ہے اسی کے اندر اپنے منصوبے بنائیں۔

۵- دفاع کے لیے ہم' درپیش خطرات کا حقیقت پسندانہ جائزہ لے کر' جرأت کے ساتھ وہ فیصلے کریں' جن سے ہماری سلامتی کا تحفظ واقعی ممکن ہو سکے۔ ہمیں آگے بڑھ کر دشمن کو روکنے کی تیاری بھی کرنا چاہیے اور سرحدوں کے دفاع کی بھی۔ لیکن دراصل ساری قوم کو ایسی عوامی مزاحمت کے لیے تیار کرنا ضروری ہے کہ کوئی دشمن اندر گھس جائے تو اس کے لیے

جینا دوبھر ہو جائے۔

۶۔ یہ سارا لائحہ عمل اسی طرح ایک خواب رہے گا، جس طرح اب تک رہا ہے، جب تک ہمیں اس پر یقین رکھنے والی، صرف حکومت کی سطح پر نہیں، بلکہ ہر شعبہ زندگی میں، اور اس کو خلوص و محنت سے عملی جامہ پہنانے والی سیاسی قیادت میسر نہ آئے۔

کیا ہماری موجودہ قیادت ـــــ حکومتی ہو یا معاشرتی ـــــ یہ کام کر سکتی ہے؟

[اگست ۱۹۹۴ء]

□□□

برابر کے بدلے کی بنیاد

مسلم، مسیحی تعلقات؟

میں نے ''اسلام اِن یورپ کمیٹی'' [جو CEC اور CCEE پر مشتمل ہے[1]] کی اس دستاویز Christian /Muslim Reciprocity. Consideration for the European Chruches کو بہت غور سے پڑھا ہے (*Encounters*' مارچ ۱۹۹۶ء' ص ۷۰-۷۵)۔ مجھے CMR کی یہ رپورٹ پڑھ کر خوشی ہوئی' اس لیے کہ آج کے دور میں' جب ہر طرف

۱- یورپ کے پروٹسٹنٹ اور کیتھولک چرچوں کے تحقیق وترقی کے اداروں:

- *Conference of European Churches (CEC, Protestant)*
- *Consilium Conferentiarum Episcopaelium Europae (CCEE, R-Catholic)*

نے ایک مشترکہ ''اسلام اِن یورپ کمیٹی'' قائم کی' جس نے اکتوبر ۱۹۹۴ء اور مارچ ۱۹۹۵ء میں جنیوا میں اپنے اجلاسوں کے نتیجے میں یہ رپورٹ تیار کی جس میں باہم احترام اور 'برابر کے بدلے کی بنیاد' یعنی reciprocity کو تعلقات کی بنیاد قرار دیا گیا تھا' یعنی: ''جو رویہ اور سلوک ایک فریق اختیار کرے' دوسرے کو بھی وہی اپنانا چاہیے''۔ یہ ان کے نزدیک تعلقات کو صحیح خطوط پر استوار کرنے کی بہترین منطقی بنیاد تھی۔ اس پر محترم خرم مراد نے جو اس وقت دی اسلامک فاؤنڈیشن 'لسٹر' برطانیہ کے ڈائرکٹر جنرل تھے

باہمی نفرت' عدم رواداری' تنازعات' خوں ریزی اور نسل کشی کا دور دورہ ہے' خداے واحد کی زمین پر: 'ایسی بنیاد اور طریقہ معلوم کرنے کی اشد ضرورت ہے جو ہمیں اپنے اپنے خدا کی ایک دنیا میں' ایک دوسرے کے ساتھ مل جل کر رہنے کے قابل بنائے' (CMR' ص ۷۵)۔

آج ہمیں جس چیز کی سب سے زیادہ ضرورت ہے وہ ایک ایسے نئے اور تازہ نقطۂ نظر کی ہے' جو علمی اور ابلاغی دنیا میں جاری بے ثمر اور فرسودہ بحثوں سے الگ ہو کر نئے راستے کا نقطۂ آغاز بن جائے۔ میرا احساس ہے کہ یہ دستاویز جو طویل غور و فکر کا نتیجہ ہے' یہ توقع پوری نہیں کرتی۔ چرچ کے رہنما ذہن و قلب کی جس وسعت اور کشادگی پر اتنا زور دیتے ہیں' اور صحیح دیتے ہیں' اس کے ہوتے ہوئے یہ کام مشکل نہ ہونا چاہیے تھا' کیونکہ سبھی یہ چاہتے ہیں کہ مکالمہ آگے بڑھے۔ اس لیے مجھے امید ہے کہ میں جو معروضات پیش کر رہا ہوں' وہ ان پر غور کریں گے اور اگر اتفاق کریں گے تو اس دستاویز کے خلا اور خامیوں میں سے کچھ کو دُور کریں گے' جو میرا خیال ہے کہ اس دستاویز میں موجود ہیں۔

مضبوط استدلال کے ساتھ اپنا موقف عیسائی قیادت کو ارسال کیا' جو فاؤنڈیشن کے جریدے Encounters (ستمبر ۱۹۹۶ء' ص ۱۹۹-۲۰۶) میں شائع ہوا۔ اس کی روشنی میں عیسائی قیادت نے اپنے موقف پر نظر ثانی کی اور دستاویز میں تبدیلی کرتے ہوئے 'کونسل آف چرچز فار برٹین اینڈ آئرلینڈ' (CCBI) اور 'دی چرچز کمیشن فار انٹرفیتھ ریلیشنز' کے سیکرٹری ڈاکٹر کرسٹوفر لیمب نے فاؤنڈیشن کے ڈاکٹر عطاء اللہ صدیقی صاحب کے نام یہ خط لکھا:

مجھے افسوس ہے کہ اب یہ ممکن نہیں کہ ہم خود خرم مراد کو جواب دے سکیں [کہ وہ دسمبر ۱۹۹۶ء کو انتقال کر گئے ہیں]۔ مجھے یقین ہے کہ اس تمام بحث و مباحثے کے بعد جو نئی دستاویز تیار ہوئی ہے' خرم مراد اس کی قدر کرتے۔ آپ دیکھیں گے کہ ہم نے اس میں خرم مراد کی تحریر سے اقتباسات لیے ہیں اور فیصلہ کیا ہے کہ عیسائی مسلم تعلقات کے لیے ریسی پروسٹی کے پورے تصور کو ہی مسترد کر دیں (۲۶ فروری ۱۹۹۷ء)

یہاں پر محترم خرم مراد کی تحریر کا اُردو ترجمہ دیا جا رہا ہے۔ یہ ترجمہ جناب مسلم سجاد نے کیا ہے۔ مرتب

ناقص مفروضہ

دستاویز میں سب سے زیادہ زور reciprocity یعنی 'برابر کے بدلے کی بنیاد' پر ہے۔لیکن کیا یہ دستاویز وہ جامع بنیاد فراہم کرسکتی ہے جو ساتھ مل جل کر رہنے کے لیے' جو بنیادی طور پر ایک اخلاقی' روحانی اور معاشرتی تجربہ ہے' ضروری ہے؟ کیا اس دستاویز میں 'برابر کے بدلے کی بنیاد' کی تجویز ہمارے ایمان اور عقیدے سے مطابقت رکھتی ہے؟--- میرے خیال کے مطابق ایسا نہیں ہے۔اسی طرح یہ تجویز اچھے تعلقات کے فروغ کے لیے ایک کمزور' بہت ہی مبہم اور اخلاقی طور پر غیر اطمینان بخش بنیاد نظر آتی ہے۔

اوّل' مبینہ 'برابر کے بدلے کی بنیاد' کا مطلب بہت آسانی سے' بالکل منفی معنوں میں' یعنی برائی کے بدلے میں برائی لیا جاسکتا ہے۔اس بات کو دستاویز نے خود تسلیم کیا ہے اور اسے بائبل کے خلاف ہونے کی بنیاد پر مسترد کیا ہے۔لیکن افسوس ہے کہ اس دستاویز میں ایک اس سے بھی زیادہ اہم بات کو نظر انداز کیا گیا ہے۔وہ یہ کہ اسلام اور عیسائیت کی مقدس کتابیں' قرآن اور بائبل' دونوں اس منفی بات کو مسترد کرنے سے بہت آگے بڑھ کر اس 'برابر کے بدلے کی بنیاد' سے بھی منع کرتی ہیں' جو صرف اچھائی کے بدلے میں اچھائی کی تعلیم دے۔ درحقیقت یہ کتب اس سے بھی آگے بڑھ کر برائی کے بدلے میں اچھائی' اختیار کرنے پر شدت سے اُبھارتی ہیں۔اس کا مطلب یہ ہے کہ جو نیکی ہے' جس کی دین نے تعلیم دی ہے' خاص طور پر انصاف اور ہمدردی' وہ دوسروں کے ساتھ کرنا چاہیے' خواہ دوسرا ہمارے ساتھ وہی نیکی کررہا ہے یا نہیں۔اگرچہ کہ وہ دوسرا ہمارا دشمن ہی کیوں نہ ہو یا ماضی میں اس نے ہمارے ساتھ کوئی بہت بڑی زیادتی ہی کیوں نہ کی ہو۔اس بارے میں قرآن پاک یہ ہدایت کرتا ہے:

- اے لوگو! جو ایمان لائے ہو' اللہ کی خاطر راستی پر قائم رہنے والے اور انصاف کی گواہی دینے والے بنو۔کسی گروہ کی دشمنی تم کو اتنا مشتعل نہ کردے کہ انصاف سے پھر جاؤ۔عدل کرو' یہ خدا ترسی سے زیادہ مناسبت رکھتا ہے۔(المائدہ ۵:۸)

- اور جب بات کہو' انصاف کی کہو' خواہ معاملہ اپنے رشتے دار ہی کا کیوں نہ ہو (الانعام ۶:۱۵۲)۔
- [اسی طرح یہ فرمایا گیا] لوگوں سے بھلی بات کہو (البقرہ ۲:۸۳)۔ [اس سے بھی آگے بڑھ کر قرآن یہ ہدایت دیتا ہے]
- اور اے نبیؐ' نیکی اور بدی یکساں نہیں ہیں۔ تم بدی کو اس نیکی سے دفع کرو جو بہترین ہو۔ (حم السجدہ ۴۱:۳۴)

چرچ کے رہنما سوچیں!

میں چاہتا ہوں کہ چرچ کے رہنما سوچیں: کیا ہم اتنی جرأت نہیں رکھتے کہ یہ اعلان کریں کہ ہمارے باہمی تعلقات کی راہ نما یہ بنیادی اخلاقی تعلیم ہوگی اور یہی پُرامن' مفاہمانہ بقائے باہمی زندگی گزارنے کا اوّلین اصول ہوگا' نہ کہ 'مفاہمانہ تعاون' کے لیے کوئی خودساختہ اپیل۔

افسوس تو یہ ہے کہ 'برابر کے بدلے کی بنیاد' دکھانے کے لیے بھی کوئی نمونہ آج مغرب کی سیکولر ریاستوں کے پاس نہیں ہے۔ کیا یہ بات اخلاقی لحاظ سے زیادہ برتر اور ثمرآور نہ ہوتی کہ وہ عیسائیوں کے ساتھ مسلمانوں کے مبینہ برے سلوک کے احساس کے بارے میں اپنا استدلال 'برابر کے بدلے' کے بجائے' مسلمانوں کے عقیدے اور کتاب کی بنیاد پر پیش کرتے۔ اس قسم کے دلائل کہ: ''مسلمانوں کو اس بات کی اجازت ہونا چاہیے کہ وہ عیسائیت کو قبول کر سکیں' کیونکہ ہم بھی عیسائیوں کو اس بات کی اجازت دیتے ہیں کہ وہ اسلام قبول کرلیں'' --- عقیدے یا اخلاق کی بنیاد پر اپیل کے بجائے صاف صاف تجارتی لین دین کا رویہ محسوس ہوتا ہے۔ یہ دوسروں کو ان کی اقدار اور روایات سے مخلص ہونے میں بھی کوئی مدد نہیں دیتا۔

دستاویز کی خامیاں

دوم: 'برابر کے بدلے کی بنیاد' کی اس دستاویز میں کچھ سنگین خامیاں ہیں۔

زیر بحث دستاویز میں ان مشکلات سے عہدہ برآ ہونے کی خواہش تو دکھائی دیتی ہے' لیکن کوئی قابل اطمینان عملی حل سامنے نہیں آتے۔ حالانکہ حقائق کی دنیا میں 'برابر کے بدلے کی بنیاد' کا اظہار تو عملی رویوں ہی سے ہو سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ رواداری نہ پائے جانے کے بارے میں جو مثالیں اس دستاویز میں دی گئی ہیں وہ حقیقی اور ٹھوس رویے سے متعلق ہیں' اور آخر میں ذہن وقلب کو 'برابر کے بدلے کی بنیاد' کی دعوت دی گئی ہے۔ لیکن اس سے کیا مراد ہے؟ یہ بالکل نہیں بتایا گیا۔ ہم اتنے وسیع المعانی اور مبہم وعظوں پر تکیہ نہیں کرتے' یہ خالی خولی دعوے لگتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ خالی خولی نصیحتوں سے اچھے باہمی روابط کو فروغ نہیں دیا جا سکتا اور نہ ان سے:

'دنیا کو ناقابل بیان مصائب اور خوں ریزی سے بچایا جا سکتا ہے'۔[۲]

اگر ہم مذہب کی تبدیلی' عبادت گاہوں کی تعمیر' سیاسی حقوق اور توہین رسالتؐ کے قوانین جیسے معاملات اور رویے میں 'برابر کے بدلے کی بنیاد' کے خواہاں ہیں تو اس میں سب سے بڑی مشکل یہ ہے کہ ہم کس فریق سے توقع کریں کہ وہ یہ رویہ اختیار کرے۔ اگر کھلے ذہن سے سوچا جائے تو مسلمان اور عیسائی دونوں غیر واضح وجود ہیں۔ مغربی ممالک عیسائی ریاستیں ہیں یا نہیں ہیں اور مسلمان ممالک' اسلامی ہیں یا نہیں ہیں --- ایک اتنا الجھا ہوا سوال ہے کہ دستاویز نے بھی اس پر کلام کرنے سے پہلو بچانے کو ہی ترجیح دی ہے۔

درحقیقت 'برابر کے بدلے کی بنیاد' سے متعلق اس قسم کے سوالات اور دیگر معاملات ریاستوں اور حکومتوں کے دائرے میں آتے ہیں۔ یہاں پر ایک سوال یہ بھی پیدا ہوتا ہے کہ کیا

۲- Christian / Muslim Reciprocity' ص ۷۵

مغرب کی سیکولر حکومتیں اپنے عیسائی ہونے کو کھلے عام تسلیم کر سکتی ہیں؟ اور کیا وہ عیسائیوں کی جانب سے یہ ذمہ داری لیں گی؟ پھر اسی طرح' کیا مسلمان ریاستیں مسلمانوں کی جانب سے اپنی ذمہ داریاں ادا کرنے کے لیے تیار ہیں؟ شاید یہ ریاستیں اس کے لیے بخوشی تیار ہو جائیں' لیکن ان مسائل پر وہ اپنے ہی عوام کے ساتھ مسلسل لڑنے جھگڑنے میں مصروف ہیں۔

'برابر کے بدلے کی بنیاد' کی واضح حدود کار اور اس کے ذمہ دار افراد کی غیر موجودگی میں یہ مسئلہ ناقابلِ حل اور متنازع رہتا نظر آتا ہے۔ زیر بحث دستاویز نے اس معاملے کو اٹھایا تو ہے لیکن' اس کے حل کے لیے کوئی اشارہ دیے بغیر ہی اسے ویسے کا ویسا چھوڑ دیا ہے۔

مثال کے طور پر

زیر بحث رپورٹ میں کہا گیا ہے:

'یورپ اور شمالی امریکا کے ممالک کو عموماً عیسائی ممالک تصور کیا جاتا ہے' حالانکہ وہ عیسائی نہیں ہیں'۔[۳]

جب کہ مسلمان ممالک مسلمان ہیں۔ مگر ہمیں سوچنا چاہیے کہ مغربی ممالک عیسائی ریاستیں کیوں نہیں ہیں؟ ان تمام ممالک میں سربراہ مملکت کے لیے عیسائی ہونا ضروری ہے' بعض جگہ عملاً اور بعض جگہ قانوناً۔ اگر اسلامی جمہوریہ پاکستان کا سربراہ صرف مسلمان ہو سکتا ہے تو برطانیہ کے حکمران کے لیے بھی عیسائی ہونا ضروری ہے۔ اگر برطانیہ کا بادشاہ اسلام قبول کر لے تو کیا پھر بھی وہ برطانیہ کا بادشاہ رہ سکتا ہے؟ یقیناً نہیں۔ تمام یورپی ممالک عیسائیت کو اپنے:

'قومی ورثے کا ایک نہایت اہم حصہ تصور کرتے ہیں'۔[۴]

۳- Christian / Muslim Reciprocity' ص ۷۱

۴- ایضاً' ص ۷۱

ان کا اپنے کلیسا (چرچ) کے ساتھ ایک خاص تعلّق ہے۔ سیاسی' قانونی' معاشی اور تعلیمی معاملات پر کلیسا سے باقاعدہ مشورہ کرتے ہیں اور کلیسا کی جانب سے تنقید کے لیے بہت حساس ہوتے ہیں۔ اس بات کو یہ دستاویز بھی برملا تسلیم کرتی ہے۔

اس صورت حال کے بارے میں مسلمان جو کچھ محسوس کرتے ہیں (اور یہ اہمیّت رکھتا ہے) اس کا دستاویز میں کوئی تذکرہ نہیں۔ یعنی یہ کہ عالمی سطح پر یہ [بظاہر سیکولر] ریاستیں کھلا کھلا عیسائی موقف اختیار کرتی ہیں۔ عیسائی مشنریوں اور مخصوص نظریاتی اہداف رکھنے والی نام نہاد غیر سرکاری تنظیموں (NGOs) کو کھلے طور پر امداد فراہم کرتی ہیں۔ یہی نہیں' بلکہ انھیں جوابی اقدامات سے بچانے کے لیے اپنی پوری طاقت استعمال کرتی ہیں' اور مسلمان ممالک میں عیسائیوں کے مسائل پر عیسائیوں کے ساتھ شانہ بشانہ کھڑی ہوتی ہیں۔ عام طور پر ان ممالک میں قانون سازی اور عدالتی امور میں عیسائیوں کے حق میں مداخلت کرتی ہیں۔

ایک مثال دیکھیں: اگر پاکستان میں [شان رسالتؐ میں گستاخی کے مرتکب] ایک عیسائی پر ملکی قانون کے تحت توہین رسالتؐ کا مقدمہ چلایا گیا' تو اس موقع پر مغربی ممالک کے صدور' وزرائے اعظم' وزرائے خارجہ' سفارتی نمایندے اور ذرائع ابلاغ میدان میں کود پڑے اور ہر ممکن طریقے سے پاکستان کے عدالتی اور انتظامی عمل میں مداخلت کی۔ یہ سب طاقت ور لوگ مقدمے کی سماعت پر اثرانداز ہوئے' اور قانون توہین رسالتؐ کو تبدیل کرنے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگایا۔ ہوسکتا ہے کہ اپنے تصور کے مطابق اعلیٰ مقاصد کی علم برداری ان کے پیش نظر ہو۔ لیکن سوال یہ ہے کہ کیا وہ صرف اس لیے اس معاملے میں چیمپئن بننے کی کوشش کر رہے ہیں کہ: ''ایک انسان کے ساتھ امتیازی سلوک کیا جا رہا ہے اور اس کے حقوق کو پامال کیا جا رہا ہے؟'' اگر ایسا ہی ہے تو ہم اس مداخلت کو خوش آمدید کہتے ہیں' کیونکہ ہر انسان کے حقوق محترم ہیں اور انھیں پامال نہیں کیا جانا چاہیے۔ ہر ایک کے ساتھ انصاف ہونا چاہیے۔

مگر معاف رکھیے' حیرانی اس وقت ہوتی ہے جب ہم دیکھتے ہیں کہ سارا شوروغوغا اور

سیاسی دباؤ صرف [شان رسالتؐ میں گستاخی کا ارتکاب کرنے والے] سلامت مسیحوں' [اسلامی تعلیمات کا مذاق اڑانے والے] سلمان رشدیوں یا تسلیمہ نسرینوں اور اسی قماش کے لوگوں کے لیے ڈالا جاتا ہے۔ اس کے مقابلے میں ان مغربی عیسائی ملکوں میں اُن سیکڑوں اور ہزاروں عبداللہ اور محمد اور علی نامی لوگوں کے معاملے میں ایسا کبھی نہیں کیا گیا جن کو مسلسل اذیتیں دی جاتی ہیں' اور انصاف سے محروم رکھا جاتا ہے۔ پھر لاکھوں کروڑوں مسلمان اپنے ہی ممالک میں' اپنے بنیادی حقوق سے محروم چلے آرہے ہیں۔ درحقیقت یہ سب کچھ کرنے اور اپنے ہم وطنوں پر مظالم ڈھانے والی حکومتیں تو انھی مغربی ممالک کی معاونت' امداد اور سہاروں سے قائم ہیں' جن کے بارے میں دستاویز میں دعویٰ کیا گیا ہے کہ ''وہ عیسائی نہیں ہیں''۔

دوسرا سوال یہ ہے کہ کیا کم طاقت ور نام نہاد مسلم ریاستیں بھی اسی انداز میں طاقت ور عیسائی ملکوں کی حکمرانی میں دخیل ہوسکتی ہیں؟ ___ یقیناً نہیں۔ اس پر ہمیں افسوس ہی نہیں ہوتا بلکہ اس پر ہمیں بجا طور پر شک گزرنے لگتا ہے کہ ''روشن خیالی'' اور ''سیکولرزم'' صرف نمایشی نعرے ہیں' ورنہ درونِ خانہ اور اپنے باطن کی گہرائیوں میں یہ ممالک پوری طرح عیسائی ہیں' بلکہ صلیبی جنگ باز بھی' خاص طور پر جب معاملہ اسلام [کو بدنام کرنے] کا ہو یا مسلمانوں [کو کچلنے] کا۔ اس افسوسناک جانب دارانہ صورت حال پر دیانت داری سے غوروفکر کرنے کی ضرورت ہے۔

مسلمان ممالک کی عمومی صورت حال کو بھی صحیح طور پر سمجھنے کی ضرورت ہے۔ یہ صرف اسلامی انقلابی عنصر کا نقطۂ نظر ہی نہیں ہے کہ یہ حکومتیں اسلامی نہیں ہیں' بلکہ سب مسلمان سمجھتے ہیں کہ ہم اسلامی اصولوں کے مطابق زندگی نہیں گزار رہے' جو ہم کو گزارنا چاہیے۔ اگر موقع دیا جائے تو تقریباً تمام لوگ نفاذ شریعت کے حق میں ووٹ دیں گے۔ بعض جگہ عیسائیوں کے حوالے سے کچھ ناانصافیاں موجود ہیں' جن کی کوئی بھی صاحب ایمان مسلمان تائید نہیں کرتا' لیکن یہ حوالے اِکا دکا ہیں۔ مجموعی صورت حال ایسی نہیں ہے جب کہ وہیں پر اس سے زیادہ سنگین ناانصافیاں اور ہولناک مظالم مسلمان حکومتوں کی طرف سے خود مسلمان عوام پر روا رکھے

جار ہے ہیں۔

مذکورہ 'برابر کے بدلے کی بنیاد' والی تجویز ایک متنازع فیہ بحث ہے' جو ایسی ہی رہے گی' کیونکہ اس بات پر اتفاق رائے کا ہونا کہ 'اچھے سلوک' سے کیا مراد ہے اور 'برابر کے بدلے کی بنیاد' کے کیا معنی ہیں' مشکل ہے۔

تبدیلی مذہب کا مسئلہ

آیئے تبدیلی مذہب کے حق پر بات کرتے ہیں:

یہ بات درست ہے کہ اسلامی قانون جیسا کہ وہ اس وقت ہے ایک مسلمان کو' جو اس قانون کو تسلیم کرے' کسی دوسرے مذہب مثلاً عیسائیت کو قبول کرنے سے منع کرتا ہے۔ یہ موقع نہیں ہے کہ اس قانون کے درست یا غلط ہونے پر منطقی بحث کی جائے یا اس قانونی مسئلے پر ازسرنو غور کیا جائے...... یہاں پر مجھے صرف 'برابر کے بدلے کی بنیاد' سے بحث ہے۔

یہ بات درست ہے کہ مغرب میں کسی عیسائی کے قبول اسلام میں کوئی رکاوٹ نہیں ہے' یا بہت کم رکاوٹ ہے۔ لیکن کیا ایسا روشن خیالی اور انسانی آزادی کے احترام کا نتیجہ ہے یا اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ ریاست اور معاشرے کی نظر میں مذہب اتنا بے حیثیت اور کم مایہ ہو چکا ہے کہ ان کی نظر میں تبدیلی مذہب یا ارتداد کے الفاظ بے معنی ہو کر رہ گئے ہیں؟ دوسری طرف مغربی عیسائی ممالک' مسلمانوں کے درمیان کفر وارتداد کو نہ صرف برداشت کرتے بلکہ اس کی حوصلہ افزائی کرتے ہیں' جب کہ یہ آزاد اور روشن خیال ریاستیں یا معاشرے کسی ایسے 'مذہب' یا 'مذہبی عمل' یا عبادت کے طریقے کو برداشت نہیں کرتے جو ان کے خیال میں ان کی اقدار اور قوانین سے جنھیں وہ اہم سمجھتے ہیں' انحراف یا تجاوز کرنے والے ہوں۔

مثال کے طور پر وہ:

- یہودیت [صیہونیت] یا سامیت کے خلاف کچھ بھی برداشت کرنے کو تیار نہیں

ہوتے۔ لیکن اس کے مقابلے میں اظہار رائے کی آزادی کے نام پر اسلام یا مسلمانوں اور عربوں کو برا بھلا کہنے کی اور اسلام دشمنی کی پوری اجازت دیتے ہیں اور اس بات کو ہرگز برا نہیں سمجھا جاتا (گویا کہ عرب سامی النسل نہیں ہیں)۔

- وہ ہر قسم کے سیاسی رجحانات کے لیے آزادی کو برداشت کرتے ہیں' مگر جیسا کہ امریکا میں ہوا' اور کمیونسٹ پارٹی کو خلاف قانون قرار دیتے ہیں۔
- وہ اسلام قبول کرنے یا مسلمان ہو جانے کا حق تو دے سکتے ہیں' لیکن مسلمان خواتین کو حجاب پہننے کا حق دینے کے لیے تیار نہیں ہیں جیسا کہ فرانس میں ہوا۔
- اسی طرح حلال ذبیحہ کرنے کا حق نہیں دیتے' جیسا کہ جرمنی میں ہے۔
- نماز جمعہ کے لیے کام میں وقفے کا حق دینے کے لیے تیار نہیں' جیسا کہ برطانیہ میں ہوتا ہے۔

تو کیا' کلیسا کی مسند پر بیٹھے میرے دوست اس بات سے اتفاق کریں گے کہ اصل مسئلہ تبدیلی مذہب' عقیدے کی آزادی' اظہار رائے کی آزادی یا انسانی حقوق کا نہیں ہے۔ یہ حقوق کہیں بھی مطلق یا بے قید نہیں ہیں۔ اپنی اپنی جگہ اور نوعیت کے لحاظ سے ہر جگہ کفر وارتداد کو اختیار کرنے پر پابندیاں ہیں۔ اس طرح صرف حقوق ہی داؤ پر نہیں لگے ہوئے ہیں' بلکہ کچھ دوسرے سوالات بھی بہت اہمیّت رکھتے ہیں' یعنی یہ کہ:

۱- تبدیلی کس (مذہب) سے کس طرف؟

۲- کفر یا انکار کس (مذہب) کے خلاف؟

۳- کن باتوں پر پابندیاں؟

اس پس منظر میں دیکھا جائے تو مسلم ممالک کے رویے اور قوانین جو مغربی عیسائی ممالک سے مختلف نظر آتے ہیں' درحقیقت بہت زیادہ مختلف نہیں ہیں۔ وہ ان ممالک میں اس لیے موجود ہیں کہ مسلمانوں کے لیے ان کا ایمان اب بھی اہمیّت رکھتا ہے اور نہ صرف ان کے

دلوں کی دنیا کے لیے بلکہ ان کی سماجی اور سیاسی زندگی کے لیے بھی مرکزی حیثیت رکھتا ہے۔ شاید اسی لیے مغربی ممالک دوسرے تمام انسانی حقوق کی خلاف ورزی کو نظرانداز کر دیتے ہیں اور ان کا سارا زور سیاسی اور معاشی اہمیت رکھنے والوں پر ہوتا ہے۔ یہ رویے اور قوانین اسی نسبت سے بدلیں گے جس نسبت سے لوگوں کی نظر میں اسلام کے عقیدے کی اہمیت اور مرکزیت کم ہوگی۔ آخراب بھی دو بڑے مسلمان ممالک: انڈونیشیا اور بنگلہ دیش میں عیسائیت کو اختیار کرنے میں کوئی رکاوٹ نہیں ہے یا بہت کم ہے۔

میں نے تبدیلی مذہب کے سوال کو کچھ تفصیل سے لیا ہے کیونکہ میں محسوس کرتا ہوں اور اگر یہ بات غلط ہے تو میری تصحیح کی جائے کہ دستاویز کے استدلال میں اسی نکتے کو مرکزی اہمیت حاصل ہے:

'عیسائیوں کو سب سے بڑی شکایت اسلام سے عیسائیت کو قبول کرنے کے سوال پر ہے'۔[5]

مگر کیا مسلمانوں کے ذہن و قلب میں 'برابر کے بدلے کی بنیاد' کے لیے جذبہ بیدار کرنے کے لیے اس ابتدائی اقدام میں ہمارے سامنے بڑا اور اہم کام مسلمانوں کو عیسائی بنانے کا حق ہے؟ اس بات کو ماننا مشکل ہے لیکن اس دستاویز میں تو یہی قرینہ اور یہی خواہش موجود ہے۔ ورنہ دوسری صورت میں اس کی کیا توجیہہ کی جائے!

ایک تنازع یہ بھی ہے کہ فی الحقیقت کون کیا کر رہا ہے؟

میرا خیال ہے کہ یہ ایک بے فائدہ بحث ہے۔ دستاویز میں یہ بات درست طور پر کہی گئی ہے کہ دونوں اطراف سے یہ دعویٰ کیا جا سکتا ہے کہ "ہمارا رویہ تو درست ہے جب کہ دوسرے کا رویہ معقول نہیں ہے"۔ اگر باہمی تعلقات کی بنیاد اسی پر ہے نہ کہ 'برابر کے بدلے کی

۵- Christian / Muslim Reciprocity، ص ۱۴

بنیاد سے بالاتر عقیدے' اخلاق اور اقدار پر مبنی معیار پہ' تو یہ مسئلہ ہمیشہ باقی رہے گا۔

مسلمانوں کے خلاف کس طرح امتیازی سلوک روا رکھا جاتا ہے اور ان کے حقوق کو کس طرح پامال کیا جاتا ہے' اس موضوع پر کوئی احتجاجی آواز بلند کرنے کے بجائے' میں کچھ ایسے معاملات پر اپنی گزارشات پیش کروں گا' جن کا تذکرہ زیر بحث دستاویز میں مسلمانوں کے رویے کے حوالے سے کیا گیا ہے۔

قانون توہینِ رسالتؐ

پاکستان میں قانونِ توہین رسالتؐ کے بارے میں اندرون پاکستان اور دوسرے ممالک کے عیسائی اور بڑی بڑی عیسائی قوتیں شدت سے یہ چاہتی ہیں کہ: ''یہ قانون مکمل طور پر ختم کر دیا جائے''۔ اگر بڑے پیمانے کی عوامی مزاحمت کا اندیشہ نہ ہوتا تو پاکستان کی [فوجی اور نیم سیاسی] حکومتیں اس دباؤ کے سامنے کب کی جھک چکی ہوتیں۔ لیکن میں اس قانون کی مخالفت کی وجوہ کو اخلاص سے سمجھنا چاہتا ہوں' اور اس حوالے سے متعدّد بنیادی سوال پیدا ہوتے ہیں۔ مثال کے طور پر:

- 'کیا عیسائی توہین رسالتؐ کا ارتکاب کرنا چاہتے ہیں؟' مجھے امید ہے کہ وہ ایسا نہیں چاہیں گے۔
- 'کیا وہ سمجھتے ہیں کہ توہین رسالتؐ کوئی گناہ اور جرم نہیں ہے؟ کم از کم مجھے یقین ہے کہ وہ ایسا نہیں سمجھتے۔ کیونکہ کفر و ارتداد سے متعلّق قوانین آج بھی ان کی اُمہات کتب میں موجود ہیں' ہر چند کہ وہ متروک ہیں اس لیے ان کے ہاں مذہب پر عمل بھی متروک ہو گیا ہے۔
- دنیا کے ہر قانون میں ایک معمولی آدمی کی اہانت (defamation) کو بھی قابل سزا جرم سمجھا جاتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ: 'کیا ایک ایسے شخص کے معاملے میں یہ جرم نہیں

ہے جس سے ایک ارب سے زائد مسلمان اپنی جان اور اپنے والدین سے بھی بڑھ کر محبت کرتے ہیں اور جن کی توہین کو یہ لوگ اپنی توہین سے بھی بڑا جرم تصور کرتے ہیں؟'

- اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی توہین مقصود نہیں ہے اور اسے جرم تسلیم کیا جاتا ہے' تو پھر صرف قانون کے غلط استعمال کا استدلال رہ جاتا ہے۔ یقیناً اس قانون کے غلط استعمال کی بعض مثالیں بھی ہوسکتی ہیں' میں ان کی مذمت کرتا ہوں' لیکن: 'کیا کسی قانون کا بعض واقعات میں غلط استعمال اس قانون کو سرے سے ختم کر دینے کے لیے کافی بنیاد فراہم کرتا ہے؟' کیا قاتل کو سزاے موت دینے کا قانون اس لیے ختم کر دیا جائے کہ پاکستان میں اس کا غلط استعمال ہوتا ہے؟ اور مسلمان' مسلمان سے اپنے باہمی تنازعات میں اسے ایک دوسرے کے خلاف اور باہمی بدلے چکانے کے لیے استعمال کرتے ہیں۔

قانون کے غلط استعمال کے امکانات کو ہر ممکن حد تک روکنے' اور مثبت حل تلاش کرنے کے حوالے سے مکالمہ جاری رہنا چاہیے۔ امید ہے کہ میرے عیسائی دوست اس بات کو محسوس کریں گے کہ منطقی اعتبار سے عیسائیوں کی سیاسی اور مذہبی قیادت کا اس قانون کے خلاف شوروغوغا کتنا بے بنیاد ہے۔

نفاذ شریعت کا سوال

ہر جگہ مسلمانوں کی یہ دلی خواہش ہے کہ وہ شریعت کے مطابق زندگی گزاریں۔ یہ خواہش ان کے ایمان اور اساسی دستاویزات (قرآن وسنت) کا بنیادی تقاضا ہے:

- اس معاملے میں مسلمانوں سے تعاون کرنے اور ان کی اس فطری اور قانونی خواہش کا احترام کرنے کے بجائے عیسائی اس پر اعتراض کرنے کے لیے اٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔ پھر' وہ نفاذ شریعت کی راہ میں نہ صرف رکاوٹ بنتے ہیں' بلکہ ایسی کوششوں کو

رکوانے کے لیے بین الاقوامی دباؤ بھی ڈلواتے ہیں۔ ہم مسلمانوں کے لیے یہ رویہ ناقابل فہم اور 'برابر کے بدلے کی بنیاد' کے بالکل برعکس ہے۔ پھر اتنا شور وغوغا کیوں؟

- کیا ایک عیسائی مملکت میں بہت سے قوانین' خاص طور پر پرسنل لا بائبل یا عیسائی شریعت (جیسی اور جتنی کچھ بھی وہ ہے) سے ماخوذ نہیں ہیں؟ یقیناً ایسا ہی ہے۔ کیا وہ صرف اس لیے جائز اور دستوری قوانین نہیں ہیں کہ عیسائی قانون ساز اداروں اور عدالتوں نے انھیں نافذ کیا ہے اور انھیں درست قرار دیا ہے؟ یقیناً ایسا ہی ہو رہا ہے۔
- کیا مسلمانوں کو بھی ان قوانین کی پابندی کسی چون و چرا کے بغیر نہیں کرنا پڑتی؟ یقیناً ایسا ہی ہوتا ہے۔
- پھر اپنے لیے روا رکھنے جانے والے یہی پیمانے مسلم ممالک کے لیے کیوں جائز نہیں ہیں؟
- کیا وہ جمہوریت' جسے مغرب جمہوریت تسلیم کرتا ہے' اس کا یہ تقاضا نہیں ہے کہ عوام کو اپنے معاملات چلانے کے لیے قوانین بنانے کا حق حاصل ہے؟ یقیناً انھیں کوئی ایسے قوانین نہیں بنانا چاہییں جو کسی اقلیت کے عقیدے اور مفادات کے خلاف ہوں' لیکن کیا کسی اقلیت کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ ۹۹ فی صد اکثریت کی رائے کو مسترد (veto) کر دے اور ان قوانین کے نفاذ سے ان کو روکے جنھیں وہ نافذ کرنا چاہتے ہیں۔ حالانکہ وہ اپنی دیانت دارانہ رائے کے مطابق انسانی عقل کے بجائے الہامی رہنمائی کو اپنا ماخذ قرار دیتے ہیں۔

امید ہے کہ میرے عیسائی دوست مذکورہ بالا سوالات پر سنجیدگی سے غور کریں گے۔

اس لیے کہ 'برابر کے بدلے کی بنیاد' کا حقیقی مفہوم آخر کار اس کے علاوہ کچھ نہ نکلے گا کہ اپنے اپنے عقیدے اور روایات کے مطابق زندگی گزارنے کے جذبے کا احترام کیا جائے' جیسا کہ مذکورہ بالا دستاویز میں بھی تسلیم کیا گیا ہے۔

اسلام پہ 'نظرثانی'؟

دوسرا اہم نکتہ جس پر CMR دستاویز میں زور دیا گیا ہے' یہ ہے کہ:

'مسلمان اپنے بنیادی مآخذ کا ازسرنو جائزہ لیں کہ ساتویں صدی عیسوی کے مقابلے میں آج کی بالکل مختلف دنیا میں انھیں کس طرح سمجھا جائے--- بیسویں صدی کے اواخر کے حالات میں ان روایات کے تحت' اللہ تعالیٰ کو ہم سے کس طرح کی زندگی گزارنا مطلوب ہوگا'۔[6]

مسلمانوں سے اسلام پر ''ازسرنوغور یا نظرثانی کرنے'' کی یہ فوری اپیل اس صورت میں قابل فہم ہوسکتی ہے' جب ہم اس نتیجے پر پہنچیں کہ اسلام پر اس طرح کے ازسرنوغور کے بغیر اس طرح کا 'برابر کے بدلے کی بنیاد' روبہ عمل نہیں آسکتا' جس کا تصور اس دستاویز میں پیش کیا گیا ہے۔

اس بات سے کسی کو اختلاف نہیں' اور میں سمجھتا ہوں کہ کوئی صاحب فکر مسلمان ہر دور میں' اور آج کے دور میں بھی' اس نوعیت کے مسلسل غوروفکر کی ضرورت سے انکار نہیں کرسکتا ہے۔کوئی مسلمان بھی اس ذمہ داری سے پہلوتہی کرنا یا بچنا نہیں چاہے گا۔آج امت مسلمہ کو اپنے احیا کے لیے خود اس فکرنو کی ضرورت ہے۔حقیقت یہ ہے کہ اس طرح کی فکرنو مسلمانوں کے ایمان کا بنیادی تقاضا ہے۔

میں چاہوں گا کہ ہمارے عیسائی دوست اس مسئلے کے بعض پہلوؤں پر غوروفکر کریں:

- اوّل: ہمیں یہ تشخیص کرنا چاہیے کہ ساتویں صدی عیسوی کے عرب کے مقابلے میں' آج کی بیسویں اور اکیسویں صدی میں دنیا کس انداز سے مختلف ہوگئی ہے۔کیا' ٹکنالوجی اور فطرت کی تسخیر کی نوعیت ا... پیمانے کے لحاظ سے؟ یقیناً--- یا تنظیموں اور باہمی تبادلوں کی ہیئت کے لحاظ سے؟ یقیناً--- کیا زندگی کی آسایشوں اور لوگوں کو

٦- Christian / Muslim Reciprocity' ص ۷۵

حاصل متبادلات کے پیمانے کے لحاظ سے؟ یقیناً ــــ اور طبعی دنیا کے بارے میں علم کی مقدار کے لحاظ سے؟ ــــ میرا جواب ہے 'یقیناً'ــــ لیکن کیا انسانی فطرت بدل گئی ہے؟ کیا اس کے اندر گناہ کرنے کا رجحان ختم ہو گیا ہے یا کم ہو گیا ہے؟ یقیناً ایسا نہیں ہے ــــ اگر کچھ ہوا ہے تو صرف یہ کہ فخر' خود کفالت' جارحیت' تلون مزاجی' حرص اور نفرت وغیرہ جیسے عناصر میں اضافہ ہوا ہے۔ اسی طرح' کیا انسان کے اندر اللہ کے ساتھ ساتھ بہت سے دوسرے خدا بنانے' اور درحقیقت خود اپنے کو سب سے بڑا خدا قرار دینے کا رجحان ختم ہو چکا ہے؟ کیا چوری' زنا اور قتل و غارت جیسے جرائم کم ہو گئے ہیں؟ ظاہر ہے کہ ایسا نہیں ہوا۔ اس لیے کسی بھی تازہ جائزے میں ان تمام پہلوؤں کو پیش نظر رکھنا ہو گا۔

- دوم: اسلام کے معنی ہیں اپنے آپ کو پوری طرح اللہ کی سپردگی میں دے دینا۔ وہی اللہ جو ساتویں صدی کا خدا تھا' وہی بیسویں صدی کا خدا ہے' اور آنے والے ہزاریے کا بھی ہو گا۔ وہی ہمیشہ ہمیشہ کے لیے خدا ہے۔ اس لیے مسلمان جب بھی اللہ کی مرضی کی تعبیر اور تفہیم اور اس کے رسولؐ کی سنت میں اس کے اظہار کا نیا جائزہ لیں گے' وہ ان باتوں میں سے جنھیں وہ آج بھی اللہ کی مرضی کے مطابق سمجھتے ہیں' صرف اس لیے تبدیل نہیں کر دیں گے کہ وہ بات بیسویں [اکیسویں] صدی کے تقاضوں کو پورا نہیں کرتی' کیا ان کا فریضہ یہ نہ ہونا چاہیے کہ وہ اللہ کی مرضی کو تبدیل کرنے کے بجائے حالات کو تبدیل کریں۔
- سوم: مسلمانوں نے حال ہی میں مغرب کی ۳۰۰ سالہ نو آبادیاتی غلامی سے [نیم سیاسی] آزادی حاصل کی۔ اب ایک جانب تو وہ معاشی ابتلا کا شکار ہیں۔ دوسرے یہ کہ انھیں اپنے ایمان' اقتدار اور تہذیب سے دُور بھی کیا گیا ہے اور آزادی کے فوراً بعد سے انھیں نئے "ورلڈ آرڈر" اور عالم گیریت زدہ عالمی معیشت کے جال میں الجھا دیا

گیا ہے۔ ہر بیرونی طاقت' جو اتفاق سے' بہ یک وقت مغربی بھی ہے اور عیسائی بھی' ان کا دم گھوٹ رہی ہے۔ اس لیے وہ محسوس کرتے ہیں کہ وہ آزاد نہیں ہیں' دباؤ میں ہیں۔ ان حالات کی وجہ سے غوروفکر کے اس عظیم الشان کام کو سنبھالنے کے لیے نہ عزم ہے نہ ارادہ' نہ صلاحیت ہے نہ ادارے' اور سب سے اہم بات کہ نہ آزادی!

- چہارم: مسلمانوں میں صرف وہی نئی فکر قائم رہے گی جسے مسلمان واقعی اسلامی تسلیم کریں' جنھیں ایسے ادارے اور ایسی شخصیات انجام دیں جو علم و تقویٰ کے حامل ہوں۔ اسلام اور جمہوریت میں عدم مطابقت کے بارے میں مغرب اور چرچ جو چاہے سخن سازی کرے' تاہم حقیقت یہ ہے کہ اسلامی قوانین کی تشکیل کا عمل' جمہوری عمل ہی سے منسوب رہا ہے--- جنھیں مسلمانوں نے بالعموم قبول کیا' وہ باقی رہے' جنھیں قبول نہیں کیا وہ نہ رہے اور مٹ گئے۔

امید ہے کہ ہمارے مسیحی دوست اس بات کو محسوس کریں گے' مسئلہ یہ ہے کہ آج تک اسلام اور مسلمانوں کو عصر جدید کے تقاضوں کے مطابق "ڈھالنے" اور نام نہاد نظر ثانی کے لیے جو کوششیں بھی ہوئی ہیں' وہ ان مطلق العنان آمروں نے کی ہیں جو اپنے لباس' کھانے پینے کے طریقوں' رہنے سہنے کے انداز' غوروفکر کے پیمانوں اور حکمرانی کے ہتھکنڈوں' ہر لحاظ سے مغربی اور عیسائی رنگ میں سرتاپا رنگے نظر آتے ہیں۔ اسی لیے مسلمان چیخ اٹھتے ہیں کہ: یہ سب غلط ہو رہا ہے (Muslim cry: foul)۔

عیسائیوں کو اس لیے احساس شکست ہوتا ہے کہ ان کے تصور کے مطابق اسلام میں کسی سینٹ پال [م:۶۴ء] کے ظہور کا وژن عملی شکل اختیار نہیں کرتا۔ پھر تو مصر کے صدر [۷۰-۱۹۵۶ء] جمال ناصر [م:۱۹۷۰ء]' پاکستان کے صدر [۶۹-۱۹۵۸ء] فیلڈ مارشل محمد ایوب خان [م:۱۹۷۴ء]' انڈونیشیا کے صدر [۶۷-۱۹۴۹ء] احمد سویکارنو [م:۱۹۷۲ء] اور پاکستان کے وزیراعظم [وصدر: ۷۷-۱۹۷۱ء] ذوالفقار علی بھٹو [م:۱۹۷۹ء] جیسے لوگ بھی'

وہ کچھ دینے میں ناکام رہتے ہیں جو عیسائی سمجھتے ہیں کہ 'برابر کے بدلے کی بنیاد' کا تقاضا ہے۔

مجھے یقین ہے کہ مسلمان ایک دفعہ آزاد ہو جائیں اور اہل افراد اس کام کو کریں' تو مسلمان کفر وارتداد' توہین رسالت' حدود' اقلیتوں کے حقوق اور انسانی حقوق جیسے امور پر دوبارہ غور میں کوئی ہچکچاہٹ محسوس نہیں کریں گے۔ اس وقت بھی بحث جاری ہے' لیکن مذکورہ شرائط پوری نہ ہوں تو یہ بحث اور مشق نتیجہ خیز نہیں ہوگی۔

اسی 'برابر کے بدلے کی بنیاد' کا بہت کچھ تعلق طاقت کے توازن سے بھی ہے۔

چرچ کے رہنماؤں نے نقطۂ آغاز کے طور پر سیکولر ممالک میں مفاہمانہ تعاون کی نشان دہی کی ہے۔ یہ ایک غلط نقطۂ آغاز ہے۔ اس لیے کہ یہ ایک فریب اور دھوکا ہے۔ مملکتوں کے درمیان 'برابر کے بدلے کی بنیاد' کی کیا بات کی جائے' جب غیر مساوی ریاستوں کی جانب سے شہریوں کے ساتھ مساویانہ سلوک نہ کیا جاتا ہو۔ مثلاً: یوسف رمزی[7] کو پلک جھپکتے میں کسی قانونی چارہ جوئی کا موقع دیے بغیر امریکا کے حوالے کیا جاتا ہے۔ لیکن کیا پاکستان بھی اسی طریقے سے اپنے مجرم امریکا سے طلب کر سکتا ہے!

عدم توازن سے مذہبی صورت حال پر بھی اسی طرح کے اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ مسلمان محسوس کرتے ہیں کہ طاقت ور عیسائیوں کے مقابلے میں وہ کمزور ہیں۔ مسلمانوں کی یہ تصویر پیش کی جا رہی ہے کہ وہ دوسروں پر اپنی رائے ٹھونسنے والے' ضدی' رواداری سے عاری' کتابوں کو جلانے والے' دہشت گرد اور نہ جانے کیا کیا ہیں۔ ان کے عقیدے کو پر تشدد' عیاشی اور قتل و غارت کو فروغ دینے والا کہہ کر بدنام کیا جاتا ہے۔ اگر وہ توہین رسالت پر احتجاج کریں تو ان کو نصیحت کی جاتی ہے کہ اگر وہ برطانوی شہری بننا چاہتے ہیں تو انھیں بائبل کا مطالعہ

۷- رمزی احمد یوسف کو ۷ فروری ۱۹۹۵ء کو اسلام آباد سے امریکی ایف بی آئی نے گرفتار کیا۔ اُس پر دہشت گردی کا الزام تھا۔ ۸ جنوری ۱۹۹۸ء کو اسے عمر قید کی سزا مع ۲۴۰ سال سزائے قید سنائی گئی۔

کرنا پڑے گا۔

آخر میں، میں ایک قابل افسوس پس نوشت:

بوسنیا ہرزے گووینیا میں جو نسل کشی کی گئی ہے، کیا اس پر زیر نظر دستاویز کے صفحات[۸] میں "apart from Bosnia" (یعنی بوسنیا سے قطع نظر) کے الفاظ کے علاوہ کچھ اور نہیں لکھا جانا چاہیے تھا؟ جہاں اجتماعی قتل ہوئے، اجتماعی قبریں بنیں اور مسلمان خواتین سے اجتماعی زیادتی کے لاتعداد واقعات ہوئے اور جہاں ان کی ثقافت کو تباہ کرنے کی بدترین کوشش کی گئی۔ کیا 'مہذب' اور 'روشن خیال' عیسائی یورپ کے وسط میں مسلمانوں پر ہونے والے اس ظالمانہ اور غیر انسانی سلوک پر رپورٹ میں مزید کچھ کہنے کی ضرورت نہ تھی؟

بوسنیا [اور پھر چیچنیا' کوسووا' البانیہ' مقدونیہ] میں مسلمانوں کے بڑے پیمانے پر قتل عام کے پس منظر میں، کیا مسلمانوں اور عیسائیوں کی مشترکہ امدادی ایجنسیوں کا کام یہ یقینی بنانے کے لیے کافی ہے کہ دنیا کو ناقابل بیان مصائب اور خون خرابے سے محفوظ رکھا جا سکتا ہے۔ محض 'برابر کے بدلے کی بنیاد' پر خوش نما اعلانات کرنے اور قراردادیں پاس کر لینے سے کچھ نہیں ہوگا۔

مجھے خوشی ہوگی کہ اگر مجھے بتایا جائے کہ اگر ایسا ہو سکتا ہے تو کس طرح ہو سکتا ہے۔ میں کلیسا کے محترم رہنماؤں سے پھر عرض کروں گا کہ وہ اپنی دستاویز پر دوبارہ غور کریں گے تو شاید وہ مجھ سے اتفاق کریں کہ اس پیچیدہ معاملے میں نئے نقطۂ نظر کی ضرورت ہے۔

میری رائے میں دستاویز میں لکھے گئے الفاظ: ''باہمی احترام اور 'برابر کے بدلے کی بنیاد' پر مبنی تعلقات[۹]'' میں بعض جملوں کا اضافہ کر کے اس طرح سے تحریر کیا جانا چاہیے:

۸- Christian / Muslim Reciprocity، ص ۷۱

۹- ایضاً، ص ۷۰

for each other's faith and their right and endeavour to live by their faith as they understand it.

تعلقات جو ایک دوسرے کے عقیدے کے باہمی احترام اور تعاون اور ان کے عقیدے کے مطابق' جیسا بھی وہ اس کو سمجھتے ہوں' زندگی گزارنے کے ان کے حق اور کوشش پر مبنی ہوں۔

کیونکہ بالآخر ان سب بحثوں کا مرکزی نکتہ' تمام تلخیوں اور تمام جھگڑوں کا بنیادی سبب ایک دوسرے کا اس طرح سے احترام اور تعاون کے لیے تیار نہ ہونا ہے' کہ ہر ایک اپنی روایات کی پاس داری کرتے ہوئے اپنی زندگی گزار سکے۔[فروری ۲۰۰۱ء]

❑❑❑

اسلام کا تصورِ نبوت

مختلف المذاہب لوگوں کے لیے پرامن زندگی گزارنے کا راستہ ☆

تضادات سے بھرپور اس دنیا میں مل جل کر رہنا کوئی آسان کام نہیں ہے۔ تاہم' کہا جاسکتا ہے کہ یہ ان نہایت مفید کاموں میں سے ایک ہے' جو اگرچہ پیچیدگیوں سے بھرپور اور ہلاکت خیز حد تک خطرناک ہے' لیکن اس میں انسان اپنی تخلیق کے روزِ اول ہی سے سرگرم عمل ہے۔

ان کوششوں کا دائرہ طبعی لحاظ سے نہیں ہے' بلکہ معاشرتی اعتبار سے ہے۔ کیونکہ طبعی لحاظ سے انسان زندہ تو رہ سکتا ہے' لیکن معاشرتی روابط کے بغیر انسانی زندگی کا تانا بانا نہیں بُنا جاسکتا۔ یہ قلب و ذہن کا دائرہ ہے جس میں میل ملاپ' افہام و تفہیم' باہمی تعاون اور اس دنیا میں مل جل کر امن و امان اور محبّت کو عام کرنا ایک فطری امر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اندیشوں اور

☆Living Together in a World of Diverse Faiths: An Islamic Perspective.

Encounters' جلد ۵' شمارہ ۱' ۱۹۹۹ء۔ ص ۳-۲۹' دی اسلامک فاؤنڈیشن' برطانیہ۔

ترجمہ: قاضی محمد اقبال' مسلم سجاد۔

ناکامیوں کے باوجود اس عظیم کام میں آدم وحوا کے بیٹوں اور بیٹیوں کے لیے ناقابلِ شکست کشش موجود رہی ہے۔ مل جل کر رہنے کی مشکلات نے انسانی خواہشات اور جدوجہد کو اکثر حیرانی اور مایوسی سے بھی دوچار کیا ہے' لیکن اس کے لیے کوشش کو کبھی ترک نہیں کیا گیا۔ اگرچہ یہ حقیقت سے زیادہ ایک خواب' اور کارنامے کے بجائے ایک تمنا رہی ہے۔

تخلیق کے ہر اظہار میں لازماً تنوع پایا جاتا ہے۔ لیکن اس کا منبع اور جوہر وحدانیت ہے۔ اگر اسی تنوع سے آدمی یہ سیکھنے کے لیے آمادہ ہو کہ وہ کس راستے پر چل کر اپنے خالق کو تلاش کرے اور اس تک پہنچے' تو اس جستجو میں مایوس ہونے کا کوئی خدشہ نہیں رہتا:

- اور ہر چیز کے ہم نے جوڑے بنائے ہیں۔ شاید کہ تم اس سے سبق لو (کہ خدا ایک ہے)۔ پس دوڑو اللہ کی طرف۔ (الذاریات ۵۱:۴۹-۵۰)
- اور اس کی نشانیوں میں سے آسمانوں اور زمین کی پیدائش اور تمھاری زبانوں اور تمھارے رنگوں کا اختلاف ہے۔ یقیناً اس میں دانش مند لوگوں کے لیے بہت سی نشانیاں ہیں۔ (الروم ۳۰:۲۲)
- کیا تم دیکھتے نہیں ہو کہ اللہ آسمان سے پانی برساتا ہے۔ پھر اس کے ذریعے سے ہم طرح طرح کے پھل نکال لاتے ہیں' جن کے رنگ مختلف ہوتے ہیں۔ پہاڑوں میں بھی سفید' سرخ اور گہری سیاہ دھاریاں پائی جاتی ہیں' جن کے رنگ مختلف ہوتے ہیں' اور اسی طرح انسانوں اور جانوروں اور مویشیوں کے رنگ بھی مختلف ہوتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اللہ کے بندوں میں سے صرف علم رکھنے والے لوگ ہی اس سے ڈرتے ہیں۔ (فاطر ۳۵:۲۷-۲۸)

باہم مل جل کر رہنے میں جو بہت سی رکاوٹیں حائل ہیں' ان میں خاص طور پر مذہب کو اور وہ بھی زیادہ مانے جانے والے مذاہب اور عقائد کو' عرصۂ دراز سے اہم ترین وجہ اختلاف قرار دیا جاتا ہے۔ یہ بات ایک حد تک درست ہے۔ ان عقائد کو تشدد اور تنازعات پیدا

کرنے کے لیے استعمال کیا جاتا رہا ہے' تاہم مغرب میں 'روشن خیالی' (enlightenment) کے دور نے اس تصور کی نشو ونما میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ عقلی و ذہنی ارتقا سے قطع نظر' بعض تاریخی وجوہ نے بھی مغربی فکر میں مذہب کے اس تصور کو نمایاں کرنے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ دنیا کا کوئی خطہ بھی اس سے خالی قرار نہیں دیا جا سکتا' لیکن یورپ خصوصی طور پر مذہب کے نام پر شدید تشدد کا منظر نامہ پیش کرتا رہا ہے۔

ایک ایسے وقت جب مختلف عقائد کی حامل مختلف اقوام مختلف علاقوں میں مل جل کر رہ رہی تھیں' یورپ' مذہبی بنیادوں پر جنگوں اور مذہبی اقلیتوں پر 'ہسپانوی حل' ['Spanish Solution' یعنی دوسرے مذاہب کے ماننے والوں کا صفایا جیسا حل] مسلط کرنے میں مصروف تھا۔ یہاں تک کہ ۱۹۹۰ء میں بھی اس یورپ کے نزدیک مذہبی اختلافی مسئلے کا حل' اقلیتوں کا صفایا یا مکمل جلاوطنی ہی قرار پایا ہے [جس کا ایک مظاہرہ بوسنیا میں کیا گیا]۔ یہی سب سے بڑا سبب ہو سکتا ہے کہ مذہبی کثرتیت (pluralism) کی حقیقت اور اس کے مطالبات سے ہم آہنگی کی ضرورت' جو صدیوں سے بہت سے لوگوں کے نزدیک زندگی کی ایک حقیقت کے طور پر چلی آ رہی ہے' مغرب پر اب اتنی دیر بعد منکشف ہوئی ہے۔

اتحاد انسانی میں مذہب کا کردار

سوال یہ ہے کہ بنی نوع انسان کو متحد کرنے میں مذہب کیا اہم کردار ادا کر سکتا ہے؟

اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اس مسئلے کو حل کرنے کے لیے مذہبی شخصیتوں کے باہمی مکالمے کی ضرورت ایک بڑا چیلنج ہے' خواہ اس مکالمے کی ابتدا مغرب کی طرف سے ہو۔ یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ تمام مذاہب کو ایک سائنسی نقطۂ نظر کی سطح پر لانے کا خبط بھی مغرب ہی کا پیدا کردہ ہے۔ بجائے اس کے کہ ایک ایسا خاکہ تیار کیا جائے جو الہامی مذاہب کی حیثیت سے ان کے الگ وجود کو تسلیم کرے۔

اس حقیقت کو واضح طور پر تسلیم کرنا چاہیے کہ مذہبی عقائد نے بنی نوع انسان کو تقسیم کرنے میں کوئی بڑا یا فیصلہ کن کردار ادا نہیں کیا۔ دراصل دوسرے عقائد جن میں لادینیت' قوم پرستی وغیرہ شامل ہیں' وہ خود نسلِ انسانی کی بقا کے لیے بڑے خطرے بن گئے ہیں۔ یہ عقائد کسی آسمانی خدا کو تسلیم نہیں کرتے' بلکہ انسان پر انسان کی خدائی مسلط کرنے کے لیے متحرک ہیں۔

امر واقعہ یہ ہے کہ 'روشن خیالی' کے جڑواں بچوں' یعنی لادینیت اور قوم پرستی کے پیدا کردہ تشدد کے سامنے مذہب کے نام پر جرائم ماند پڑ جاتے ہیں۔ ذرا دیکھیں کہ [بیسویں صدی کے دوران مغرب کی مسلط کردہ] دونوں عظیم جنگوں کے دوران قتلِ عام' ہیروشیما اور ناگاساکی پر ایٹمی حملے' اس کے بعد کوریا اور ویت نام' ہنگری اور چیکوسلوواکیہ پر اور اب سابق یوگوسلاویہ [پھر افغانستان اور عراق] پر کیا گزری ہے؟ قوم پرستی یا نسل پرستی کی قربان گاہوں پر' منڈیوں کی تلاش یا ترقی اور توسیع پسندی کی ناقابلِ تسکین پیاس اور نام نہاد انسان پرستی اور سائنسی طریقۂ کار کی کوکھ سے پیدا ہونے والے نظریات کے لیے [صرف ڈیڑھ صدی میں] جو خون بہایا گیا ہے وہ اتنا زیادہ ہے کہ ماضی بعید کی معلوم تاریخ کو بھی اس سے کوئی نسبت نہیں۔

ٹکنالوجی کی متنوع برکات کے تحفوں اور 'ایک عالم گیر دنیا' کے ظہور نے مل جل کر رہنے کے کام کو آسان نہیں بنایا۔ اس سے قبل مشکلات اور خطرات ایسے گمبھیر نہ تھے جیسے کہ اب ہیں۔ فاصلوں کے سمٹ جانے کے عمل نے لوگوں کو ایک دوسرے سے قریب نہیں کیا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ آواز کی رفتار سے ہم ایک جگہ سے دوسری جگہ پہنچ سکتے ہیں۔ یہ بھی صحیح ہے کہ خیالات' تصورات اور اطلاعات کو ایک لاکھ ۸۶ ہزار میل فی سیکنڈ کی رفتار سے کرۂ ارض کے پار پہنچایا جا سکتا ہے۔ پھر بھی صدیاں گزرنے کے باوجود باہمی محبت' فہم و ادراک اور خیرخواہی کے جذبات ایک پڑوسی سے دوسرے پڑوسی تک نہیں پہنچ سکے۔

اس منظرنامے کو دیکھتے ہوئے میں' ولفریڈ کینٹ ویل سمتھ کی رجائیت پسندی اور خوشی میں شریک ہونا مشکل سمجھتا ہوں' جب وہ یہ کہتا ہے کہ 'فی الحال کم سے کم تشدد' باہمی چپقلش اور

نفرت سے چھٹکارا پا لیا گیا ہے یا پایا جا سکتا ہے' اور تنہایت پسندی اور جہالت جلدی ختم ہونے والی ہیں۔ ماضی میں تہذیبیں ایک دوسرے سے بے نیاز رہیں' اب ایسا نہیں ہے۔ ہم تفصیلی طور پر ایک دوسرے سے آگاہ ہو چکے ہیں اور مذہبی اور ثقافتی سطح پر بھی رفتہ رفتہ آگاہی حاصل کر رہے ہیں۔[1]

آیئے! لوگوں میں پائے جانے والے سیاسی' ثقافتی اور نسلی فاصلوں کو ایک لمحے کے لیے نظر انداز کر دیں اور مختلف مذاہب کے پیروکاروں پر نگاہ ڈالیں۔

ہوسکتا ہے کہ وہ واقعی یا استعارے کی زبان میں 'قریب کے پڑوسی' ہوں، ایک دوسرے کے بارے میں مکمل معلومات کتابوں کی الماری میں موجود ہوں' لیکن صورت حال یہ ہے کہ واقفیت پہلے ہی کی طرح بہت کم ہے' اور حقیقی علم تا حال ایک دور کا خواب معلوم ہوتا ہے۔ میں اسلام اور مسلمانوں کے بارے میں کسی غیر مسلم کی' خواہ وہ کتنا ہی عالم و فاضل کیوں نہ ہو' جو بھی تحریر اٹھاتا ہوں' اسے پہلے سے تشکیل شدہ تصورات' مضحکہ خیز مفروضوں اور لاعلمی' حتیٰ کہ تعصّبات سے بھرپور پاتا ہوں۔ غیر مسلم جب کسی مسلمان کی تحریر پڑھتے ہوں گے تو ان کے بھی اسی طرح کے تاثرات ہوتے ہوں گے۔

کیا ہم سب اپنے آپ کو اور دوسروں کو رنگ دار شیشوں سے دیکھتے ہیں؟ معلوم ہوتا ہے کہ اب' جب فاصلے سکڑ رہے ہیں تو دوسری طرف ذہنوں' دلوں اور رویوں کے درمیان فاصلے بڑھتے جا رہے ہیں۔ ہوسکتا ہے کہ یہ تناسب بالکل الٹ (inverse) ہو۔

یقیناً' مذہب بنی نوع انسان میں تفرقات پیدا کرنے اور خون بہانے کا اصل ذمہ دار نہیں۔ بلکہ اگر مناسب طرزِ فکر اور طرزِ عمل اختیار کیا جائے تو مذہب اب بھی واقعی' ایک عالم گیر دنیا' کی تشکیل میں کلیدی کردار ادا کر سکتا ہے' یعنی ایک ایسے عالم گیر معاشرے کا قیام' جو ایک

۱- ولفرڈ کینٹ ویل سمتھ [۱۹۱۶ء-۲۰۰۰]: On Understanding Islam ماؤٹن پبلشرز' دی ہیگ' ۱۹۸۱ء' ص ۲۹۳

'خدا کے کنبے' کی طرح زندگی گزارے۔ بنی نوع انسان کی بقا کو جو چیلنج درپیش ہے وہ اتنا بڑا ہے کہ اسے یہ کوشش ضرور کرنی چاہیے۔

بین المذاہب مکالمہ

اس حوالے سے مذہبی شخصیتوں کے لیے اپنے ماضی' حال اور مستقبل پر بحث ومباحثے کے لیے ایک اجلاس کا انعقاد بہت ضروری ہے۔ ایسے اجلاس یا مکالمے کا مفید اور معنی خیز ہونا شرکا کے اخلاص پر منحصر ہوگا۔ لیکن اس کی اصل اہمیت یہ ہوگی کہ مختلف مذاہب کے ماننے والے اکٹھے ہوکر' کھل کر اپنے مشترکات اور تضادات' اپنے تاریخی اور حالیہ تعلقات کی حرکیات اور ان خاکوں' مثالیوں اور مفروضوں پر غور کریں' جو ان کے باہمی رشتوں سے تعلق رکھتے ہوں اور جو اُس الہامی دانش کے خزانے سے اخذ کردہ ہوں کہ جو ان کے پاس ہے۔

اس کا مقصد ایک عالمی مذہب' یا کلی یکسانیت یا ہمہ گیر ہم آہنگی نہیں' جیسا کہ اس سے قبل بیش تر لوگوں نے اپنے مکالمات میں بیان کیا ہے۔ میری رائے میں اس کا لازماً یہ مطلب بھی نہیں ہے کہ مذہباً تبدیل ہوا جائے' لیکن اس کا یہ مطلب ضرور ہے کہ ایک دوسرے کے ورثے کے بارے میں ایک بہتر سوچ پیدا کرلی جائے' اور باہم اختلافات کو تسلیم کرتے ہوئے مشترکہ بنیادوں کو تلاش کیا جائے۔

تاہم' اگر ہم بہت واضح اور مشترک باتوں کے علاوہ دیگر امور کو اس خوف سے تسلیم کرنے سے انکار کردیں کہ اس کا مطلب تبدیلیِ مذہب ہوگا' اور ہم اپنے اختلافات کی اصل نوعیت کا کھوج لگانے اور اس پر بحث کرنے سے اس لیے ہچکچائیں کہ اس سے ہماری دوستیاں اور رفاقتیں متاثر ہوں گی اور اپنی مذہبی صداقتوں کے بارے میں ہمارے بیانات کو محض وعظ سمجھ لیا جائے گا' تو اس طرح ہمارے بین المذاہب مکالمے کا ایک اہم مقصد پس پشت چلا جائے گا۔ لیکن اس کا مطلب یہ بھی نہیں ہے کہ اگر ہم مشترکہ مقاصد کے لیے بعض امور پر متفق

ہو کر جدو جہد کریں تا کہ باہمی تعلقات اور عام انسانی حالت میں بہتری پیدا ہو' تو کچھ فائدہ نہ ہوگا۔ اگر اس طرف توجہ نہ کی گئی تو سیاسی اور لادینی تنازعات جو آج ہمارے درمیان پُر تشدد تفریق پیدا کر رہے ہیں' وہ مذہبی اختلاف سے بھی زیادہ سنگین ہو سکتے ہیں۔ یہ عموماً مذہبی اجلاسوں کے ایجنڈے میں جگہ نہیں پاتے۔

ایس جے سمارتھا کہتی ہیں: مذہبی شخصیات کے اجلاس کا اہم ترین مقصد یہ ہو کہ وہ ہمارے مخصوص ورثوں کے ماخذ کا تعیّن کرے اور ان کی ایسی تعبیر کرے جو ہمیں ساتھ رہنے میں مدد دے[۲] کیونکہ ہم ایک مشترک مستقبل میں حصّہ دار ہیں۔ ساتھ رہنے کے لیے اتنا ہی' یا اس سے بھی زیادہ اہم' ان ماخذ کا تعیّن ہو سکتا ہے جن میں ہم حصّہ دار ہیں' جو ہمارے لیے مخصوص نہیں ہیں لیکن یہ ہمارا مشترکہ ورثہ بن گئے ہیں۔ بڑے اور سنگین قسم کے اختلافات اور بے شمار تنازعات کے باوجود ایسے ماخذ کم یاب نہ ہوں گے' اور آج بین المذاہب تعلقات قائم کرنے کے لیے ان کی تلاش' ہو سکتا ہے کہ بہ نسبت کسی اور چیز کے' زیادہ ثمر آور ثابت ہو۔

مختلف مذاہب کی مشترک بنیاد

عام طور پر سمجھا جاتا ہے کہ یہودیت' عیسائیت اور اسلام میں بہت سی باتیں مشترک ہیں اور اس لیے امید کی جا سکتی ہے کہ اس عمل کے نتیجے میں ایسے مزید ماخذ مل سکتے ہیں۔ لیکن عملاً صورت حال یہ ہے کہ یہ ایک دوسرے کے خلاف محاذ آرا ہیں اور رہے ہیں۔ شاید ہم اسی لیے محاذ آرا ہیں کہ ہم میں مشترکات بہت ہیں۔ یہ بذاتِ خود تحقیق کا ایک دل چسپ موضوع ہو سکتا ہے۔ لیکن میں سمجھتا ہوں کہ دوسرے بڑے مذاہب کے ساتھ مشترک ماخذ کی تلاش و جستجو کو بھی کچھ کم ثمر آور ثابت نہ ہونا چاہیے۔

۲- ایس جے سمارتھا' مرتب: Towards World Community: The Colombo Papers۔ ورلڈ کونسل آف چرچز' جنیوا ۱۹۷۵ء' ص ۴۔

اگر ہم صرف یہ کام کریں کہ تاریخ نے ان پر جو پردے چڑھا دیے ہیں ان کو اتار دیں' اور ان کی تہ میں پوشیدہ زبان اور علامات کے پس پردہ اصل مطالب کو تلاش کریں۔ ہمیں ان تین مذاہب کے بارے میں بھی یہ جائزہ لینا ہوگا کہ ان میں کیا چیز مشترک ہے' تاکہ ان طریقوں کے بجائے جو خود انسانی ذہن نے اللہ تک رسائی کے لیے اختیار کیے ہیں' ان طریقوں کو معلوم کیا جائے جو اللہ نے انسانی ذہن کو اپنے تک رسائی حاصل کرنے کے لیے سکھائے ہیں (یہ بجائے خود ایک بدیہی مفروضہ ہوگا جو دوسرے کے خلاف ہوگا)۔ ہوسکتا ہے کہ یہ ایک بڑی دل چسپ پیش رفت ثابت ہو۔

اگر مذہب کے ماخذ کی تعریف اس کے: صحیفے' روایات' تاریخ' ثقافت' موروثی دانش' اور اس اصول کی روشنی میں کی جائے' جو اس نے دوسرے مذاہب کی اقوام سے اپنا رشتہ یا تعلق استوار کرنے کے لیے استعمال کیا ہے' تو یہ بات واضح ہوجاتی ہے[۳] کہ یہودیت' عیسائیت اور اسلام جو مشترکہ سرمایہ رکھتے ہیں' اس میں سب سے زیادہ مشترک چیز نبوت کا ادارہ اور بعض انبیا علیہم السلام کی شخصیات ہیں۔ انبیا علیہم السلام بحیثیت ایسے انسان جن سے اللہ ہم کلام ہوا اور جنھیں اللہ نے انسانوں کو یہ سکھانے کے لیے مبعوث کیا کہ اللہ کی عبادت کیسے کی جائے' ہمارے مذاہب میں اتنا اہم اور نمایاں مقام رکھتے ہیں کہ شاید 'مشترکہ وسیلے' (shared resource) کے طور پر نبوت سے زیادہ کوئی چیز ہماری توجہ کی محتاج نہیں۔

یہ درست ہے کہ اس معاملے میں ہمارے درمیان بنیادی اور سنگین قسم کے اختلافات موجود ہیں۔ ایسے اختلافات جو غالباً دوسری چیزوں سے بڑھ کر ہمارے تنازعات کا باعث رہے ہیں۔ ایک طرف ہم نبوت کے استدراک (understanding) میں اختلاف رکھتے ہیں' خصوصاً عیسائی فہم کے مطابق ''یسوعؑ کی گواہی ہی نبوت کی روح ہے''۔ مسلمان ایک

۳- ایس جے سمارتھا: ایضاً' ص ۸

محدود مفہوم اور تعبیر کے مطابق شاید اس نظریے سے کچھ ہمدردی رکھتے ہیں' مگر یہودی ہرگز اس پر راضی نہ ہوں گے۔ دوسری طرف ہم اس ضمن میں شدید اختلاف رکھتے ہیں کہ حقیقی اور سچا نبی کون ہے؟ جب بات حضرت عیسیٰؑ اور آنحضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کے اسلامی نقطۂ نظر تک پہنچتی ہے' تو ہم دو مختلف کناروں پر پہنچ جاتے ہیں۔ عیسائی اور یہودی دونوں اسلامی نقطۂ نظر سے ہرگز اتفاق نہیں کرتے۔ یہ اختلافات کچھ کم اہمیت نہیں رکھتے۔ البتہ اگر ہم اعتماد اور بھروسے کے ساتھ مذہبی شخصیات کی حیثیت سے' مفید نتائج کے لیے میل جول جاری رکھنے کے متمنی ہوں تو ان ماخذ کی باہم جستجو کو' خواہ یہ اشتراک اور اتفاق میں ہو یا اختلاف میں' انھیں زیادہ عرصے تک معرض التوا میں نہیں ڈالے رکھنا چاہیے۔

پہلے قدم کے طور پر' کچھ دیر کے لیے فی الحال اس سوال کو ایک طرف اٹھا رکھنا چاہیے کہ کون نبی تھا۔ اس کے بجائے اس ادارے کے بنیادی خدوخال پر توجہ مرکوز کرنی چاہیے' جسے ہم سب اپنی روایات میں بھرپور طریقے سے موجود پاتے ہیں۔ کیا یہ بہتر نہ ہوگا کہ ایک ایسے موضوع کا مطالعہ کیا جائے جو کسی ایسے نمونے یا خاکے کی بنیاد فراہم کرسکے جس پر ہم اس امید پر 'ایک عالم گیر دنیا' کے مذاہب میں رشتوں کی تعمیر کرسکیں کہ یہ ممکن ہے۔

○

میں اس مقالے کے بیش تر حصے میں ان موضوعات پر گفتگو کروں گا' جو اسلام میں نبوت کے تصور کے مطالعے کے دوران واضح ہوتے ہیں۔

اس مقصد کے لیے میں خصوصی طور پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور قرآن پاک کی تعلیمات پر انحصار کروں گا۔ صرف اس لیے نہیں کہ میں ایک مسلمان ہوں' بلکہ اس لیے بھی کہ میرے خیال میں قرآن کریم اس ادارے کے بنیادی خدوخال سے بہت جامع اور تفصیلی انداز میں بحث کرتا ہے' اور اس طرح ہمیں اس قابل بناتا ہے کہ ہم ایک مربوط اور مکمل نظریہ تشکیل

دے سکیں۔ جو کچھ انبیا علیہم السلام نے کہا یا کیا' جس کا انجیل میں بڑی تفصیل سے اور بڑے مؤثر انداز میں تذکرہ موجود ہے' وہ بھی ایک قیمتی ماخذ ہوگا۔ میرا مقصد یہ ہے کہ اس اہم دائرے میں قرآنی تعلیمات کی روشنی میں حاصل ہونے والی بصیرت کو ایک بین المذہبی گروہ کے سامنے تنقیدی جائزے کے لیے پیش کروں۔

نبوت کے موضوع پر علماے یہود و نصاریٰ کے مطالعوں کی کمی نہیں ہے۔ مگر وہ زیادہ تر عہد نامہ عتیق تک محدود رہتے ہیں اور ان کا یہ عمل قابلِ فہم بھی ہے۔ اپنی محدود تحقیق و جستجو کے دوران' کسی غیر مسلم محقق یا دانش ور کی جانب سے نبوت کے قرآنی نقطۂ نظر کا تفصیلی مطالعہ میری نظروں سے نہیں گزرا۔ سوائے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بحیثیت پیغمبر مطالعے کے' جو ہمیشہ ایک ہی حتمی نتیجے پر پہنچتا ہے۔ زیادہ تر لکھنے والے مصنفین' اسلام میں نبوت کے بنیادی موضوع پر غور و فکر کیے بغیر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر آ جاتے ہیں' حالانکہ قرآن اس موضوع پر غور' فکر اور تدبر کے لیے بہت زیادہ زور دیتا ہے۔ اس صورت حال پر تعجب ہوتا ہے کہ غیر مسلم اہلِ علم نے قرآن کے اس بڑے موضوع کو چھوڑ کر اکثر معمولی اہمیت کے حامل معاملات پر تفصیلی مطالعہ کیا ہے۔

مغربی اہلِ علم کی طرف سے مطالعے کے اس میدان کی طرف اتنی کم توجہ کیوں دی گئی؟ اس سوال کا کوئی مکمل جواب نہیں۔ انھوں نے قرآنی نظریہ شاید اس لیے مسترد کر دیا کہ عقلی اور مذہبی دونوں لحاظ سے ان کے ہاں اس کی کوئی اہمیّت نہیں ہے۔ یا' اس لیے کہ اسے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے پیش کردہ ایک ایسی چیز کے طور پر دیکھا گیا ہے جس سے ان کے دعویٰ (نبوت) کو تائید مل جائے' اور ان کی پوزیشن کو اپنے مخالفین کے مقابلے میں سہارا مل جائے۔ یا' شاید مغربی اہلِ علم' قرآن میں عرب تاریخی تناظر کی کمی کی طرف زیادہ متوجہ رہے ہیں' اور اس حیرت میں مبتلا رہے ہیں کہ گذشتہ انبیاؑ کے ناموں کا مختلف جگہوں پر مختلف ترتیب کے ساتھ کیوں تذکرہ کیا گیا ہے' اور انھیں ایک صاف اور واضح تاریخی سلسلے کی

صورت میں کیوں نہیں بیان کیا گیا' جیسا کہ ایک انسان سے بحیثیت مصنف کرنے کی امید کی جاتی ہے۔ اس طرح یہ لوگ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تدریجی اور قدیم تاریخی معلومات کو بائبل سے ماخوذ ثابت کرنا چاہتے تھے۔

قرآن کے ساتھ رویہ

قرآنی بیانات میں نہ صرف ہدایت ربانی اور نبوت کا ایک خاص نقطۂ نظر موجود ہے' بلکہ انسان کی ابتدا اور مذہبی تاریخ کا نظریہ بھی موجود ہے' جو مغرب کے بیشتر اہلِ علم کے لیے خوف اور ناراضی کا باعث ہے۔ اپنے روایتی علم وفکر پر مضبوطی سے جمے ہونے کی وجہ سے ان کے نزدیک یہ اس حد تک ناپسندیدہ ہے کہ وہ اس پر دوسری نظر بھی نہیں ڈالتے۔ ان کے نزدیک یہ سب کچھ ساتویں صدی کے جزیرہ نما عرب کی طبعی' سائنسی علوم' تاریخ اور فلسفہ کے میدان میں ایک خلل اندازی ہے اور یہ بھی اس طرح کہ اس کے پیچھے کسی حتمی' فیصلہ کن یا غالب تجرباتی شہادت کا وزن نہیں ہے۔

قرآن جو کچھ کہتا ہے اس کی تائید میں بظاہر کوئی تجرباتی (empirical) شہادت موجود نہیں ہے' لیکن سوال یہ ہے کہ کیا اس کے خلاف کوئی حتمی شہادت موجود ہے؟ کم از کم مجھے تو اب تک ایسی کوئی شہادت نہیں ملی۔ نہ مجھے انسان کے آغاز کے حوالے سے ارتقا کے نظریے کے حق میں' یا مذہب کی تاریخ کے حوالے سے فطری مذہب سے لے کر نبوی مذہب تک' یا بہت سے خداؤں پر عقیدے سے لے کر ایک خدا پر ایمان تک کے حق میں' کسی قسم کی حتمی (conclusive) شہادت ملی ہے۔ اس امر سے قطع نظر کہ اگر کوئی حتمی شہادت کبھی میسر آ بھی جائے جس سے سائنسی طور پر کسی سچائی کو ثابت کر دیا جائے یا اگر سائنس حتمی صداقت تک پہنچانے کا دعویٰ کرتی ہے' پھر بھی یہ سوال باقی رہ جاتا ہے کہ تاریخ کے کسی خاص مرحلے پر کیا دستیاب تاریخی شہادت کو حتمی طور پر قبول کر لیا جائے' تاکہ علم کی ہر دوسری شاخ کو اس کے

مطابق ڈھال دیا جائے اور اسی کے مطابق اسے قبول یا رد کیا جائے؟

اگر قرآنی نظریے کے چند اہم عناصر کی تائید میں خاطرخواہ تجرباتی دلائل فراہم ہوجائیں تو میں جو تجویز پیش کرنا چاہوں گا' وہ یہ ہوگی کہ یہ نظریہ اگرچہ میرے ایمان کی بنیاد ہے' پھر بھی اس کو تین سوالات کی روشنی میں ایک مفروضہ یا اندازہ سمجھا جائے: ○ اسے غلط ثابت کیا جا سکتا ہے یا نہیں؟ ○ کیا یہ قابلِ عمل ہے اور کسی معلوم شہادت کی توجیہہ کرتا ہے؟ ○ کیا یہ 'ایک عالم گیر دنیا' میں بین المذہبی تعلق کے خاکے کو اجاگر کرنے کے لیے کارآمد ہے؟ تحقیق و جستجو کا ایک سائنسی راستہ یہ بھی ہے کہ ایک مفروضہ تیار کر لیا جائے اور دیکھا جائے کہ کیا موجودہ صورت حال میں اس کا اطلاق ہوسکتا ہے۔

اہلِ مغرب کے ہاں ایک نقطۂ نظر کے مطابق' قرآنی نظریے کو اسلام کا سادہ لیکن شدید موقف قرار دے کر بہ نظر حقارت دیکھا جاتا ہے۔ یہ نقطہ نظر کہ اپنی صداقت کے ثبوت اور آخری مذہب ہونے کی حیثیت کی بنیاد پر اسلام' نوع انسان کی کُل مذہبی تاریخ پر اپنی چھاپ چاہتا ہے۔ لیکن ایک دوسرا نقطۂ نظر بھی تو غوروفکر کی دعوت دیتا ہے' وہ یہ کہ: قرآن دعویٰ کرتا ہے' پہلا انسان نبی تھا' مسلم تھا' اس کا مذہب اسلام تھا' اور یہ کہ سب نبی مسلم تھے اور وہ اسلام ہی لے کر آئے تھے۔ اس دعوے سے یہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ قرآن بعض ایسے مقدمات پیش کر رہا ہے' جو قائم بالذات انفرادیت اور عروج کی طرف رہنمائی کرنے کے بجائے 'ایک عالم گیر دنیا' (One World) میں مختلف مذاہب کے اکٹھے رہنے کی طرف رہنمائی کرتے ہیں۔

اسلامی نظریہ: بنیادی نکات

اسلامی نظریہ جن نکات کی طرف اشارہ کرتا ہے' وہ یہ ہیں:

○ تمام مذاہب کا ماخذ الہامی یا آسمانی ہے۔ اس لیے الہامی رہنمائی پر کسی خاص گروہ' نسل یا مذہبی مسلک کی اجارہ داری نہیں ہے۔

- آخرت میں نجات صرف ایک مذہب سے وابستگی پر منحصر نہیں ہے۔
- مختلف ہونے کے باوجود تمام مذاہب کے کچھ عناصر مشترک ہونے چاہییں کیونکہ ان سب کا آغاز ایک ہی منبع سے ہوا ہے۔

اس حقیقت کو بھی نظرانداز نہیں کرنا چاہیے کہ اسلام کا ہرگز یہ دعویٰ نہیں ہے کہ تمام انبیا کرام علیہم السلام' اسلام کی وہی صورت (version) لائے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم لائے۔ وہ ایک بہت سادہ پیغام لائے جو اسلام کا اصل جوہر ہے' یعنی:

- اللہ ایک ہے۔ صرف اسی کی عبادت کرو اور صرف اسی سے ڈرو۔
- میری پیروی کرتے ہوئے بھلائی کرو اور برائی سے بچو۔

اب ہم نبوت کے اسلامی تصور پر ایک سرسری نظر ڈال سکتے ہیں۔ اس کی بنیاد اور حقیقت کیا ہے؟ اسلام اس کو انسان کی زندگی کے سارے منصوبے میں کیا مقام دیتا ہے؟ اس کے بڑے اور اہم خدوخال کیا ہیں؟ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اسلام' خدائے واحد کی دنیا میں مذہبی کثرتیت کی قبولیت کے کس راستے کی طرف رہنمائی کرتا ہے؟ ہم یہاں آزادی فکر کے فلسفیانہ مضمرات پر زیادہ بحث نہیں کریں گے۔ ہم تو ایسی واضح اور قابلِ فہم اصطلاحات میں بات کریں گے' جو ایک عام آدمی کی سمجھ بوجھ کے مطابق ہوں۔ مثال کے طور پر: 'اللہ کا وجود ہے' اس کے مخاطب فلسفی اور اہلِ علم نہیں' بلکہ عام انسان ہیں جو مل جل کر رہنے کے مسائل سے نبردآزما ہیں۔ اہلِ علم کی اہمیت سے انکار نہیں' لیکن فی الحال وہ انتظار کر سکتے ہیں۔

ربانی رہنمائی

نبوت کے اسلامی نظریے کی ساری بنیاد اس پر ہے کہ خدا صرف ایک ہے: صرف وہی ہمیشہ کی زندگی کے بارے میں سوالات کے جوابات کی طرف ہماری رہنمائی کر سکتا ہے۔ انسانی زندگی کا مفہوم اور مقصد کیا ہے؟ اس کا آغاز کیسے ہوا؟ اور یہ ہم کو کہاں لے جاتی ہے؟ ان کے

جوابات کی روشنی میں انسان اپنی زندگی کو کیسی شکل دے اور کس طرح گزارے؟ یا مذہبی زبان استعمال کی جائے تو: انسان خدا کی عبادت کس طرح کرے؟ یہ صرف خدا ہی بتا سکتا ہے۔ صرف اس کی ہدایت ہی علم اور مکمل سچائی ہے۔ باقی سب گمان ہی کیا جا سکتا ہے جو جزوی علم یا جزوی سچائی ہوگی:

- صاف کہہ دو کہ راستہ بس وہی ہے جو اللہ نے بتایا ہے۔(البقرہ ۲:۱۲۰)
- اور کہو کیا ان میں کوئی ہے جس کو تم خدا کے ساتھ شریک کرتے ہو' جو سچائی کی طرف تمھاری رہنمائی کرے۔ کہو ''صرف اللہ ہے جو حق کی طرف رہنمائی کرتا ہے۔ وہ اس کا زیادہ مستحق ہے کہ اس کی پیروی کی جائے یا وہ جو خود راہ نہیں پاتا الا یہ کہ اس کی رہنمائی کی جائے؟ آخر تمھیں کیا ہو گیا ہے؟ کیسے الٹے اُلٹے فیصلے کرتے ہو۔ حقیقت یہ ہے کہ ان میں سے اکثر لوگ محض قیاس اور گمان کے پیچھے چلے جا رہے ہیں۔ حالانکہ گمان حق کی ضرورت کو کچھ بھی پورا نہیں کرتا''۔ (یونس ۱۰:۳۵-۳۶)

مزید برآں:

- اس معاملے کا کوئی علم انھیں حاصل نہیں' وہ محض گمان کی پیروی کر رہے ہیں۔ یہ گمان حق کی جگہ کچھ بھی کام نہیں دے سکتا۔(النجم ۵۳:۲۸)

بہت سے لوگ مظاہر قدرت کے بارے میں سائنس' ٹکنالوجی اور تاریخ کے ذریعے تجرباتی اعداد و شمار پر مبنی کچھ معلومات ضرور حاصل کر لیتے ہیں۔ لیکن کائنات اور زندگی کے پوشیدہ اسرار کے بارے میں وہ آسمانی رہنمائی یا ہدایت کے بغیر صرف قیاس اور خیال آرائی ہی کر سکتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ نہ صرف یہ کہ خدا کی عبادت کرنے کے لیے رہنمائی مِن جانب اللہ ہے' بلکہ یہ ہدایت دینا اللہ تعالیٰ کا وعدہ ہے۔ اگر میں یہ کہوں کہ یہ ایک ایسی ذمہ داری اور فرض ہے جو خدا نے خود اپنے اوپر عائد کیا ہوا ہے' تو غلط نہ ہوگا (میں جو زبان استعمال کرتا ہوں'

ضروری نہیں کہ وہ تینوں مذاہب کی روایت کے حوالے سے موزوں و مناسب ہو۔

میں ایک عالم (theologian) ہونے کا دعویٰ بھی نہیں کرتا' لیکن بہر صورت قرآنی زبان کے قریب ضرور رہتا ہوں): ''یقیناً ہم پر ہدایت دینے کی ذمہ داری ہے'' (الـلیل ۱۲:۹۲)۔ یہ وعدہ اس وقت کیا گیا جب انسان کو پہلی دفعہ پیدا کیا گیا۔ ''پھر جو میری طرف سے کوئی ہدایت تمھارے پاس پہنچے تو جو لوگ میری اس ہدایت کی پیروی کریں گے ان کے لیے کسی خوف یا رنج کا موقع نہ ہوگا'' ۔(البقرہ ۳۸:۲)

انسانی ذریعہ

اللہ تعالیٰ اپنا فرض اور وعدہ پورا کرنے کے لیے انسان کا ذریعہ کام میں لاتا ہے۔ بنی نوع انسان کے لیے ایسے انسانوں کے ذریعے اپنی ہدایت نازل کرتا ہے جنھیں وہ منتخب کرتا ہے' جن سے وہ ہم کلام ہوتا ہے اور جنھیں' اپنے فرمودات کا اعلان کرنے کی ذمہ داری سونپ دیتا ہے۔

پیغام کا آغاز' اس کے مضامین اور اس کے الفاظ' سب مکمل طور پر من جانب اللہ ہوتے ہیں اور یہ انسانوں کے لیے اس کی رحمت و محبت کا بے پایاں اظہار ہے:

- ہم نے اسے نازل کیا...... تیرے رب کی رحمت کے طور پر۔ (الـدخـان ۴۴: ۳-۶)
- اللہ زیادہ بہتر جانتا ہے کہ اپنی پیغامبری کا کام کس سے لے اور کس طرح لے۔ (الانعام ۱۲۴:۶)
- حقیقت یہ ہے کہ اللہ (اپنے فرامین کی ترسیل کے لیے) ملائکہ میں سے بھی پیغام رساں منتخب کرتا ہے اور انسانوں میں سے بھی۔ (الحج ۷۵:۲۲)

نبوت خدا کا عطیہ ہے' اس لیے صلاحیتوں کو نشوونما دے کر' یا مراقبہ (meditation)

کر کے' غور وفکر کر کے اسے ازخود حاصل نہیں کیا جا سکتا۔ وحی ایک نفسیاتی مغالطہ (delusion) نہیں ہے۔ یہ شاعرانہ تخیل بھی نہیں۔ یہ ایک سیاسی بصیرت یا خواہش بھی نہیں ہے اور نہ یہ ایک صوفیانہ (mystical) تجربہ ہی ہے۔ یہ کوئی فعل نہیں' ذاتی اور انسانی ردعمل نہیں۔ کوئی نبی خدا کی طرف جو الفاظ منسوب کرتا ہے' ان میں سے کوئی اس کا اپنا نہیں ہوتا۔ اگر ایسا ہو تو وہ جھوٹا ہوگا اور سب سے بڑا گنہگار۔ نہ وہ یہ کر سکتا ہے کہ فریب خیال یا جنون کی حالت میں الفاظ کو اللہ کی طرف منسوب کر دے۔ ایسی صورت میں وہ بڑی مشکل سے انبیاؑ کی طرح رہنمائی کر سکے گا' سختیاں جھیلے گا یا اپنے مخالفین کا سامنا کرے گا۔ پیغامِ الٰہی ہمیشہ صاف' واضح' روشن اور شکوک وشبہات سے پاک ہوتا ہے: ''پھر بھلا وہ شخص جو اپنے رب کی طرف سے ایک صاف شہادت رکھتا تھا' اس کے بعد ایک گواہ بھی پروردگار کی طرف سے (اس شہادت کی تائید میں) آ گیا''۔ (ھود ۱۱:۱۷)

واسطہ انسانی ہے' کیونکہ مخاطب انسان ہیں۔ لوگوں کے لیے یہ سمجھنا ہمیشہ مشکل رہا ہے کہ بھلا انھی جیسا ایک انسان کیونکر اللہ کا پیغام وصول کر سکتا ہے؟ ایک گوشت پوست کا عام انسان کیونکر اللہ سے ہم کلام ہو سکتا ہے؟ پہلے بھی ایسی ہی مذہبی الجھنیں اور مشکلات پیش آتی رہی ہیں اور آج بھی سائنسی بنیاد پر اعتراضات ہیں (پھر بھی جب کبھی ایسے انسان سامنے آئے تو ان کی دین دارانہ زندگی کا لوگوں پر ایسا اثر ہوا کہ ان کو الوہیت کے مقام تک پہنچا دیا گیا)۔ مگر قرآن پاک' انبیاؑ کے انسان ہونے پر بہت اصرار کرتا ہے: ''اے محمدؐ ان سے کہو پاک ہے میرا پروردگار۔ کیا میں ایک پیغام لانے والے انسان کے سوا اور بھی کچھ ہوں؟ لوگوں کے سامنے جب کبھی ہدایت آئی تو اس پر ایمان لانے سے ان کو کسی چیز نے نہیں روکا' مگر ان کے اس قول نے کہ: ''کیا اللہ نے بشر کو پیغمبر بنا کر بھیج دیا؟'' ان سے کہو' اگر زمین میں فرشتے اطمینان سے چل پھر رہے ہوتے تو ہم ضرور آسمان سے کسی فرشتے ہی کو ان کے لیے پیغمبر بنا کر بھیجتے'' (بنی اسرائیل ۱۷:۹۳-۹۵)۔ یہی وجہ تھی کہ ہدایت انسانوں کی زبان میں آئی۔

بولنا انسانی فعل ہے۔ وہ اس کے لیے ذمہ دار ہے اور اس کے لیے آزاد اور با اختیار ہے۔

حضرت آدمؑ کو جو علم دیا گیا تھا وہ اسماء کا علم تھا (البقرہ ۲:۳۱)۔ زبان سے مافی الضمیر کو بیان کرنا' رحمت الٰہی کا سب سے بڑا تحفہ اور انسانیت کا جوہر ہے۔ لہٰذا' یہ وحی کے عطیے کی ظاہری صورت ہے۔ (الرحمٰن ۵۵:۱-۹)

ہر چند کہ انبیاؑ انسان تھے' قرآن ان کی پاکیزہ زندگیوں کو' ان کے بے داغ کردار کو' نیک چلنی کو' اللہ اور اس کے مشن پر ان کے غیر متزلزل ایمان اور وفاداری کو' راہ حق میں جو تکالیف انھوں نے صبر سے برداشت کیں' ان سب کو نہایت نمایاں کرتا ہے۔ بلاشبہہ وہ انسانیت کی معراج تھے۔ اس لیے یہ بات اہم ہے کہ وہ اپنے دعووں اور مثالوں میں سچے ہوں' اور ان کی پیروی کی جا سکے: ''پھر ہم نے ہر ایک کو راہ دکھائی۔ اس طرح نیکوکاروں کو ان کی نیکی کا بدلہ دیتے ہیں...... بہتوں کو ہم نے نوازا۔ اپنی خدمت کے لیے چُن لیا اور سیدھے راستے کی طرف ان کی رہنمائی کی' یہ اللہ کی ہدایت ہے جس کے ساتھ وہ اپنے بندوں میں سے جس کی چاہتا ہے رہنمائی کرتا ہے......''۔ (الانعام ۶:۸۴-۹۰)

نبوت اور وحی (Revelation) سے متعلق بیانات کا یہ مطلب نہیں کہ موجودہ سائنسی چیلنجوں کے باعث جو مشکلات ان کی راہ میں کھڑی کر دی گئی ہیں انھیں نظرانداز کر دیا جائے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ ان پر سنجیدگی سے توجہ دی جائے' لیکن کسی دوسرے موقع پر۔

تاریخ اور عالم گیریت

اگر الہامی ہدایت پانے اور اس کے مطابق زندگی بسر کرنے ہی سے انسانی زندگی کے مقصد کی تکمیل اور اخروی نجات حاصل ہوتی ہے' تو پھر اس کا ظہور تاریخ کے کسی خاص لمحے کا انتظار نہیں کر سکتا۔ 'اولین انسان' پر اللہ کی طرف سے جو بارِ گراں ڈالا گیا وہ اتنا ہی بڑا اور عظیم تھا جتنا کہ کسی اور انسان کے لیے زمان و مکان کے کسی مرحلے پر ہو سکتا تھا۔ اس لیے پہلا انسان

ہی نبی تھا اور اسے وہ ضروری علم حاصل تھا جو آخری نبیؐ کو اور درمیان میں آنے والے تمام انبیاؑ کو حاصل تھا۔ اللہ کے نبی تمام زمانوں' علاقوں میں اور مختلف زبانیں بولنے والوں میں آئے:

- اور اللہ نے آدمؑ اور نوحؑ اور آل ابراہیمؑ اور آل عمران کو تمام دنیا والوں پر ترجیح دے کر اپنی رسالت کے لیے منتخب کیا تھا۔(آل عمرٰن ۳:۳۳)۔
- اے محمدؐ، ہم نے تمھاری طرف اسی طرح وحی بھیجی ہے جس طرح نوحؑ اور اس کے بعد کے پیغمبروں کی طرف بھیجی تھی...... اور ان رسولوں پر بھی جن کا تم سے ذکر نہیں کیا۔(النساء ۴:۶۴)۔
- ہر شخص کے آگے پیچھے اس کے مقرر کیے ہوئے نگران لگے ہیں۔(الرعد ۱۳:۷)
- ہم نے ہر اُمت میں ایک رسول بھیج دیا۔(النحل ۱۶:۳۶)

پیغام

تمام انبیاؑ ایک ہی ضروری پیغام لائے:

- اللہ کی عبادت کرو اور میری پیروی کرو' اور ہم نے تم سے پہلے جو رسول بھی بھیجا ہے اس کو یہی وحی کی ہے کہ میرے سوا کوئی خدا نہیں ہے۔ پس تم لوگ میری ہی بندگی کرو۔(الانبیا ۲۱:۲۵)

اور اگر کوئی اور چیز ان کے پیغام کا مشترک حصہ تھی تو وہ یہ تھی:

- نیکی کرو اور ہم نے ان کو امام بنا دیا جو ہمارے حکم سے رہنمائی کرتے تھے اور ہم نے انھیں وحی کے ذریعے نیک کاموں کی اور نماز قائم کرنے کی اور زکوٰۃ دینے کی ہدایت کی۔ وہ ہمارے عبادت گزار تھے۔(الانبیا ۲۱:۷۳)

اس کا مطلب یہ نہیں کہ وہ جو ہدایات لائے وہ تمام جزئیات میں ایک سی تھیں۔ رسوم و

آداب، قواعد وضوابط، معاشرتی اور انفرادی برائیوں پر توجہ کے لحاظ سے، ایک نبی کی تعلیمات دوسرے نبی سے مختلف ہوتی تھیں:

○ ہر اُمت کے لیے ہم نے ایک طریق عبادت مقرر کیا ہے جس کی وہ پیروی کرتی ہے۔ پس اے محمدؐ، وہ اس معاملے میں تم سے جھگڑا نہ کریں۔ (الحج ۲۲:۶۷)

تاہم، یہ اختلاف ان مذاہب کے پیروکاروں کے لیے اپنی نجات کا خصوصی دعویٰ کرنے یا پھر ایک دوسرے کے خلاف تشدد پر آمادہ ہو جانے کی بنیاد نہیں بن سکتا۔

ہم اب بحث کی ان بنیادوں سے آگے بڑھ سکتے ہیں کہ تمام مذاہب میں بہت سی باتیں مشترک ہونی چاہییں۔ اس لیے نہیں کہ انھوں نے ایک دوسرے سے مستعار لیا ہوا ہے، بلکہ اس لیے کہ ایک ہی خدا نے اپنا کلام تمام انبیاؑ تک پہنچایا ہے۔ یہ بات کہ ایک ہی بنیادی پیغام ہر مذہب کا سرچشمہ تھا اور یہ اب بھی ان کی میراث کا حصہ ہے، آنے والے تمام زمانوں کے لیے مختلف مذاہب کے ماننے والوں کے مابین باہمی تعاون اور امن کی بنیاد فراہم کرتا ہے۔

اس پیغام کے اجزا ایک سچے نبی کو ایک جھوٹے نبی سے ممیّز کرنے کا ایک اہم معیار فراہم کرتے ہیں۔ دوسرا معیار اس نبی کی راست بازی اور پاکیزہ زندگی ہے جس نے ہمیشہ اپنے زمانے پر اور آیندہ نسلوں پر ایک گہرا نقش چھوڑا۔

تبدیلیِ مذہب کی ذمہ داری

کسی نبی کا کبھی یہ مقصد نہیں رہا کہ وہ دوسروں کو جبر کے ذریعے اپنے ساتھ ملائے۔ وہ بخوبی جانتے تھے کہ وہی اور صرف وہی حق پر ہیں، پھر بھی انھوں نے اپنے مخاطبین کو کبھی اپنا پیغام قبول کرنے پر مجبور کرنے کا راستہ اختیار نہیں کیا۔ ان کی ذمہ داری ابلاغ تھی، پیغام پھیلانا، بات پہنچانا۔ ابلاغ کے مفہوم میں بات کرنا، مکالمہ، آزادیِ تقریر اور آزادیِ انتخاب شامل ہے۔ قرآن، انبیا اور ان کے مخاطبین کے مکالموں سے بھرا پڑا ہے۔

ہدایت کے راستے کا انتخاب یا گمراہ رہنا' رسول کے دائرہ اختیار سے باہر' انسان اور اس کے خدا کے درمیان ایک انفرادی معاملہ تھا۔ آنحضرتؐ کو اکثر بتایا گیا: ''(اے نبیؐ) نصیحت کیے جاؤ۔ تم بس نصیحت ہی کرنے والے ہو' کچھ ان پر جبر کرنے والے نہیں ہو'' (الغاشیہ ۸۸:۲۱-۲۲)۔ اے نبیؐ ''تم جسے چاہو ہدایت نہیں دے سکتے' مگر اللہ جسے چاہتا ہے' ہدایت دیتا ہے اور وہ ان لوگوں کو خوب جانتا ہے جو ہدایت پانے والے ہیں'' (القصص ۲۸:۵۶)۔ ہدایت کے راستے پر لے آنا یا فیصلہ کرنا رسول کی ذمہ داری نہیں ہے۔ نجات' مغفرت و بخشش یا سزا کے حوالے سے اللہ تعالیٰ کے آخری فیصلے میں رسول کا کوئی دخل نہیں ہے: ''فیصلے کے اختیارات میں تمھارا کوئی حصہ نہیں ہے۔ اللہ کو اختیار ہے' چاہے انھیں معاف کرے' چاہے سزا دے کیونکہ وہ ظالم ہیں''۔ (آل عمرٰن ۳:۱۲۸)

اسلام میں نبوت کے چند اہم پہلوؤں کا یہ انتہائی مختصر جائزہ کسی معاشرے میں مختلف بلکہ متضاد سچائیوں کے دعووں کے باوجود مل جل کر رہنے کے لیے' وسیع بنیاد کی نشان دہی کرتا ہے۔ تاہم' یہ واضح طور پر ایک دوسرے مذہب کی سچائیوں کو وسعت دینے کا ویسا نمونہ نہیں بن سکتا' جیسا کہ ولفرڈ کینٹ ول سمتھ نے کہا[۴] یا بھگوت گیتا میں لکھا ہے: ''جو بھی راستہ منتخب کرو گے' وہ میرا راستہ ہوگا''۔

تمام بڑے مذاہب کا الٰہیاتی سرچشمہ ایک ہی ہے۔ بعض اختلافات جو بنیادی طور پر اتنے اہم نہیں ہیں اصلی وحی والہام کا حصہ تھے۔ بعض اختلافات مختلف تہذیبوں اور انسانی فکر کے دھاروں سے ان کے باہمی تعامل سے وجود میں آئے۔ اختلافات کا یہ دوسرا دائرہ مذاہب کو سختی سے ایک دوسرے سے جدا کرتا ہے۔ پھر بھی ان میں بہت سی بنیادی صداقتیں مشترک ہیں۔ کوئی ایک طرف یہودیت' عیسائیت اور اسلام کے مابین اختلافات اور دوسری طرف

۴- ولفرڈ کینٹ ویل سمتھ: The Meaning and End of Religion' ایس پی سی کے' لندن' ۱۹۷۸ء

○ جان ہک (مرتب): Truth and Dialogue' شیلڈن پریس' لندن ۱۹۷۵ء' ص ۲۰-۴۴

ہندومت اور بدھ مت کے مابین اختلافات کی طرف اشارہ کر سکتا ہے' میرے خیال میں جن کی بالترتیب 'پیغمبرانہ' (Prophetic) اور 'صوفیانہ' (mystical) حیثیتوں سے غلط طور پر درجہ بندی کی گئی ہے۔ لیکن اگر آج یہ سوالات کھڑے ہوئے ہیں کہ کیا حضرت عیسیٰ علیہ السلام اپنے آپ کو وہی کچھ سمجھتے تھے اور وہی کچھ ہونے کا دعویٰ کرتے تھے جو بعد کی نسلوں نے انھیں سمجھا' تو کیا یہی سوالات رام' کرشن اور بدھا کے بارے میں نہیں کھڑے ہو سکتے؟

یہ ایک اہم نکتہ ہے کہ اسلام نظریۂ نبوت کو صرف ان انبیا تک محدود نہیں کرتا جن کا قرآن میں تذکرہ کیا گیا ہے۔ اس اصول کے بیان کے بعد کہ انبیاؑ ہر قوم کی طرف مبعوث کیے گئے' آگے چل کر کہا گیا ہے: ''اے نبی، تم سے پہلے ہم بہت سے رسول بھیج چکے ہیں جن میں سے بعض کے حالات ہم نے تم کو بتائے ہیں اور بعض کے نہیں بتائے''۔ (المومن ۴۰:۷۸)

یہ بات کہ مسلمانوں نے اس اصول کو ان مذہبوں پر خوشی خوشی منطبق کیا جن سے انھیں واسطہ پڑا' جیسے زرتشتی اور ہندو مذاہب' اس کے اہم مذہبی اور معاشرتی مضمرات ہیں' جنھیں آسانی سے نظر انداز نہیں کیا جانا چاہیے۔

یہ نظریہ کہ تمام دوسرے مذاہب' اپنے موجودہ پیروکاروں کے خیال کے مطابق اپنے صحیح اور اصل راستے سے دور ہو چکے ہیں' کسی بین المذہبی رشتے اور اسلام کے مکمل سچّائی کا حامل ہونے کے دعویٰ میں ایک بڑی رکاوٹ دکھائی دے سکتا ہے۔ لیکن پہلی بات تو یہ ہے کہ بعد کی نسلوں کے اسلام کے وژن کے بارے میں خود اسلام بھی یہ بات کہے گا' کہ وہ اصل حقیقی اسلام سے مطابقت نہیں رکھتے۔ اگر اسلام دوسرے عقائد کے پیروکاروں کو ایسی زندگی بسر کرتے دیکھتا ہے جو ان کی بانیوں کی تعلیمات کے خلاف ہیں تو وہ یہی بات غیر مسلموں کی غالب اکثریت کے بارے میں بھی کہے گا۔ دوسرے یہ کہ شاید کوئی عقیدہ مضبوط' مؤثر اور زندہ نہیں رہ سکتا اگر اسے اس خود اعتمادی سے محروم کر دیا جائے کہ صرف وہی مکمل سچائی کا حامل ہے۔

اسلام دوسرے مذاہب کے نظام عقائد سے کلی طور پر متفق نہیں ہے' تب بھی وہ غیر مبہم

طور پر تسلیم کرتا ہے: ''وہ سب اللہ کا نام لیتے ہیں''۔ اس طرح عبادت کے تمام مقامات صاف طور پر اللہ کی عبادت کے مقامات تسلیم کیے گئے ہیں: ''اگر اللہ لوگوں کو ایک دوسرے کے ذریعے دفع نہ کرتا رہے تو خانقاہیں اور گرجا اور معبد اور مسجدیں' جن میں اللہ کا کثرت سے نام لیا جاتا ہے' سب مسمار کر ڈالی جائیں''۔ (الحج ۲۲:۴۰)

کیا اسلامی نظریۂ نبوت' ایک عقیدے اور تصور کی حیثیت سے ہی کتابوں میں محفوظ رہا یا مثبت رویوں اور اعمال سے اس کا اظہار بھی ہوا؟ اس میں سے کچھ رویوں کا قرآن پاک میں تذکرہ کیا گیا ہے' مثلاً یہ کہ ایک مسلمان مسلمان نہیں رہے گا اگر وہ پہلے تمام انبیاؑ پر ایمان نہ لائے --- اسی طرح قرآن پاک کا عقائد کے اختلافات کے باوجود دوسرے مذاہب کے ماننے والوں کے ساتھ خورد و نوش اور شادی بیاہ کی اجازت انسانیت کی بنیاد پر معاشرے کی تخلیق کے لیے انقلابی مضمرات رکھتا ہے۔

تاریخ میں مسلمانوں کا طرزِ عمل اور پالیسیاں کئی لحاظ سے قابلِ اطمینان نہیں کہی جاسکتیں۔ مسلمان انسان ہی تھے اور اسی لیے خام تھے۔ لیکن ان میں جو اچھائی اور خیر کا عنصر دکھائی دیتا ہے اس کی وجہ نبوت کے متعلق وہی خاص اسلامی نظریہ ہے۔ اس میں اچھائی یا خیر کا پہلو زیادہ نمایاں ہے۔ ہر چند کہ ہمارے موجودہ معیارات (عمل کتنا ہوتا ہے؟) کی رو سے اسے مثالی نہ کہا جاسکے' مثلاً عبادت کی آزادی اور مذہبی خود مختاری جو مسلم علاقوں میں بڑے وسیع پیمانے پر موجود تھی۔[۵] لباس پر پابندی' عبادت گاہوں کی جگہوں کی تخصیص' دفاعی خدمات کے بجائے خصوصی ٹیکس یعنی جزیہ' امتیازی درآمدی محاصل جیسی کچھ اِکا دکا مثالیں کم تر حیثیت کے ثبوت کے طور پر پیش کی جاتی ہیں۔ لیکن آج کل کے بعض جدید اور مہذب معاشروں میں

۵- Encyclopaedia of Islam اور اُردو دائرۃ المعارف' باب: 'اہلِ کتاب اور ذمی'۔ ○ ٹی بی ٹیاوی: Arabic and Islamic Themes' [Christians Under Muhammad and His First Two Caliphs]۔ زک اینڈ کمپنی' لندن ۱۹۷۵ء' ص ۵۳-۷۱۔

بھی ایسی مثالیں دیکھنا مشکل نہیں ہے۔

قرآنی احکامات جاننے کے دو تناظر

بعض قرآنی احکامات کی سختی اور اسلام کے ابتدائی دور میں دوسرے مذاہب کے پیروکاروں کے خلاف بعض اقدامات اکثر لوگوں کو پریشان کرتے ہیں، لیکن یہ مقام ان کے تنقیدی جائزے کا نہیں۔ ان کا تفصیلی جائزہ یہ ثابت کرسکتا ہے کہ جو کچھ بہت عرصے تک امر واقعہ سمجھا جاتا رہا ہے، وہ دراصل سچ نہیں تھا[۶] لیکن انھیں سمجھنے کے لیے دو زاویہ ہائے نظر خاصے مددگار ثابت ہوں گے:

○ پہلا یہ کہ یہ سیاسی دائرے سے تعلق رکھتے ہیں۔ محض اس لیے کہ کوئی ایک خاص عقیدے کا پیروکار ہے، اس کے خلاف کوئی اعلانات نہیں کیے گئے، کوئی کارروائیاں نہیں کی گئیں، کوئی اقدام نہیں کیا گیا۔ بے شک مذہبی جبر کو بدترین ظلم اور کبیرہ گناہ (فتنہ) قرار دیا گیا ہے۔ سیاسی بنیاد اس وقت واضح طور پر ظاہر ہوتی ہے، جب کوئی مسلمانوں کو کفار تک سے اس وقت تک صلہ رحمی کرنے کی یہ قرآنی ہدایت دیکھتا ہے جب تک وہ مسلمانوں کے خلاف آمادہ شر و فساد نہ ہو جائیں:

بعید نہیں کہ اللہ تمھارے اور ان لوگوں کے درمیان محبت ڈال دے جن سے آج تم نے دشمنی مول لی ہے۔ اللہ بڑی قدرت رکھتا ہے۔ وہ غفور و رحیم ہے۔ اللہ تمھیں اس بات سے نہیں روکتا کہ تم ان لوگوں کے ساتھ نیکی اور انصاف کا برتاؤ کرو جنھوں نے دین کے معاملے میں تم سے جنگ نہیں کی ہے اور تمھیں تمھارے گھروں سے نہیں نکالا ...... اللہ انصاف کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔ وہ تمھیں

۶- برکت احمد: Muhammad and Jews: A Re-examination وائی کاس، نیو دہلی، ۱۹۷۹ء۔

جس بات سے روکتا ہے وہ تو یہ ہے کہ تم ان لوگوں سے دوستی کرو جنھوں نے تم سے دین کے معاملے میں جنگ کی ہے اور تمھیں تمھارے گھروں سے نکالا ہے' اور تمھارے اخراج میں ایک دوسرے کی مدد کی ہے۔ ان سے جو لوگ دوستی کریں وہی ظالم ہیں۔(الممتحنہ ۶۰:۷-۹)

مزید یہ کہ' ہر پیغمبر' اپنے معاشرے کی اخلاقی' تہذیبی اور روحانی بے اعتدالیوں کا ایک پُرعزم ناقد (critic) تھا' اور ہم عصر یہود و نصاریٰ بھی اسی معاشرتی ماحول کا حصّہ تھے۔ اس لحاظ سے قرآنی احکامات سابقہ پیغمبروں کی تعلیمات کی نسبت زیادہ نرم ہیں۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے جو کہا وہ یہ ہے:

- اے ریاکار فقیہو اور فریسیو' تم پر افسوس کہ تم سفیدی پھری ہوئی قبروں کی مانند ہو جو بظاہر بہت خوش نما دکھائی دیتی ہیں' لیکن ان کے اندر مُردوں کی ہڈیاں ہر طرح کی نجاست سے بھری ہیں۔ اور کہتے ہو کہ اگر ہم اپنے باپ دادا کے زمانے میں ہوتے تو نبیوں کے قتل میں ان کے شریک نہ ہوتے۔ اس طرح تم عملاً اعتراف کرتے ہو کہ تم ان کی اولاد ہو جنھوں نے انبیاؑ کو قتل کیا۔ اے سانپو! اے سانپوں کے بچو! تم کیونکر توقع رکھتے ہو کہ تم دوزخ کی آگ سے بچ سکو گے۔ (متی ۲۳:۲۷-۳۴)
- دیکھو' میں نبیوں اور داناؤں اور فقیہوں کو تمھارے پاس بھیجتا ہوں' ان میں سے تم بعض کو قتل اور مصلوب کرو گے اور بعض کو اپنے عبادت خانوں میں کوڑے مارو گے اور شہر شہر ستاتے پھرو گے۔ (متی ۲۳:۳۴)
- اے یروشلم' اے یروشلم! تو جو نبیوں کو قتل کرتا ہے! اور اللہ کے بھیجے ہوئے رسولوں کو سنگسار کر دیتا ہے۔ (متی ۲۳:۳۷)

یہاں عہد نامہ عتیق سے بھی چند سطریں دی جاتی ہیں:

- مجھے ان خوشبوؤں سے جو تم جلاتے ہو سخت گھن اور کراہت محسوس ہوتی ہے۔ ان میں تمھارے گناہوں کی بد بو رچی ہوتی ہے۔
- تمھارے ہاتھ خون سے لتھڑے ہوئے ہیں۔ وہ شہر جو کبھی وفا کیش ہوا کرتا تھا' اب کسی بیسوا کا رنگ ڈھنگ اختیار کر گیا ہے۔ تمھارے راہنما باغی اور چوروں کے دوست ہیں۔ وہ ہر دم تحفے اور رشوتیں وصول کرتے رہتے ہیں۔ (یسیلیا ۱: ۱۳-۲۳)

یہاں قرآن پاک کی چند آیات بھی درج کی جا رہی ہیں:

- جب کبھی کوئی رسول تمھاری خواہشاتِ نفس کے خلاف کوئی چیز لے کر تمھارے پاس آیا تو تم نے اس کے مقابلے میں سرکشی ہی اختیار کی۔ کسی کو جھٹلایا اور کسی کو قتل کر ڈالا۔ (البقرہ ۲: ۸۷)
- آخر کار ان کی عہد شکنی کی وجہ سے اور اس وجہ سے کہ انھوں نے اللہ کی آیات کو جھٹلایا اور متعدد پیغمبروں کو ناحق قتل کیا...... ان کے اس ظالمانہ رویے کی بنا پر...... اور اس بنا پر کہ یہ بکثرت اللہ کے راستے سے روکتے ہیں اور سود لیتے ہیں جس سے انھیں منع کیا گیا تھا اور لوگوں کے مال ناجائز طریقوں سے کھاتے ہیں (النساء ۴: ۱۵۵-۱۶۱)

نظریۂ نجات

شاید کسی بھی مذہب کے اہم مسائل میں سے ایک مرکزی اور پیچیدہ نکتہ' نجات (salvation) کا مسئلہ ہے۔ اس حوالے سے مسلم عقائد' تصورات اور رویوں کی تشکیل میں اسلامی نظریۂ نبوت کے کردار کو جانچنا دل چسپی سے خالی نہ ہوگا۔

اس لحاظ سے میرا خیال ہے کہ نجات کے اسلامی نظریے کا تعین بیش تر اس کے نظریۂ

نبوت سے وابستہ ہوتا ہے:

پہلے یہ کہ اسلام بہت واضح طور پر ایک معروف مذہب سے منسلک ہونے' اور سچا ایمان رکھنے اور عملِ صالح کے درمیان امتیاز کرتا ہے۔ یا جسے ہم دوسری قرآنی اصطلاح میں سچّائی (الحق یا الدّین یا آیات اللّٰہ جو مطالب میں ایک ہیں) تلاش کرنے' پانے' قبول کرنے' تصدیق کرنے اور اس کے مطابق زندگی گزارنے سے تعبیر کر سکتے ہیں۔ جہاں تک مسلمانوں کا تعلّق ہے' قرآن نے ان کے لیے نزول کے وقت بھی (الذین اٰمنوا) کے الفاظ استعمال کیے۔ اس کے دو مفہوم تھے۔ ایک وہ جو اُمت مسلمہ سے تعلّق رکھتے ہیں اور دوسرے وہ جو واقعی ایمان رکھتے ہیں' (البقرہ ۶۲:۲' النساء ۱۳۶:۴' المائدہ ۶۹:۵)۔ چنانچہ نجات کا انحصار محض اُمت مسلمہ سے تعلّق رکھنے پر نہیں۔

دوسرے یہ کہ' نجات کا راستہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شخصیت کے وسیلے یا تعلّق پر منحصر نہیں۔ وہ بہت سے انبیاؑ میں سے ایک تھے' اگر چہ کہ آخری پیغمبر تھے۔ اس نہایت بنیادی مسئلے کے کچھ ایسے اہم مضمرات ہیں جن کو ہم نظر انداز نہیں کر سکتے۔

کیا ضروری ہے کہ نجات کے لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو سچّا نبی تسلیم کیا جائے؟ میرا خیال ہے کہ اس سوال کے تمام پہلو اور اس پر مسلمانوں کے موقف کو سمجھنے کے لیے تحقیق ہونا ابھی باقی ہے۔ البتہ یہ صاف دکھائی دیتا ہے کہ وہ لوگ جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ کا سچّا نبی ہونا پہچان چکے ہیں (یعرفون) انھیں اپنی نجات کے لیے انھیں سچّا نبی تسلیم کرنا چاہیے۔ دوسرا لفظ جو اس سلسلے میں استعمال ہوتا ہے وہ سَمِعُوْا ہے' یعنی وہ جو انؐ کی باتیں سنتے ہیں۔ لیکن لفظ سَمَعَ (سننا) قرآن پاک میں سننے کے طبعی فعل کے لیے استعمال نہیں ہوتا۔ یقیناً اس کی وضاحت کرنے کی ضرورت ہے اور شاید قرآن سماعت میں قبولیت پر آمادگی کے لیے علم بھی شامل کرتا ہے۔

بہر کیف یہ دونوں الفاظ ان لاکھوں کروڑوں لوگوں پر نہیں منطبق ہوتے' جنھوں نے

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا نام کبھی نہیں سنا۔ شاید اسی لیے امام غزالی (م: ۱۱۱۱ء) نے کہا کہ اللہ تعالیٰ کی رحمت و کرم بہت سے عیسائیوں اور ترکوں کے لیے بھی ہے۔ جن لوگوں تک آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا نام بھی نہیں پہنچا' ان کے پاس ایک جائز عذر (excuse) ہے۔[۷] میرے خیال میں انھی باتوں کا اطلاق اسلام اور قرآن کے آخری وحی خداوندی ہونے پر کیا جاسکتا ہے۔

تیسری بڑی اہم بات یہ ہے کہ اسلام کے پیش نظر تمام نوع انسانی کو خدائے واحد کی حاکمیت کے تحت لانا ہے۔ لیکن اسلام اسے اپنی ذمہ داری نہیں سمجھتا کہ کسی خاص فرد یا جماعت کو اپنے خدائے واحد کے تصور اور طریقۂ عبادت کی طرف لازماً اور جبری طور پر لے آئے۔ اس کا کوئی ایسا الوہی منصوبہ نہیں ہے کہ تمام نوع انسانی کو لازماً اسلام کی طرف پھیر لائے یا اس مقصد کے لیے مذہبی اقلیتوں کو اپنے علاقے سے نکال دے' یا ان کا نام و نشان مٹا دے۔ شاید یروشلم میں صلیبیوں اور مسلمانوں کے داخلے کے وقت ان دونوں کے رویوں اور اقلیتوں کے مسائل کے لیے مسلمانوں کے پیش کردہ حل اور دوسروں کے حل کے درمیان میں فرق کی وجہ یہی ہے۔

چوتھی اور اہم بات میری نظر میں یہ ہے کہ اسلامی رویوں میں ان انسانی فیصلوں کا کہ کون سا شخص جنت میں جائے گا اور کون ہمیشہ کے لیے جہنم میں' کوئی مقام نہیں ہے۔ درحقیقت سختی سے منع کیا گیا ہے کہ انسان اپنی جگہ از خود اللہ تعالیٰ کے فیصلوں کے بارے میں پہلے ہی کوئی رائے قائم کرے۔ روزِ قیامت اللہ تعالیٰ تمام مذہبی تنازعات کا فیصلہ کرے گا۔ ایک مسلمان خود اپنے بارے میں بھی یقین سے نہیں کہہ سکتا کہ آیا اسے نجات حاصل ہوگی یا نہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک موقع پر فرمایا: ''میں بھی محض اپنے عمل کے

۷- ابوحامد غزالی' فیصل التفرقه بين الاسلام والزندقه (مرتب) ناشر: سلیمان دنیا' قاہرہ' ۱۹۶۱ء' ص ۲۰۶

بل بوتے پر جنت میں نہ پہنچ پاؤں گا''۔[۸]

ایک دوسری نمایاں روایت میں آپؐ نے ایک ایسے گناہ گار شخص کا قصہ سنایا تھا جس نے اپنی زندگی کے آخری لمحات میں اپنے جسم کو جلا دینے اور اپنی راکھ کو بکھیر دینے کی وصیت کی تھی۔ اللہ تعالیٰ نے اس کی راکھ اکٹھی کی' اسے دوبارہ زندہ کیا اور اس سے پوچھا: ''تو نے ایسا کیوں کیا؟'' اس نے جواب دیا: ''صرف تیرے خوف کی وجہ سے''۔ اور وہ بخش دیا گیا۔

اس سلسلے میں حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کا یادگار قول خصوصی اہمیت کا حامل ہے:
''اگر روز قیامت میں یہ اعلان سنوں کہ سوائے ایک کے سب لوگ جنت میں جائیں گے تو مجھے یہ خوف ہوگا کہ یہ وہ شخص میں ہی نہ ہوں' اور اگر یہ اعلان سنوں کہ سوائے ایک کے سب لوگ دوزخ میں جائیں گے تو میں یہ امید کروں گا کہ وہ ایک شخص میں ہی ہوں گا''۔ مسلم رویے کی اس سے بہتر اور دل کش نمایندگی نہیں کی جاسکتی۔

ایسی صورت میں' جب کہ ہر مذہب اپنے عقائد کی صحت پر یقین رکھتا ہے' اور سچائی کے دعوے پر قائم ہے (آخر کون' پروفیسر ٹائن بی کے سنہ ۴۰۴۷ء کا انتظار کرسکتا ہے) تو کیا اپنے مذہب کے اصولوں کی حقانیت پر قائم رہتے ہوئے' کیا اسلام میں نبوت کا تصور مختلف مذاہب کے لوگوں کے ساتھ مل جل کر پر امن زندگی گزارنے کے لیے کسی ایک اہم راستے کی نشاندہی کرتا ہے؟ مجھے امید ہے کہ بین المذاہبی اجتماعات میں اس سوال کی طرف زیادہ توجہ دی جائے گی۔

۸- حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تم میں سے کسی کو بھی اس کا عمل نجات نہیں دلا سکے گا''۔ صحابہؓ نے عرض کیا: ''یارسولؐ اللہ! کیا آپ کے ساتھ بھی یہی معاملہ ہوگا؟'' فرمایا: ''ہاں، میں بھی محض اپنے عمل کے بل بوتے پر جنت میں نہ پہنچ پاؤں گا' جب تک کہ اللہ تعالیٰ مجھے اپنی مغفرت اور رحمت سے ڈھانپ نہ لے''۔ (الجامع الصحیح، دوم، کتاب الرقاق، باب القصد)

نبی کریمؐ کی حیثیت کا تعین

ایک اور اہم اور متعلق سوال جسے ہماری گفتگو کے دائرے سے طویل عرصے کے لیے باہر نہ ہونا چاہیے' یہ ہے کہ کیا آنحضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم بھی اللہ کے سچے نبی تھے۔ وہ ان میں سے ایک تھے جن سے اللہ ہم کلام ہوا' اور جو انسانیت کے سامنے درست طور پر دعویٰ کر سکتے ہیں کہ اللہ نے یہ کہا۔ اس سوال کو مناسب الفاظ میں اس طرح پیش کیا جا سکتا ہے: ''کیا قرآن اللہ کا کلام ہے؟'' یہ کہنا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر واقعی اللہ کی وحی آتی تھی' مسلم نقطۂ نظر کا بیان ہے۔ کسی بین المذہبی نشست میں آسانی سے قرار دیا جا سکتا ہے کہ یہ پہلے ہی سے معلوم شدہ اور مسترد شدہ بات کا دعویٰ کرنے یا دہرانے سے زیادہ کی کوشش نہیں ہے' یا یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ کسی کے اپنے عقیدے کی سچائی کی گواہی دینا اور تبلیغ کرنا ہے جس کا نتیجہ یا مذہب کی تبدیلی ہوگی یا اختلافات کی شدت میں اضافہ' بعض دفعہ اول الذکر' اور اکثر ثانی الذکر[9] شاید ثانی الذکر) یا شاید اس کا مطلب یہ ہو سکتا ہے کہ ایسے مسئلے کو سامنے لایا جائے جس کو جان ہک (John Hick) مذہبی ہم آہنگی کے راستے میں سب سے بڑی مشکل قرار دیتا ہے۔[10] غالباً یہ کوئی بہت مفید اور مطلوب راستہ نہیں ہے۔

مسلمانوں کے ساتھ ایک عشرے سے زائد کے مکالمے میں اس مسئلے (issue) کی گہرائی میں اترنے کے بجائے اس سے پہلو کیوں بچایا جاتا رہا ہے؟ عموماً بحث اس مثبت مسئلے کے اندر اترنے کے بجائے اس کے قریب ہی سے گزر جاتی رہی۔ اسی طرح' مکالمے کے لیے تیار کیے جانے والے تمام بیانات' قراردادوں اور رہنما خطوط میں اس ایشو کا جگہ نہ پانا قابلِ توجہ ہے۔ ویٹی کن II کا ناسترا ایٹیٹ (Nostra Aetate) میں محمدؐ کا حتیٰ کہ اسلام تک کا

۹- جان ہک: *God Has Many Names*۔ میک ملن پریس' لندن ۱۹۸۰ء' ص ۸۵

۱۰- جان ہک: *Truth and Dialogue*۔ شیلڈن پریس' لندن' ۱۹۷۵ء' ص ۱۵۴

تذکرہ نہیں ملتا۔ یا تو مذہبی مضمرات اس موضوع پر بحث میں مانع ہیں' یا اس راستے کو مختلف مذاہب کے افراد کے مابین دوستی کے لیے خطرات سے بھرپور سمجھا گیا' یا اس کے متوقع نتائج کی قدر و قیمت اتنی مشکوک تھی کہ اس کے لیے کوشش تک نہ کی گئی۔

اگر ہم مذہبی افراد کی حیثیت سے بین المذہبی تعلقات کے لیے ایک ایسا فریم ورک تشکیل دینے کے لیے اپنے درمیان اتفاق و اختلاف کے دائروں کو تلاش کریں' جو ہمیں ''ایک عالم گیر دنیا'' میں رہنے کے قابل بنا دیں' تو ایسی صورت میں کیا ہمیں اس مسئلے سے زیادہ عرصے تک صرفِ نظر کرنا چاہیے؟ اور کیا ہم ایسا کر سکتے ہیں؟ یہ مستقبل کے کسی مذہبی مباحثے کے لیے جس میں مسلمان بھی شامل ہوں' ایک اہم سوال ہے۔ اگر شر کا خوف اور بے اعتمادی سے چھٹکارا حاصل نہیں کر سکتے اور سنجیدگی سے غور و فکر نہیں کر سکتے اور کم سے کم یہ کوشش نہیں کرتے کہ ان اختلافات کو دُور کریں یا ان کے ساتھ زندہ رہنے کی کوشش کریں' جنھوں نے ان کو پُرتشدد طور پر جدا کر رکھا ہے تو وہ بھلا ''ایک عالم گیر دنیا''......ایک مشترکہ انسانیت کے مشترکہ محبوب کی طرف پیش قدمی کی امید کیونکر کر سکتے ہیں؟ اگر مکالمہ اپنی بقا کے لیے ہے تو ان بنیادی مسائل پر مشترکہ گفتگو کے علاوہ کوئی راستہ نہیں جو بظاہر ناقابلِ عبور دکھائی دیتے ہیں۔

مکالمے کی بنیاد

اس کا مطلب یہ نہیں کہ ہم یہ امید کر لیں کہ کل صبح یا مستقبل قریب کی کسی صبح' اس مسئلے کا کوئی حل مل جائے گا۔ بے شک ہماری زندگی میں کوئی حل نہ ملے' لیکن کیا ہمیں کبھی نہ کبھی ان مسائل پر کھلی بحث کی کوشش کا آغاز نہیں کرنا چاہیے جو ہمارے باہمی جھگڑے کی اصل جڑ ہیں۔ اگر ایسا ہونا ہے' تو آج ہی کیوں نہ ہو جائے؟ جیسا کہ پہلے کہا گیا ہے کہ اس طرح شاید یہ مسئلہ حل نہ ہو لیکن یہ کم از کم زیادہ سننے' زیادہ جاننے' زیادہ سمجھنے' زیادہ اعتماد و بھروسا' زیادہ دوستی اور شاید زیادہ قرب کی جانب رہنمائی کرے گا۔

اس کا مطلب یہ نہیں کہ دُوری کی خلیج کو کم اہمیت دی جا رہی ہے۔ کوئی بھی چیز اسلام کو دوسرے مذاہب بالخصوص یہودیت و عیسائیت سے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اور قرآن کے بارے میں اس کے دعویٰ سے زیادہ جدا نہیں کرتی۔ ایک طرف اس کے مضمرات دینی ہیں۔ سادہ طور پر بیان کیے جائیں' تو بے لچک دکھائی دیتے ہیں۔ کوئی عیسائی جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو وہ کچھ سمجھے جو مسلمان سمجھتے ہیں تو وہ عیسائی نہ رہے گا۔ یہی بات یہودیوں کے بارے میں بھی کہی جا سکتی ہے' اور اگر کوئی مسلمان آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو وہ سمجھنا چھوڑ دے جو وہ سمجھتا ہے تو وہ مسلمان نہیں رہتا۔

محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات سے قطع نظر' اسلام میں یہودیت اور عیسائیت سے اتنی بہت سی باتیں کم سے کم ظاہری طور پر مشترک ہیں' کہ اسے بلاہچکچاہٹ یہودیت سے ماخوذ یا عیسائیت میں جڑیں رکھنے والا مذہب کہہ سکتے ہیں۔ بلاشبہ بعض مغربی تحریروں میں یہودیت اور عیسائیت اس بارے میں مقابلہ کرتی نظر آتی ہیں کہ ان میں کون ولدیت میں زیادہ حصّہ رکھتا ہے۔ اگر محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے دعویٰ نبوت کا کانٹوں بھرا مسئلہ نہ ہو تو ان میں سے کوئی بھی اس بچے کو گود لے سکتا ہے۔ دوسری طرف یہ مضمرات معاشرے کے لیے اور ایک لادین شخص کے لیے جو صرف انسانی صورت حال ہی سے دل چسپی رکھتا ہے' کچھ کم اہمیت نہیں رکھتے۔ اس لیے کہ جدید دور میں بھی مسلمان اپنی زندگیاں قرآن اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات کے مطابق ڈھالنے کے متمنی ہیں' جن کی دائمی صداقت پر وہ ایمان رکھتے ہیں او کے لیے جدوجہد میں مصروف ہیں۔ مزید برآں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو مغرب میں اسلام کے تصور کی تشکیل میں انتہائی نمایاں[11]' انتہائی مرکزی اور انتہائی اہم مقام ہمیشہ حاصل رہا ہے اور آج بھی ہے۔ مسئلہ کتنا ہی گمبھیر کیوں نہ ہو' قریب آنے میں مشکلات بلکہ ناممکنات کی نوعیت

۱۱- نارمین ڈینیل Islam and The Wes : Making of an Image۔ ایڈن برگ یونی ورسٹی پریس' ایڈن برگ' ۱۹۸۰ء۔ نظرثانی شدہ ایڈیشن' آن ورلڈ پبلی کیشنز' اوکسفرڈ نے ۱۹۹۳ء میں شائع کیا۔

اور وسعت کیسی ہی ہو، ہم اس کام کو چاہے نتیجہ خیز نہ پائیں، روحانی، دینی اور عملی طور پر مفید اور تحرک خیز پائیں ضرور گے۔

مذہبی لحاظ سے ایک مسلمان کی حیثیت صاف اور واضح، حتمی اور غیر تغیر پذیر ہے۔ میں اس حقیقت کو محض بیان کرنا نہیں چاہتا بلکہ ایک قدم آگے جانا پسند کروں گا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کے مسئلے پر مختلف نقطہ ہائے نظر تلاش کرنے اور متعین کرنے میں جو سوال اٹھیں، میں ان کو متعین کرنے کی کوشش کروں گا خواہ میرے پاس کوئی قابلِ قبول جواب نہ بھی ہوں۔ مجھے امید ہے کہ مسلمان اور دوسرے مذاہب کے پیروکار جو ایک دوسرے سے کھلے دل سے ملنے کے لیے تیار ہیں، ان مسائل کا سامنا کریں گے اور اپنے محدود دائرے کے اندر لکھنے اور بولنے کے بجائے مختلف نظریات اور سوالات پر آمنے سامنے گفتگو کریں گے اور ایک دوسرے کے نقطۂ نظر کو سنیں گے۔

اس کے لیے ذرائع اور حدود کار صرف وہ ہونے چاہییں جن پر ہم متفق ہیں۔ ان میں مغربی علمی روایت کے پروردہ زمرے، معیار اور ذرائع لازماً شامل یا باہر نہ ہونے چاہییں۔ بعض اوقات میں دیکھتا ہوں کہ قرآن پر ہی نہیں، بائیبل کے لوازمے پر بھی بعض مغربی طریقوں کا اطلاق خصوصاً 'انسان اور خدا' اور 'خدا اور تاریخ' کے باہمی تعلق کے بارے میں پہلے سے طے شدہ تصورات پر مبنی قیاس آرائی سے زیادہ نہیں۔

اگر مقابلے کا ایک مقصد باہمی معروضی علم ہے تو کیا ڈینیل کا یہ کہنا درست ہے کہ: ''عیسائیوں کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو ویسا ہی دیکھیں جیسا مسلمان انھیں دیکھتے ہیں۔ اگر وہ ایسا نہ کریں تو انھیں اپنے آپ کو اسلام کا فہم حاصل کرنے کے دائرے سے باہر کر لینا چاہیے''۔[12] یہ الفاظ بہت سخت ہیں اور یقیناً بہت زیادہ قابلِ بحث بھی۔

۱۲- نارمین ڈینیل، ایضاً، ص ۳۰۵۔

اسلام، محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے کچھ زیادہ بھی ہے۔ یہ کیوں ممکن نہیں ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو مسلمانوں کی طرح دیکھے بغیر بھی اسلام کو سمجھا جا سکے۔ کیا یہ رویہ ہم کو زمانوں کے درمیان، تہذیبوں کے درمیان اور انسانوں کے درمیان تفہیم کو تقریباً ناممکن بنانے تک نہیں لے جاتا۔ ان تمام سوالوں کی اہمیّت کا جواز ہے، لیکن نارمن ڈینیل کی یہ بات اس کے ان مطالعات کا نتیجہ ہے کہ اسلام کو کس طرح محمدؐ کی وجہ سے مسلسل غلط سمجھا جاتا رہا ہے۔ کم سے کم، محمدؐ اور محمدؐ کا مسلم نقطۂ نظر باہمی تفہیم کے راستے پر اہم قدم سمجھے جانے چاہییں۔

''محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو اس طرح دیکھنا جیسا مسلمان ان کو دیکھتے ہیں، اس کا کیا مطلب ہے؟ کیا اس کا مطلب یہ نہیں ہوگا جو ہم ابھی تک کہتے رہے ہیں: کوئی عیسائی عیسائی نہیں رہتا، اور ایک یہودی یہودی نہیں رہتا، اگر وہ محمدؐ کو وہ سمجھے جو مسلمان سمجھتے ہیں''۔ ڈینیل کا خیال ہے کہ بغیر سوچے یا زور دیے کہ محمدؐ ایسے تھے، کرنا ممکن ہے۔ یہ یقیناً ایک بڑا مسئلہ ہے۔ ڈینیل کا ٹھیک ٹھیک مطلب کیا ہے؟ جو کچھ وہ کہہ رہا ہے، کیا وہ ممکن ہے؟ کیا اس مسئلے کو سمجھنے کے کوئی دوسرے طریقے بھی ہیں۔

ایک مختصر سا جائزہ غیر مفید نہ ہوگا، اگر یہاں اختصار کے ساتھ ان اہم نقطہ ہائے نظر کا مطالعہ پیش کریں، جو اس مسئلے کو سمجھنے کے لیے موجودہ مغربی علمی روایت نے پیش کیے ہیں۔ یہاں پر اس کی کوئی تو ضرورت نہیں محسوس ہوتی کہ ان قدیم تصورات کا جائزہ لیا جائے جن میں محمدؐ جو کچھ لائے اس کو مرگی کے دوروں (epileptic)، آسیب، راہب بحیریٰ کے فرضی قصے اور عیسائی رہبر سرگیس (Sergius) سے واضح کیا جاتا ہے۔ انھیں اب جہالت اور خیالی دنیا کے دور کی چیزیں قرار دے کر مسترد قرار دیا جاتا ہے۔ حالانکہ سمجھنے کی بات یہ ہے کہ خود اپنے زمانے میں یہ باتیں اور دعوے کچھ کم سائنسی اور غیر حقیقی اور اسی لیے تسلیم کیے جانے کے قابل نظر نہ آتے ہوں گے۔

ولفرڈ کینٹ ول سمتھ اس سوال کے مثبت اور منفی' دونوں نوعیت کے جوابات کا جائزہ لیتا ہے اور خاصی شدت سے دونوں کے درمیان پائی جانے والی خلیج کی وسعت اور گہرائی کو سامنے لاتا ہے۔ اس کے مطابق تاریخ میں دونوں جوابات کارفرما رہے ہیں۔ لیکن دونوں کے درمیان شدید اور جذباتی قطبیت (polarity) نہایت واضح ہے۔ اس کے نزدیک اس مسئلے کا حل یہ ہے کہ ایک نظری جواب تیار کیا جائے' جو دونوں گروہوں کے لیے منطقی' معقول اور قابلِ قبول ہو۔[13] لیکن اگر تاریخی حقیقت کو دیکھا جائے تو ایسا کوئی بیان دونوں کے لیے مساوی طور پر نا قابلِ قبول ہوگا۔

ایچ اے آر گب [Gibb: ۱۸۹۵ء-۱۹۷۱ء] نے ایک متعین موقف اختیار کیا ہے:

''جہاں تک خود میرا تعلق ہے' میں کسی ہچکچاہٹ کے بغیر محمدؐ کے ذاتی تجربے کو بیان کرنے کے لیے وحی یا تنزیل کا لفظ اختیار کرتا ہوں۔ اگرچہ اسلام' دوسرے موحدانہ مذاہب کی طرح' وحی کے اب تک تسلیم نہ کیے جانے والے قدیم تصور کی تعبیرنو کی ضرورت سے دوچار ہے۔''[14] اس بات کا درحقیقت کیا مطلب ہے؟

کیا یہ واقعی ایک بالکل مختلف نقطۂ نظر ہے۔ اگر ایک دفعہ ہمیں یہ معلوم ہو جائے کہ تعبیرنو کے مفہوم سے کیا مراد ہے' تو یہ اپروچ مختلف نہیں۔ اگر مسئلے کی نوعیت ہی بدل جائے تو اتفاق رائے کی ضرورت کا احساس کسی ایسے سنگین مسئلے کو حل کے قریب لا سکتا ہے۔

منٹگمری واٹ کا بھی یہی استدلال ہے: ''میں یہ سمجھتا ہوں کہ قرآن کسی نہ کسی مفہوم میں الوہی سرچشمے کا نتیجہ ہے' اس لیے یہ وحی ہے۔''[15]

۱۳- ولفرڈ کینٹ ول سمتھ: On Understanding Islam' ص ۲۸۲-۳۰۰۔

۱۴- ہملٹن اے آر گب: *Pre-Islamic Monotheism in Arabia* شائع کردہ Harvard Theological Reivew' شمارہ ۵۵ (۱۹۶۲ء)' ص ۲۶۹۔

۱۵- منٹگمری واٹ [پ ۱۹۰۹ء]: *Islamic Revelation in the Modern World* ایڈن برگ یونی ورسٹی پریس' ایڈن برگ' ۱۹۷۰ء' ص ۸

ایک اور جگہ وہ شاید زیادہ وضاحت سے بیان کرتا ہے: ''محمدؐ کے قرآن کو قبول کرنے کو شیکسپیئر [م: ۱۶۱۶ء] کی ذہانت سے' جس سے اس نے ہیملٹ (Hamlet) لکھا' تشبیہ دینے میں ایک فرق محسوس ہوتا ہے۔ ہیملٹ ایسے نظریات کا مجموعہ نہیں ہے جو کروڑوں انسانوں کے ورلڈ ویو (تصور جہاں) کے لیے بنیادی نظریات ہونے کی صلاحیت رکھتا ہو۔[۱۶] پھر وہ کہتا ہے: ''ہم اسلام کے اس نظریے کو مکمل طور پر تسلیم نہیں کر سکتے کہ قرآن پورے کا پورا سچا ہے۔[۱۷]

جان ہک (Hick) مسئلے کی سنگینی سے پوری طرح آگاہ دکھائی دیتا ہے۔ وہ اس نتیجے پر پہنچتا ہے کہ: اسلام کے اندر اس کا حتمی حل' قرآنی بنیاد پرستوں اور آزاد خیال لوگوں کے دو متوازی دھاروں کے درمیان ہوگا۔ لیکن یہ شاید عیسائیت کے مقابلے میں زیادہ گہری اور تلخ ہو۔ اس لیے کہ مسلمانوں کے لیے ساتویں صدی کے عرب میں لکھے گئے قرآن کی الوہی سند کو کائنات کی جدید سائنسی تصویر سے ہم آہنگ کرنا آسان نہیں ہوگا۔[۱۸] اس بات کی تردید نہیں کی جاسکتی' البتہ کچھ بنیادی تصورات کے گہرے مطالعے کی ضرورت ہے۔ کیا کائنات کی کوئی ایسی مربوط اور مکمل تصویر موجود ہے جو حقیقی طور پر سائنسی ہو۔ قرآن اور سائنس کے درمیان شدید اختلافات کیا ہیں؟ کیا کسی متوقع علیحدگی کے لیے کوئی تاریخی شہادت ہے؟ فی الحال تو یہی محسوس ہوتا ہے کہ ہوا دوسری سمت میں چل رہی ہے۔ کیا ہر سائنسی دعویٰ اسی طرح آخری سچائی قرار دیا جاسکتا ہے جیسا کہ قرآن پر مسلمانوں کا یقین ہے۔ اگر نہیں' تو ہم دونوں کو کسی ایک قدر مشترک پر کیسے لا سکتے ہیں۔

یہ سوال کہ تاریخی نقطۂ نظر سے قرآن کے تنقیدی مطالعے کا اسلام پر کیا ردعمل ہوگا۔[۱۹]

۱۶- منٹگمری واٹ: What is Islam? ' لانگ مین لندن' نیویارک' ۱۹۷۹ء' ص ۲۰

۱۷- منٹگمری واٹ: ایضاً' ص ۲۱

۱۸- جان ہک: God Has Many Names ' حوالہ بالا' ص ۹۳

۱۹- جان ہک: ایضاً' ص ۹۳

مسلمانوں کے غور وفکر کے لیے لازماً اہمیّت رکھتا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ: قرآن کی ان تعلیمات کی روشنی میں کہ سنجیدگی سے غور وفکر کرو' حق کی تلاش میں' اور معاشرے سے' ماحول سے اور آباؤ اجداد سے' مذہبی رہنماؤں سے جو کچھ بھی ورثے میں ملا ہو' اس سے بے نیاز ہوکر اسے قبول کرو۔ علم کے بغیر کوئی بات قبول نہ کرو۔ لیکن پہلی بات یہ ہے کہ مسلمان کسی ایسے مفروضے سے آغاز کرنا مشکل سمجھیں گے' جو قطعی طور پر قرآن کے خلاف ہو۔ دوسرا یہ کہ ایسی تنقید مکالمے کا حصّہ ہونا چاہیے' اور پہلے سے طے شدہ خاکوں کے مطابق نہیں ہونا چاہیے۔ مثال کے طور پر اگر ہم مکالمے کا آغاز ولفرڈ کینٹ ول اسمتھ کے ان دعووں سے کریں کہ قرآن پر مغربی علمی پیش رفت نے ایک ایسی تاریخی تصویر پیش کی ہے' ایسے ارتقا دریافت کیے ہیں' ایسی تعبیریں پختہ کردی ہیں' جو ناقابلِ تردید ہیں تو مثبت ردعمل مشکل ہوگا۔[20]

نبوت کے تصور کا جائزہ

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کے مسئلے کا جائزہ لینے کے کئی طریقے ہوسکتے ہیں:

○ اولاً: نبوت کا تصور ہی سائنسی طریقے کے خلاف ہے۔ جس کے مطابق کوئی خدا نہیں ہے اور اگر ہے تو اسے انسانی تاریخ میں مداخلت کی کوئی ضرورت یا حق نہیں۔ مغرب کا ایک عام فردِ انسانی زندگی کے ہر پہلو کو حسی مشاہدات و معلومات' تاریخ' عمرانی' اقتصادی' ثقافتی پس منظر اور ماحول کی بنیاد پر وضاحت کرنا چاہے گا۔ ایسے اندازِ نظر سے ایسے مسائل پیدا ہوتے ہیں جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کے مسئلے سے زیادہ وسیع اور گہرے ہیں۔

○ ثانیاً: اللہ' انسان سے ہم کلام ہوتا ہے' لیکن اللہ کی انسان سے ہم کلامی کا کیا مطلب ہوسکتا ہے؟ یہ ہم بہت کم جانتے ہیں۔ اس زاویے کی جو تعبیر اسلام پیش کرتا ہے' اور جیسا کہ یہودیت اور عیسائیت میں بھی سمجھا جاتا ہے (جسے ایچ اے آر گب' ازمنہ وسطیٰ کی

۲۰- ولفرڈ کینٹ ول سمتھ: On Understanding Islam' حوالہ بالا' ص ۲۹۳

ترجمانی کہتا ہے) جدید سائنسی تصورِ جہاں کی روشنی میں قابلِ مدافعت نہیں ہے۔ اس کا یقیناً یہ مطلب نہیں کہ انسان جو وصول کرتا ہے وہ واقعتا اللہ ہی کے الفاظ ہیں۔ وہ کسی صورت میں ابدی نہیں ہیں۔ جو بھی تجربہ یا جذبہ ہو' وصول کنندہ کی اپنی شخصیت' معاشرتی حیثیت اور اس کے نظریۂ کائنات کے سانچے میں ڈھلتا ہے۔ مثال کے طور پر عہد نامہ عتیق کے پیغمبر مسلمانوں کے عقیدہ وحی کے مطابق اللہ کا کلام وصول نہیں کرتے تھے۔ یہ طرزِ فکر اگرچہ عام نہیں' آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ایک پیغمبر تسلیم کر سکتی ہے' لیکن پیغمبر کے اپنے تصور کے مطابق' نہ کہ اس طرح جس طرح مسلمان سمجھتے ہیں۔

○ ثالثاً: یہ کہنا کہ ''ہر چند کہ اللہ انسان سے ہم کلام ہوتا ہے' اور تاریخ میں بھی اپنی ذات کی حد تک بھی مداخلت کرتا ہے' لیکن محمد صلی اللہ علیہ وسلم ایک پیغمبر نہیں تھے''۔ یہاں سے یہ طرز فکر دو راستوں میں بٹ جاتا ہے۔ ''اول: آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جسے اللہ کا کلام سمجھا وہ ان کی اپنی اندرونی آواز تھی' جو ان کے اپنے معاشرے کے تجربات' اپنے معاشرتی ماحول پر غور و تفکر اور اللہ کے بارے میں انہماک اور اس سوچ و بچار کے نتیجے میں کہ عرب کیا چاہتے تھے' ان کے اندر سے اُٹھی تھی۔ وہ ایک مخلص لیکن فریب خوردہ انسان تھے۔ دوم: وہ (نعوذ باللہ) ایک خود ساختہ (imposter) آدمی تھے۔ وہ اپنی تحریر کے مصنف تھے' جسے انھوں نے اپنے گرد و پیش کے مختلف ذرائع سے حاصل کیا تھا اور اسے کلامِ الٰہی کہہ کر پیش کیا تھا''۔

اس نظریے کی کہ ''وہ ایک مخلص انسان تھے اگرچہ پیغمبر نہیں تھے'' دوسری ترجمانی جومیر (Jomier) نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں مسیحی نقطۂ نظر کی وضاحت کرتے ہوئے نسبتاً زیادہ قابلِ قبول اصطلاحات میں کی ہے۔ وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ایک عظیم مذہبی راہنما قرار دیتا ہے جنھوں نے' جیسا کہ اس نے اپنے تصور کی وضاحت کی ہے، ''زوال پذیر مذہب میں بہت سے مثبت اضافے کیے...... وسیع منصوبۂ نجات میں کچھ اصلاحات کیں'...... انھیں ایک تاریخی مشن تفویض کیا گیا...... اور اپنی اقدار اور تشخص کے کھو دینے کے

خطرے سے آگاہ کرتے ہوئے عیسائیوں کو مخاطب کیا''۔[21]

○

یہ تمام نقطۂ ہائے نظر کچھ سوال اٹھاتے ہیں' ان میں سے چند پر یہاں گفتگو کی جاتی ہے:

آخر ایسا کیوں ہے کہ جو لوگ نبوت کی شکل میں وحی الٰہی پر یقین رکھتے ہیں' وہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ کا پیغمبر نہیں پاتے؟ ظاہر ہے' اس لیے نہیں کہ وہ اس تصور کو خلافِ عقل اور غیر سائنٹفک سمجھتے ہیں' بلکہ اس لیے کہ ان کا خیال ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم اس معیار پر پورے نہیں اترتے کہ جس پر کسی کو ایک سچے پیغمبر کی حیثیت سے قبول کیا جا سکتا ہے۔ اس لیے یہ مناسب رہے گا اگر تحقیق و جستجو کو اس طور پر آگے بڑھایا جائے' معیارات کا تعیّن قطعیت سے کیا جائے' زیادہ تنقیدی نگاہ سے جائزہ لیا جائے' خصوصاً نبوت سے متعلق ان نظریات کی روشنی میں جو دوطرفہ طور پر قابلِ قبول ہوں خواہ وہ انجیل میں آئے ہوں یا قرآن میں۔ اس کے بعد محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی اور تعلیمات کو اس معیار پر پرکھا جا سکے گا۔ اس کا جواب اگرچہ نتیجہ خیز نہ ہوگا لیکن تحقیق مکمل طور پر بے فائدہ بھی نہ ہوگی۔

مزید برآں یہ نظریہ کہ: ''اگرچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنے دعوے میں سچے نہیں تھے اور جو کچھ انھوں نے کہا ہمیشہ سچ نہیں تھا' پھر بھی وہ انتہائی اخلاص کے ساتھ اپنی باتوں کے کلامِ الٰہی ہونے پر یقین رکھتے تھے'' کیا اس بیان سے کہ وہ ایک سچے مدعی نبوت نہیں تھے' زیادہ مضبوط ہے؟ ایک اندازِ نظر مصالحانہ اور مہذب ہے اور دوسرا مخالفانہ اور کھردرا۔

لیکن کیا ان کا آخری نتیجہ یکساں نہیں ہے: محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا دعویٰ سچا نہیں تھا۔ اس پر جو کچھ سوچا جا سکتا ہے' وہ یہ ہے کہ یہ باتیں ان کی حیات میں ان کے سامنے پیش کی گئیں اور

۲۱- احمد فان ڈینفر' "Muhammad A Prophet or a Great Religious Leader?" ' شائع کردہ: *Impact International* 'لندن' ۱۱-۲۴ جولائی' ص ۲

قرآن نے بہت صاف طور پر وضاحت اور قطعیت سے انھیں مسترد کیا۔ یہ الزام کہ وہ جو کچھ اللہ سے منسوب کرتے تھے اللہ کی طرف سے نہیں تھا' اس الزام کو نہ صرف جھٹلایا گیا ہے' بلکہ قرآن کے ہر صفحے پر جھٹلایا گیا ہے۔ یہی نہیں بلکہ یہ مثبت بات کہ یہ من جانب اللہ ہے اسے بھی کم نہیں دہرایا گیا ہے۔ بیش تر قرآنی سورتوں کا آغاز ہی اسی واضح بیان کے ساتھ ہوتا ہے۔ یہ یقین کرنا زیادہ مشکل نہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ۲۳ سال کی طویل مدت تک اپنے رسول ہونے پر اصرار کرتے رہے اور اس کے برعکس بات کی تردید ان الفاظ میں کرتے رہے جو وہ خدا کی طرف منسوب کر رہے تھے اور پھر بھی وہ ایک مخلص انسان تھے۔ جس وقت وہ اپنی زبان میں وہ کچھ تحریر کرنے میں مصروف تھے جس کی ہدایت ان کی اندرونی آواز دے رہی تھی یا وہ بیرونی ذرائع سے جانتے بوجھتے یہ مواد اکٹھا کر رہے تھے' اس وقت اسی مسئلے پر دلائل میں مصروف تھے۔ تو کیا کوئی مخلص شخص ایسے تیز و تند تنازعات میں مصروف ہو سکتا ہے' جب کہ وہ اسی وقت اپنے آپ کو وہ کچھ ظاہر کر رہا تھا جو وہ حقیقتاً نہیں تھا۔ کیا وہ اپنے پیروکاروں کو ناقابلِ تسخیر ایمان سے مالا مال کر سکتا ہے اور ان کی زندگیاں اپنے تصورات کے سانچے میں ڈھال سکتا ہے' جب کہ وہ تمام عرصہ غلط شناخت کا شکار رہے؟ یقیناً قرآن میں ایک تیز و تند استدلال کا سبب غلط شناخت نہیں ہو سکتی۔ صرف ایک جعلی شخص ہی اتنی مستقل مزاجی سے قطعی فیصلہ کن باتیں کر سکتا ہے۔

نبی کریمؐ کا زمانۂ نبوت

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا زمانہ بعثت بھی بعض مسائل اٹھاتا ہے' جن کا ہم جائزہ لے سکتے ہیں:

آپؐ ان تمام پیغمبروں کے آخر میں' جن پر یہود و نصاریٰ اور مسلمان ایمان رکھتے ہیں' اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بھی بعد تشریف لائے۔ یہ مذہبی نظریہ نہیں بلکہ تاریخی حقیقت ہے۔ لیکن آپؐ نے کبھی تمام پیغمبروں سے بہتر اور اعلیٰ پیغمبر ہونے کا یا کسی تاریخی عمل کا نقطۂ

عروج ہونے کا دعویٰ نہیں کیا۔ یہ قرآن اور حدیث سے ثابت ہے‘ خواہ مسلمان انھیں ایسا مقام دیتے ہوں۔ قرآن مسلمانوں کو ہدایت کرتا ہے کہ وہ کہیں: لانفرق بین احد من رسولہ۔ ایک مرتبہ کسی صحابی نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ان الفاظ میں مخاطب کیا: ’’یا اشرف المخلوقات!‘‘۔ آپؐ نے فرمایا: ’’وہ ابراہیمؑ تھے...... خلیل اللہ‘‘۔ ایک موقع پر آپؐ سے پوچھا گیا: ’’کس پیغمبر کا خاندان سب سے معزز و محترم ہے؟‘‘ آپؐ نے جواب دیا: ’’یوسفؑ کا خاندان۔ جو اس پیغمبر کے بیٹے تھے جس کا باپ بھی پیغمبر تھا‘ اور اس کے باپ ابراہیمؑ خلیل اللہ تھے‘‘۔ ایک مرتبہ ایک مسلمان اور ایک یہودی میں اس بات پر جھگڑا ہو گیا کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور موسیٰؑ میں کون بہتر و برتر ہے۔ یہ معاملہ آپؐ کے سامنے پیش کیا گیا۔ آپؐ نے سختی سے مسلمان کی سرزنش کی اور مسلمانوں سے کہا کہ وہ موسیٰؑ اور دوسرے انبیاؑ کے مقابلے میں انؐ کی ستایش اور مدح سرائی نہ کیا کریں۔ رچرڈ بیل (Bell) جیسے لوگ اسے یہودیوں کی خوشنودی حاصل کرنے اور انھیں پرچانے کے لیے پریشان حال حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سیاسی تدبیر سے تعبیر کریں گے‘ لیکن کیا مسلمانوں کا دوسرے انبیا علیہم السلام کے بارے میں رویہ ان تعلیمات کے سانچے میں ڈھلا ہوا نہیں دکھائی دیتا؟

ولفریڈ اسمتھ کا خیال ہے کہ یہ ایک انتہائی اہم بات ہے کہ کوئی مذہب زمانے کے لحاظ سے کسی دوسرے مذہب سے پہلے یا بعد آیا ہے۔ جو کسی کے بعد آئے وہ پہلے والے کے ساتھ سرپرستانہ رویہ رکھتا ہے۔ اس لیے عیسائیوں نے یہودیوں کی تمام کتب مقدسہ کو اپنی انجیل میں جمع کر لیا ہے۔[۲۲] یہ تاریخی نقطۂ نظر مسلم رویے کے ایک پہلو کی توجیہہ کر سکتا ہے لیکن وسیع تر پہلو کی گنجایش چھوڑتا ہے۔ اگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنی بنیادی تعلیمات‘ زندگی اور مشن کے ساتھ عہد نامہ عتیق کے زمانے اور فضا میں پہنچا دیے جائیں تو وہ کیا ایک سچے پیغمبر سے بڑھ کر بھی کچھ ہو سکتے تھے؟

۲۲- ولفرڈ کینٹ ول سمتھ: On Understanding Islam‘ حوالہ بالا‘ ص ۲۴۳

جدید اور قدیم کی بحث

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کی نوعیت کا اسلامی نقطۂ نظر' نہ کہ ان کی سچائی ہرچند کہ دونوں باہم دگر متعلق ہیں' ہماری توجہ ایک دوسرے اہم مسئلے کی طرف مبذول کرتا ہے۔ وہ ہے اسلام کا سائنس اور ٹکنالوجی کے چیلنج پر ردعمل اور جدیدیت کے پیدا کردہ مسائل سے عہدہ برآ ہونے کی صلاحیت۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان جدیدیت کے مسئلے سے بہت قریبی طور پر منسلک ہے۔ کوئی وجہ نہیں کہ مسلمان دوسرے مذاہب کے افراد سے ملاقاتیں کرنے اور ان چیلنجوں کو معلوم کرنے اور ان کے ممکنہ جواب دینے کے قابل نہ ہوں۔ جو چیز اس کام کو سہل بنائے گی وہ یہ ہے کہ جواب کو جدیدیت کی پہلے ہی سے دی گئی شرائط کی بنیاد پر نہیں دیا جانا چاہیے' جنھیں اس لیے قبول کیا جائے کہ یہ فی نفسہ درست ہیں۔ بعض اوقات محسوس ہوتا ہے--- مجھے امید ہے کہ میں غلطی پر ہوں--- مذہبی اجتماعات کے شرکا' ایسے طرزِ عمل کا مظاہرہ کرتے ہیں' جسے کسی نے کھردرے اور ناشایستہ لیکن صاف اور واضح الفاظ میں یوں بیان کیا ہے: ''اسلام اور مغرب کے مابین کوئی مکالمہ اس وقت تک نہیں ہوسکتا' نہ ہوگا جب تک کہ اسلام عورت اور سزاؤں کے بارے میں اپنی پوزیشن میں تبدیلی یا ترمیم پر آمادہ نہیں ہوجاتا''۔ شاید استدلال اور تفہیم سے' بیان کرنے اور سننے سے' مغرب اور اسلام ایک دوسرے سے زیادہ سیکھ سکیں گے۔

ایک ممکنہ جواب یہ بھی ہوسکتا ہے کہ پہلے ہی سے طے شدہ سائنسی نظریے کے زیراثر اسلام اس حد تک باقی رہ سکتا ہے جس حد تک عیسائیت مغرب میں باقی رہی ہے۔[۲۲] کیا انسانیت کے وسیع تر مفاد میں ہمیں اس امکان کو خوش آمدید کہنا چاہیے؟ کیا یہ نسلِ انسانی کے لیے بہتر ہوگا کہ اگر اسلام بھی اتنا کچھ کھو دے جتنا کہ عیسائیت نے کھویا ہے اور صرف اتنا

۲۲- جان ہک: God Has Many Names' حوالہ بالا' ص ۹۰

بچائے جتنا اس نے بچایا ہے؟ کیا یہ بدقسمتی نہ ہوگی کہ دوسرے مذاہب خود اپنے مختلف ردعمل دینے میں ناکام رہیں؟ ہم زیادہ بہتر (richer) صورت حال میں ہوں گے اگر ہر مذہب اپنا الگ ردعمل ظاہر کرے اور بالکل اس طرح کا ردعمل نہ دے جس طرح کا عیسائیت نے سائنس اور عقل پرستی، اثباتیت اور انسان دوستی کے نظریات کے پہلے حملے کے خلاف ظاہر کیا تھا۔ کیا یہ کوئی اچھی بات ہوگی کہ ہم تمام مذاہب کو محض ہر آن بدلتے رہنے والے تجربی علوم کی روشنی میں معتبر رہنے کے لیے بڑی بڑی تبدیلیوں سے گزرنے پر مجبور کریں؟ یہ انسانی زندگی میں مذہب کے کردار اور اصل مقصد کو ہی ختم کر دے گا۔

یہ تعیّن کہ 'قرونِ وسطیٰ' کیا ہے اور 'جدید کیا ہے؟'، 'قرونِ وسطیٰ کا انسان کیا ہے' اور 'جدید انسان کیا ہے' اور 'جدید ذہنیت کیا ہے؟' یہ سمجھنے میں بہت مددگار ثابت ہوگا کہ مغربی نظریات کے اثرات کا مقابلہ کرنے کے لیے دوسرے مذاہب کو اپنے جوابی اقدام کس طرح تشکیل دینا چاہییں۔ ظاہر ہے کہ قدیم اور جدید کے تصورات مغربی فکر کے پیدا کردہ ہیں جن کا ماخذ وہ خاص راستہ ہے جس پر مغربی تہذیب نے ترقی کی ہے۔ اگر جدیدیت حصولِ علم کے واحد ذریعے کے طور پر سائنٹفک اسلوب پیش کرتی ہے، اور اگر جدیدیت کا آغاز بقول ٹائن بی اس طرح ہوا تھا کہ "مغربی انسان نے اللہ کا نہیں بلکہ خود اپنا شکرادا کیا تھا"[۲۴] تب واقعتاً قدیم ذہنیت سے جس کا اعلان تھا: الحمد للہ رب العلمین (تمام حمد وثناء اللہ کے لیے ہے)، جدیدیت تک روحانی سفر کرنا آسان نہ ہوگا نہ 'ایک عالم گیر دنیا' کے مستقبل کے لیے ہی فائدہ مند ہوگا۔

اس میں شک نہیں کہ سائنس اور ٹکنالوجی نے مذہبی عقائد کے لیے بہت سے سنجیدہ چیلنج پیش کیے ہیں، لیکن انسانیت کی بقا کے لیے ان کا چیلنج بہت زیادہ سنگین ہے۔ بلاشبہہ مذاہب کو اپنے نظامِ عقائد، وحی اور نبوت کے بارے میں اپنے نظریات، اپنی آسمانی کتابوں اور مذہبی

۲۴- ٹائن بی [۱۸۸۹ء-۱۹۷۵ء]: A Study of History (تلخیص: ڈی سی سومرویل) اوکسفرڈ یونی ورسٹی پریس، اوکسفرڈ، ۱۹۵۷ء، ج ۲، ص ۱۴۸

لٹریچر' اپنے اخلاقی ضوابط اور انسانی زندگی کو منضبط کرنے کے اپنے دعوؤں کے بارے میں اٹھائے گئے سوالات کے مناسب اور قابلِ قبول جواب دینے کی عظیم ذمہ داری کا سامنا ہے۔ لیکن ٹھیک اسی وقت اس اندھے کنویں سے باہر نکلنے کا راستہ تلاش کرنے کی کوشش بھی' جو انسانیت کے وجود کے لیے خطرہ بنا ہوا ہے' ان کی کچھ کم ذمہ داری نہیں ہے۔

درپیش سنگین چیلنج

صرف سائنس اور ٹکنالوجی کو ہر اس مصیبت کی جڑ قرار دینا جس میں آج کل کا انسان مبتلا ہے مشکل ہی سے منصفانہ موقف قرار دیا جاسکتا ہے۔ لیکن' شاید بغیر کسی خاص اختلاف کے یہ کہا جاسکتا ہے کہ سائنسی نقطۂ نظر سے پیدا ہونے والے نظریہ ہائے حیات اور اخلاقی بندشوں سے آزاد ترقی کی اندھا دھند دوڑ نے اسے مکمل تباہی کی دہلیز تک پہنچانے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ اسے ہلاکت عظمیٰ کی خبر دینے والوں کی مایوسانہ باتیں کہا جاسکتا ہے۔ لیکن' انسانوں کی غالب اکثریت کو درپیش حد درجہ غربت اور افلاس' امیر اور غریب کے مابین گہری اور وسیع ہوتی خلیج' سلگتے ہوئے سیاسی قضیے' بڑھتے ہوئے بین الاقوامی قرضے' ان میں سے کوئی بھی یکایک پھٹ کر ہمیں ایک ناقابلِ تصور تباہی کی طرف لے جاسکتا ہے۔

میرے خیال میں یہ ایک انتہائی سنگین نوعیت کا چیلنج ہے جس کا سامنا اہل مذہب کو کرنا چاہیے۔ ان کے مذہب مختلف ہوسکتے ہیں' لیکن خطرہ ان سب کے لیے مشترک ہے۔ مذہب پر قابو پانے کے لیے ایٹم بم آسانی سے بنایا جاسکتا ہے لیکن ظاہر ہے کہ اگر ایک مرتبہ اس کی تباہ کاریوں کے دائرے کو پھیلنے دیا گیا تو یہ اپنا شکار ہونے والوں میں ان کے مذہب کی بنیاد پر تفریق نہ کرے گا۔

اس چیلنج کا واحد جواب' انتہائی اختصار کے ساتھ یہ ہے کہ ہر زمانے میں دیے جانے والے اللہ کے پیغام کو سنا جائے:

— میں نے ابراہیم کو منتخب کیا کہ وہ اپنے بیٹوں اور اپنی نسلوں کو میری اطاعت کی ہدایت دے اور حق وانصاف کی راہ دکھائے۔ (پیدایش ۱۹:۱۸)

— سوائے میرے کسی خدا کی عبادت نہ کرو۔ اپنے لیے آسمانوں اور زمین پر اور زیرزمین پانی میں کسی چیز کے عکس پیدا نہ کرو۔ (متی ۵:۷-۸)

— خلوصِ دل سے، اپنی روح اور ذہن کی پوری گہرائیوں کے ساتھ، اپنے مالک اللہ سے محبت رکھو۔ یہ اس کا سب سے بڑا اور اہم ترین حکم ہے۔ دوسرا سب سے بڑا اہم حکم یہ ہے کہ اپنے ہمسائے سے بھی ویسی ہی محبت رکھو جیسی کہ تم اپنے آپ سے رکھتے ہو۔ (متی ۲۲:۳۷-۳۹)

— یہ نہ سمجھو کہ میں توریت یا نبیوں کی کتابوں کو منسوخ کرنے آیا ہوں۔ میں انھیں منسوخ کرنے نہیں آیا بلکہ ان کی تصدیق اور انھیں پورا کرنے آیا ہوں۔ (متی: ۵-۱۷)

— آؤ ایک ایسی بات کی طرف جو ہمارے اور تمھارے درمیان یکساں ہے۔ یہ کہ ہم اللہ کے سوا کسی کی بندگی نہ کریں۔ اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہرائیں۔ اور ہم میں سے کوئی اللہ کے سوا کسی کو اپنا رب نہ بنا لے۔ (اٰل عمرٰن ۳:۶۴)

'شاید ہم ایسے مسائل کا کوئی حل تلاش نہ کرسکیں کہ جنھوں نے ہمیں تقسیم کر رکھا ہے۔ تاہم، ان پر گفتگو سے احتراز کا یہ کوئی معقول عذر نہیں لیکن ہم کافی مشترکہ ماخذ دریافت کرسکتے ہیں تاکہ انھیں یکجا کریں۔ اس سلسلے میں ایک انتہائی چبھتا ہوا سوال ہمیشہ باقی رہے گا: کیا ہم مذہب تسلیم کرنے والوں کی حیثیت سے مل رہے ہیں، اور کیا ہمارا یہ ملنا ہماری زندگی کے لیے اللہ کے بنائے گئے منصوبے کے مطابق، جیسا کہ ہم اسے سمجھتے ہیں، زندگی گزارنے میں ہمارا معاون ثابت ہوگا۔'[۲۵]

۲۵- احمد فان زینفر: *Some Reflections on Dialogue Between Christians and Muslims*، دی اسلامک فاؤنڈیشن، لسٹر، ۱۹۸۰ء، ص ۲۲

اُمت مسلمہ اور عصری چیلنج

اُمت مسلمہ کو' بلکہ ہر مسلمان ملک کو' آج ایک انتہائی سنگین چیلنج درپیش ہے۔ مسلمان اس چیلنج سے کس طرح عہدہ برآ ہوتے ہیں' اسی پر اس بات کا انحصار ہے کہ اس کا مقدر عزت وسربلندی ہوگا' یا ذلت وغلامی۔ وہ اپنی تہذیب کی نقشہ گری اپنے ایمان و اقدار اور تصورات کے مطابق کریں گے' یا انھیں خود کو نقش فرنگ میں رنگنا ہوگا؟ وہ اپنے انتہائی قیمتی وسائل وذرائع سے خود ترقی کی منازل طے کریں گے یا ان کا دسترخوان دنیا کی بھوکی قوموں کی لوٹ کھسوٹ کے لیے ایک تر نوالہ بنا رہے گا؟

چیلنج کا ادراک

یہ چیلنج اندرونی بھی ہے اور بیرونی بھی۔ لیکن دونوں دراصل ایک ہی چیلنج کے دو پہلو ہیں۔ دونوں کو ایک دوسرے سے الگ الگ نہیں کیا جا سکتا' اور ایک کا مقابلہ دوسرے کو نظر انداز کر کے کرنا ممکن نہیں۔ ایک طرف دنیا کی غالب مغربی طاقتیں اور ان کی حلقہ بگوش قومیں ہیں۔ ان طاقتوں نے اسلام اور مسلمانوں کو اپنے لیے مستقبل کا سب سے بڑا خطرہ قرار دے لیا ہے۔ اسی لیے وہ ان کو مغلوب رکھنے' اور اپنے رنگ میں رنگنے کو اپنا اوّلین ہدف بنا کر

کام کر رہی ہیں۔ یہ طاقتیں ہر قسم کی سیاسی، عسکری، فنی، معاشی اور ابلاغی قوتوں سے لیس ہیں۔ مسلمانوں کی قوتوں کا ان کی مذکورہ قوتوں سے کوئی تناسب ہی نہیں۔ ان قوتوں کے بل پر مغربی طاقتوں نے مسلمان ممالک کو ایک ایسے عالمی شکنجے میں کس لیا ہے، خصوصاً خلیجی جنگ [جنوری ۱۹۹۱ء اور پھر نائن الیون] کے بعد تادمِ تحریر کسی ملک کی یہ مجال نہیں کہ ان کی مرضی، ان کے عزائم اور ان کے مفادات کے خلاف ذرا سی بھی جنبش کر سکے۔

پہلے وہ صرف فضا میں اُڑنے والے ہوائی جہازوں کی مدد سے سن گن لے سکتی تھیں، ان کا کوئی فوجی اڈا نہ تھا، ان کی فوجوں کے موقع واردات پر پہنچنے کے لیے ہفتوں کی مدت درکار تھی۔ اب مشرق وسطیٰ [پاکستان اور وسطی ایشیا] کی زمین پر ہر کونے میں ان کا ایک فوجی اڈا موجود ہے، اور پلک جھپکنے میں ان کی فوجیں جہاں کارروائی ضروری ہو، وہاں پہنچ سکتی ہیں۔ سیاسی طور پر، تقریباً ہر مسلمان ملک عدمِ استحکام کا شکار ہے جس کی آگ سلگائے رکھنے میں مغربی طاقتوں کا بڑا حصہ ہے۔ عدمِ استحکام کے اس آتش فشاں پر زمامِ کار سنبھالے ان کا کوئی نہ کوئی مہرہ بیٹھا ہوا ہے، کچھ اس آتش فشاں کے پھٹ پڑنے کے ڈر سے اور کچھ اپنی طبیعت اور مزاج کی رغبت کی بنا پر، یہ مہرے ان طاقتوں کا ہر حکم بجالانے کے لیے دست بستہ تیار ہیں۔ معاشی طور پر عالمی بنک، عالمی مالیاتی فنڈ (IMF)، ورلڈ ٹریڈ آرگنائزیشن (WTO)، اقتصادی بائیکاٹ وغیرہ جیسے ہتھیاروں سے، انھوں نے ہر ملک کو اپنا محکوم بنا رکھا ہے، ان اداروں اور ملٹی نیشنل کمپنیوں نے ریاستی خودمختاری کو ایک حرفِ بے معنی بنا دیا ہے۔

مغربی حکمت عملی

ابلاغی قوتوں کے ذریعے وہ سیاہ کو سفید اور سفید کو سیاہ کر سکتے ہیں۔ اپنی ان قوتوں کو، مغربی طاقتیں صرف اپنے سیاسی و معاشی مفادات آگے بڑھانے ہی کے لیے استعمال نہیں کر رہی ہیں، بلکہ تہذیبی و ثقافتی غلبے کے لیے کھلم کھلا استعمال کر رہی ہیں۔ اپنے تصور کے مطابق

ناپسندیدہ حکومتوں کا تختہ اُلٹنے کے لیے ''خفیہ'' کارروائیوں سے بھی انھیں کوئی عار نہیں (خواہ وہ بالکل آشکار ہوں) اور ''دہشت گرد'' قرار دے کر بین الاقوامی اچھوت بنانے کی تلوار بھی وہ ہر وقت لہراتی رہتی ہیں۔

عراق کا بائیکاٹ' ایران کا اقتصادی بائیکاٹ اور اس کی حکومت کا تختہ اُلٹنے کے لیے بجٹ' سوڈان کا بائیکاٹ اور اس کو الٹی میٹم' چیچنیا میں مسلمانوں کے قتلِ عام پر مکمل خاموشی' بوسنیا میں مسلمانوں کی نسل کشی' عصمت دری اور تباہی و بربادی کی کھلم کھلا پشت پناہی اور پھر ایک ایسے معاہدہ کو مسلط کرنا جس میں قاتل و خونی سر آنکھوں پر بٹھائے جا رہے ہیں۔ فلسطین میں خود فلسطینیوں کے ذریعے جدوجہد آزادی کا استیصال' پاکستان پر توہینِ رسالتؐ جیسے قوانین کے انسداد کے لیے دباؤ' سلمان رشدی جیسے شاتمِ رسول کے خلاف آیت اللہ خمینی مرحوم [م: جون ۱۹۸۹ء] کے فتویٰ کو ختم کرنے کے لیے ایران پر ساری سیاسی و تجارتی قوت کا دباؤ ــــــ یہ صرف چند نمونے ہیں مسلمانوں کے خلاف مغربی طاقتوں کی یلغار کے۔

تاریخ کا سفر

دوسری طرف مسلمان ہیں۔

تین سو سال کی غلامی سے تن ہمہ داغ داغ اور سارا جسم زار و نزار ہے۔ خود وہ حکمران جو مغربی طاقتوں کی شطرنج کے پیادوں کا کام کر رہے ہیں' اسی غلامی کا ورثہ ہیں۔ سیاسی عدمِ استحکام اور معاشی بدحالی بھی انھی کا ترکہ ہے۔ مغرب کا تعلیمی اور ثقافتی غلبہ بھی اسی دور کی یادگار ہے' اور تعلیمی و علمی پس ماندگی بھی انھی کے منصوبوں کا نتیجہ۔ قومیت کے تیزاب سے جسدِ ملّی کا تار تار ہو جانا بھی' حکمت مغرب کا کارنامہ ہے۔ چنانچہ آج مسلمان ہر جگہ افتراق' انتشار' محاذ آرائی اور باہم خوں ریزی کا شکار ہیں۔ ایک طرف حکمراں اور عوام' دوسری طرف قوموں کے دیگر طبقات باہم متصادم ہیں۔ اندرونی محاذ آرائی میں بہترین انسانی وسائل ضائع ہو رہے

ہیں' اور مادی وسائل رائیگاں جا رہے ہیں۔

لیکن مسلمانوں کے مسائل کی ساری ذمہ داری اغیار کے سر ڈالنا صحیح نہیں۔ اگر تین سو سال پہلے مغربی اقوام نے دنیا کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک کی تقریباً ساری مسلمان حکومتوں کو سرنگوں کر لیا' تو اس کی اصل وجہ مسلمانوں کی اپنی کمزوریاں تھیں۔ اور اگر آج مغربی طاقتیں مسلمانوں کے خلاف اپنے منصوبوں کو عملی جامہ پہنانے میں کامیاب ہو رہی ہیں' تو اس کی بھی اصل وجہ مسلمانوں کی اپنی کمزوریاں ہیں۔ چونکہ وہ بے مقصد و بے سمت ہیں' اس لیے متفرق و منتشر ہیں۔ اور کیونکہ کوئی سمت نہیں اور متحد نہیں ہیں' اس لیے جوش و ہوش اور حکمت و ولولے کے ساتھ سرفروشانہ جدوجہد اور قوتِ عمل سے تہی دامن ہیں۔

آج کے اس سنگین چیلنج کا جواب دینے میں کامیابی کے لیے ضروری ہے' کہ ہمارے سامنے ہمارا لائحۂ عمل واضح ہو۔ اس مقصد کے لیے گہرے غور و فکر کی ضرورت ہے اور غور و فکر کے لیے ایک مناسب ایجنڈا بھی ضروری ہے۔ پہلے قدم کے طور پر ہم ان نکات کا تعین کرنا چاہتے ہیں جن پر غور و فکر یہ ایجنڈا اور لائحۂ عمل تیار کرنے کے لیے ناگزیر ہے:

۱- مغرب کا صلیبی مزاج: اسلام اور مغرب کے درمیان کش مکش کی تاریخ اتنی ہی قدیم ہے' جتنی جزیرہ عرب میں ظہور کے بعد اسلام کی تاریخ۔ مغرب سے ہماری مراد مغرب کی عیسائی سیکولر تہذیب ہے' جو ماضی میں بظاہر بالکل عیسائی اور ایک چرچ کے ماتحت ہونے کے باوجود ایک سیکولر تہذیب تھی' اور آج بظاہر بالکل سیکولر ہو جانے کے باوجود اندر سے ایک عیسائی تہذیب ہے۔ مغرب سے ہماری مراد وہ مغربی حکومتیں اور طاقتیں بھی ہیں جو کسی نہ کسی طور مسلمانوں سے آویزش و پیکار میں مشغول رہیں' خواہ بحیرہ روم کے ساحلوں پر' یا خود یورپ کی سرزمین پر' اسپین (وسط فرانس تک) سسلی اور مشرقی یورپ (وسط جرمنی تک) میں۔

آج اہلِ مغرب کے ذہن میں اسلام اور مسلمانوں کی جو تصویر ہے' ان کے خلاف دشمنی اور تعصب و مزاحمت کی ان کی جو نفسیات ہے' اور ان کے پروپیگنڈے کے جو نکات اور

اسلوب ہیں‘ ان سب کی جڑیں اسی تاریخ میں پائی جاتی ہیں۔ بلکہ اگر یہ کہا جائے کہ ”کل“ اور ”آج“ میں کوئی بڑا فرق نہیں واقع ہوا ہے‘ تو غلط نہ ہوگا۔ رسالت محمدیؐ کا معاملہ ہو‘ تشدد اور جنگ جوئی کا الزام ہو‘ عورتوں کے مقام کا مسئلہ ہو‘ یہ سب اسی تاریخ کا ورثہ ہیں۔

اس تاریخ کا‘ اور تاریخ کے اس دور میں مغرب نے اسلام کی جو تصویر بنائی‘ اور اس کے خلاف اس کی نفسیات کی جو تشکیل ہوئی‘ ان سب کا مطالعہ اور تعیّن سب سے پہلا کام ہونا چاہیے۔ ساتھ ہی اس صورت حال کے اسباب کا کھوج لگانا بھی ضروری ہے۔ ان اسباب میں جہاں حق ہو‘ وہاں اپنی غلطیوں کے اعتراف میں بھی کوئی تامل نہ ہونا چاہیے۔ اس لیے کہ خود احتسابی اور استغفار کو اُمت مسلمہ کا سب سے نمایاں شعار بنایا گیا ہے۔

۲- **مغربی دورِ تسلط کا حقیقت پسندانہ مطالعہ:** اس تاریخ کا پہلا باب ایک ہزار سال تک کا وہ دور تھا‘ جب اسلام مغرب کے لیے خطرہ بنا رہا۔ اس کے بعد تاریخ کا ورق پلٹا‘ اور مغرب نے بالاتری حاصل کی۔ پھر دو سو سال میں وہ اس مقام پر پہنچ گیا کہ ۱۹۲۰ء میں‘ ترکی‘ سعودی عرب [حجاز]‘ یمن اور افغانستان کے چار چھوٹے چھوٹے بظاہر آزاد ممالک کے علاوہ کوئی مسلمان ملک مغرب کے تسلط سے آزاد نہ تھا۔ اس صورت حال کے تین پہلو ہمارے غور و فکر کے محتاج ہیں۔

ایک یہ کہ مغرب کے تسلط کے اس دور میں مسلمانوں نے کیا کھویا اور کیا پایا؟ جو کچھ کھویا‘ اس پر بہت کچھ بولا اور لکھا گیا ہے۔ لیکن یہ پہلو اب بھی مزید تحقیق و تنقیح چاہتا ہے تاکہ جذبات سے بالا ہوکر واضح طور پر متعین ہو سکے‘ کہ جسدِ ملّی کو کس کس پہلو سے کیا زخم لگے۔ نفسیات اور سوچ میں کس طرح بگاڑ پیدا کیا گیا۔ اپنے علوم اور تعلیم سے رشتہ کاٹا گیا‘ بے معنی و بے مقصد اور لاحاصل تعلیم سے جوڑا گیا۔ اداروں کو تباہ کیا گیا‘ نئے ادارے جو اقدار و ثقافت سے مغائرت پر مبنی تھے‘ قائم کیے گئے۔ ذہن و فکر کو مغرب کا غلام بنایا گیا۔ اسلام کے بارے میں ریب و تشکیک اور احساس کمتری کو فروغ دیا گیا۔ اسی طرح یہ بھی تعیّن کرنا ضروری ہے کہ

جو کچھ نقصان پہنچایا گیا' وہ کن طریقوں سے پہنچایا گیا۔

کوئی تہذیبی تبادلہ یک طرفہ نہیں ہوتا' اور اس سے انکار ممکن نہیں کہ مغرب کے تسلط کے اس زمانے میں مسلمانوں نے کچھ پایا بھی ہے۔ تصادم اور دشمنی کی فضا میں اس پہلو سے سوچنا بھی مشکل ہوتا ہے' کجا کہ اس کا اظہار۔ لیکن اس کا بھی تعین ضروری ہے۔ پھر یہ بڑے بنیادی سوالات ہر مسلمان صاحبِ دانش کے غور و فکر کے محتاج ہیں:

- مغرب کے اس غلبے کے اسباب کیا تھے؟
- مغرب کی وہ کیا خوبیاں تھیں' اور ان کے مقابلے میں مسلمانوں کی کیا کمزوریاں تھیں' جن کے نتیجے میں یہ تسلط حاصل ہوا؟
- مغرب نے جو کاری زخم لگائے اور جو نقصان پہنچایا' اس میں وہ کیوں کامیاب ہوا؟
- مسلمانوں نے مغرب کے تہذیبی' فکری اور سیاسی غلبے کو روکنے کے لیے کیا حکمت عملیاں اور تدابیر اختیار کیں؟ ان میں کیا خوبیاں تھیں اور کیا خامیاں؟ ان میں کہاں تک کامیابیاں ہوئیں' اور کیا ناکامیاں ہوئیں؟ اور ان کے اسباب کیا تھے؟

آج مغرب کی اس وقت سے کہیں زیادہ بھرپور یلغار اور اس کے مقابلے کے لیے مسلمانوں کی موزوں حکمت عملی ترتیب دیتے ہوئے' ان تمام پہلوؤں کے بارے میں علم کی ضرورت ہے۔

۳- مغربی حکمت عملی' جوابی اقدام: مغرب سے آویزش کی جو صورت حال اس وقت بن گئی ہے' اس میں مختلف راستے اختیار کیے جا سکتے ہیں۔ ہر راستے میں بظاہر فی الوقت کامیابی کے امکانات بہت زیادہ نہیں۔ اندرونی کمزوریوں کے چیلنج کا جواب تیار کیے بغیر کسی راستے میں بھی کامیابی ممکن نہ ہوگی۔ پھر بھی ہر راستے پر مناسب غور کرنا ضروری ہے۔ ممکن ہے بعض راستے اس وقت اختیار کرنا ممکن نہ ہوں' لیکن آنے والا وقت' فضا کو ان کے لیے سازگار بنا دے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ ایک سے زیادہ راستے بیک وقت اختیار کیے جا سکیں۔

ایک یہ کہ عسکری مقابلہ ہو اور اس میں کامیابی حاصل ہو۔ اس کا اس وقت کیا امکان ہے؟ ظاہر ہے کہ کچھ بھی نہیں۔ ایک وقت ایسا آ سکتا ہے کہ یہ ممکن ہو' لیکن اس کے لیے ایک طویل مدت اور دیگر بے شمار پہلوؤں سے پیش رفت ناگزیر ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ فی الحال مغرب کی قوت اور اثر کو کم کرنے کے لیے چھوٹی موٹی عسکری کارروائیاں کی جائیں۔ لیکن کسی مجموعی اور وسیع تر حکمت عملی سے الگ ہو کر' اس کا بھی کارگر ہونا ممکن نظر نہیں آتا' کیونکہ فلسطین' بوسنیا' چیچنیا' الجیریا' شام' لبنان ـــــ کئی نظائر یہی بتاتے ہیں۔

دوسرے یہ کہ بقائے باہمی ہو اور مسلمان' بغیر کوئی تصادم مول لیے' اپنے اپنے ممالک میں اسلام کے مطابق اپنے معاشرے کی تشکیل کا کام کریں۔ جس حد تک یہ ممکن ہو' ضرور کرنا چاہیے۔ لیکن:

اوّل یہ کہ مغرب اس طرح کے بقائے باہمی (co-existence) کے لیے تیار نہیں۔ سوڈان کی نظیر ہمارے سامنے ہے جہاں پر اسلامی شریعت نافذ کرنے کی کوشش پر' اہلِ مغرب نے چاروں طرف سے ہمسایہ ممالک کو سوڈان کے خلاف اُبھارا اور مقامی عیسائی آبادی کو مسلح بغاوت کے لیے منظم کیا۔

دوسرے یہ کہ مسلم ممالک کی عظیم اکثریت پر جو مہرے عنانِ حکومت سنبھالے بیٹھے ہیں' وہ مغرب کے تابع دار اور مطیع و فرماں بردار گروہ ہیں' ان کی موجودگی میں اس راہ پر چلنا ممکن نہیں۔ خصوصاً گذشتہ چند برسوں کے دوران میں جس طرح یکے بعد دیگرے خود مسلمان حکومتوں کو 'بنیاد پرستی' اور 'انتہا پسندی' کے خلاف کھڑا کر دیا گیا ہے اس کو دیکھتے ہوئے۔

تیسرے' خود اہلِ مغرب کے دلوں کو اسلام کے لیے مسخر کیا جائے' اور خود مغرب میں سے جو قوتِ اسلام کے لیے حاصل ہو سکتی ہو' اسے حاصل کر لیا جائے۔

۴- مغرب دشمنی کا راستہ یا داعیانہ روش: مغرب سے آویزش میں' خود اہلِ مغرب کو اسلام کا ہم نوا اور علم بردار بنانے کی حکمت عملی' بہت سارے پہلوؤں سے

مناسب تدابیر اور بنیادی تبدیلیوں کے بارے میں غور وفکر کی متقاضی ہوگی۔ یہ جاننا ضروری ہوگا کہ آج کے تہذیبی مسائل/ ایشوز (issues) کیا ہیں' جن کے بارے میں انسان پریشان ہے اور حل کا متلاشی۔ ان ایشوز کو ہمیں اسلام کی دعوت میں مناسب مقام دینا ہوگا۔ مثلاً امن وامان' خاندان' عورت کا مقام و مرتبہ' معاشی عدل' انسانی حقوق' فرد کا مقام' ریاست کی ہمہ گیریت' حکمرانوں اور سیاست دانوں سے مایوسی' ماحولیات وغیرہ۔

اسی طرح' باہمی آویزش کے باوجود' جب کہ مسلمان کوئی تصادم مول لے کر اس میں کامیابی کا امکان نہیں دیکھتے' اس وقت تک مغرب کے مقابلے میں حریف مقابل کی پوزیشن اختیار کرنے سے اجتناب کی مناسب تدابیر اختیار کرنا ہوں گی۔ ایک طرف مغرب کی جارحانہ یلغار ہے اور مغرب کے خلاف عام مسلمانوں میں نفرت پائی جاتی ہے۔ پھر اس یلغار کے خلاف مسلمانوں کے احساسات کو زبان دینے کی ضرورت اپنی جگہ ہے۔ دوسری طرف' حریف بننے سے اجتناب کی پالیسی کا بنیادی سوال ہے ــــ ان دو متضاد چیزوں کے درمیان تطابق کیسے ہو؟ یہ طے کرنا آسان نہیں' مگر اس کا پاس ولحاظ ضروری بھی ہے۔

اسی طرح آویزش کے باوجود مشترک امور کی تلاش: تَعَالَوْا اِلٰى كَلِمَةٍ سَوَآءٍ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ [آل عمران ۳:۶۴] 'آؤ ایک ایسی بات کی طرف جو ہمارے اور تمھارے درمیان یکساں ہے'۔ نفرت اور اندھی دشمنی کو فروغ دینے سے اجتناب ''ابوجہل'' یا ''عمر'' جیسے لوگوں کے ذریعے اسلام کی تقویت کی تمنا اور تدبیر ــــ یہ بھی ایک نازک راستہ ہوگا۔

اس ضمن میں مغرب میں مسلمانوں کی بڑی بڑی آبادیوں کا موجود ہو جانا بھی مشیت الٰہی کی ایک ایسی تدبیر ہے' جس کی اہمیت کو کسی بھی صورت نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ استنبول (ترکی) سے لاس اینجلز (امریکا) تک یہ لاکھوں مسلمان' اب اُمت مسلمہ کا سب سے اگلا محاذ (front line) ہیں' وہ لائن جو اب بحیرہ روم سے آگے بڑھ کر عین مغرب کے قلب میں پہنچ گئی ہے۔ یہ مسلمان کیا کریں' اور کیوں کر کریں؟ یہ مسلمانوں کے ایجنڈے پر ایک اہم سوال

ہونا چاہیے۔ اس پہلو پر غور کرنا ضروری ہے کہ یہ مسلمان' اپنی تمام خامیوں کے باوجود' اہلِ مغرب کو اسلام کے لیے مسخر کرنے کی حکمت میں ایک کلیدی کردار کس طرح ادا کر سکتے ہیں۔

۵- **اسلام سے عملی وابستگی**: اسلام سے محبت' اور اسلام کے نام پر پکارے جانے کے باوجود عامۃ المسلمین کی قابلِ لحاظ تعداد' اسلام کے لیے کہیں بھی متحرک اور سرگرم نہیں ہوئی ہے۔

ظاہر ہے کہ اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان اور ان سے محبت' اور غلبۂ دین اور شوقِ شہادت کے علاوہ اور کون سا مدعا و مقصد مسلمان کو اٹھا سکتا ہے۔ پھر اس میں کامیابی کیوں نہیں ہو رہی اور کامیابی ہو تو کیوں کر؟ اس مدعا و مقصد کو کن سادہ اور سیدھے الفاظ میں' کس اسلوب سے بیان کیا جائے کہ عام مسلمان کے دل کے تاروں کو چھیڑ دے۔ عام مسلمانوں میں اللہ اور رسولؐ سے محبت' اللہ سے ملاقات کا شوق اور جذبۂ شہادت و جہاد کس طرح پیدا کیا جائے؟ یہ بھی آج کے ایجنڈے کا ایک اہم مسئلہ ہے۔

۶- **وحدت کی تلاش**: قوت کا دوسرا سرچشمہ افتراق سے نجات اور وحدت اُمت ہے۔ ظاہر ہے کہ وحدت کی بنیاد ایک مقصد سے ایسی وابستگی اور محبت ہے' جو ہر دوسری وابستگی اور محبت سے بالاتر ہو۔ لیکن اس کے بعد بھی وحدت کو برقرار رکھنے اور مستحکم کرنے اور پارہ پارہ ہونے سے بچانے کے لیے دوسری تدابیر ضروری ہوں گی۔

اس ضمن میں حکمرانوں اور باشندوں کے درمیان' قدیم و جدید کے درمیان' مغربی اور غیر مغربی کے درمیان' امیر و غریب کے درمیان اور مختلف نسل و رنگ کے درمیان کش مکش اور تصادم کے مسائل حل کرنے کے لیے بھی نئے سرے سے غور کرنا ہوگا۔ کہاں کہاں اور کس کس طرح اس محاذ آرائی کو کم یا ختم کیا جا سکتا ہے۔ مختلف الخیال اور مختلف المزاج اور نیک و بد سب کو ایک شیرازے میں منسلک کرنے اور ایک مقصد کے لیے سرگرم کر دینے کا ہدف بھی' آج کے رویوں اور تدابیر سے بہت مختلف رویوں اور تدابیر کا تقاضا کرے گا۔

۷- اجتہادی فکر و نظر: مغرب سے مقابلہ اسی وقت ممکن ہوگا کہ اسلامی تہذیب کی تشکیل نو کے بنیادی خطوط متعین کرنے میں کامیابی ہو۔ یہ مقصد بغیر ایک عظیم اجتہادی کاوش کے آگے نہیں بڑھ سکتا۔

اجتہاد کا مسئلہ بہت نازک مسئلہ ہے۔ ایک طرف سلف کی روایت اور اس پر اُمت کا عمل ہے' دوسری طرف تغیّر زمانہ و احوال سے تغیّر احکام کے تقاضے ہیں۔ ایک طرف وہ مقام ہے' جہاں سے مسلمانوں نے تہذیبی مسائل میں اجتہاد ترک کیا' دوسری طرف آج کا مقام ہے جب انسانی علوم اور تمدنی اداروں کو مغرب بہت آگے لے گیا ہے۔ مغرب سے بہت کچھ ہم' کسی مناسب بحث و تمحیص کے بغیر' اختیار کر چکے ہیں' اور اسی طرح بہت کچھ کو کسی بحث و تمحیص کے بغیر رد کر چکے ہیں۔ بعض کے نزدیک مغرب کی ہر چیز کفر ہے' بعض کے نزدیک عین حق۔ مغرب نے جو کچھ ''ایجادات'' کی ہیں' ٹکنالوجی کی نہیں' تمدن کی' ان میں سے کیا لینا ہے اور کیا چھوڑنا ہے؟ اجتہاد کا یہ پہلو بھی اس ایجنڈے کا ایک اہم نکتہ ہے۔

۸- توازن اور اعتدال: آخری مسئلہ حکمت اور شجاعت' استقلال اور تغیّر' مزاحمت اور مفاہمت اور جوش و ہوش کے درمیان مناسب توازن کا مسئلہ ہے۔ ایسا توازن جس سے اُمت اپنے اندر کے اور باہر سے مغرب کے چیلنج کا اس طرح مقابلہ کر سکے کہ وہ کامیابی کی طرف آگے بڑھتی رہے۔

ان تمام مسائل پر غور و فکر کر کے مناسب حل تلاش کرنے کا کام کسی ایک فرد یا چند افراد کے بس کی بات نہیں۔ اس کے لیے بہت سے لوگوں کو تدبر کرنے اور سر جوڑ کر بیٹھنے کی ضرورت ہے۔ لیکن ہمیں یقین ہے کہ ان مسائل سے بحث کیے بغیر ہم کسی طرح آج کے چیلنج کا مقابلہ کرنے میں کامیابی حاصل نہیں کریں گے۔ اس لیے جو غور و فکر کی صلاحیت رکھتا ہو' اس کو اپنا حصّہ ادا کرنے سے گریز نہ کرنا چاہیے۔

اُمت مسلمہ کو درپیش بہت سے چیلنجوں کا جواب اس عمل میں مضمر ہے! [مارچ ۱۹۹۶ء]

□□□

ملّت اسلامیہ کی ذمہ داری

دنیا آج اپنی تاریخ کے ایک انتہائی سنگین بحران سے گزر رہی ہے۔

آدم علیہ السلام کے بیٹوں نے اسے فساد و خوں ریزی اور ظلم و جور سے بھر دیا ہے' ظَهَرَ الْفَسَادُ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ [الروم ۳۰:۴۱] کا عالم ہے۔ قوموں اور انسانوں کے درمیان اخلاق و قانون کے معروف ضابطے ٹوٹ پھوٹ گئے ہیں' معروف اور منکر کا احساس ختم ہو گیا ہے' ان کی تمیز اُٹھ گئی ہے' بلکہ منکر' معروف بن گیا ہے اور معروف منکر۔ کہیں جنگ کے طبل بج رہے ہیں' کہیں قتل و غارت گری کا بازار گرم ہے' کہیں ہوس و انتقام کے ہاتھوں عزت و آبرو کا دامن تار تار ہے۔ عام زندگی میں لوٹ کھسوٹ اور بدعنوانی کا راج ہے' اقتدار کی ہوس اور نااہلی نے انسانوں کی زندگی کو دکھ' مشقت اور نا اُمیدی سے بھر دیا ہے۔

زندگی کا صحرا

عام آدمی کی زندگی سکون اور چین سے محروم ہے۔

ایک طرف فقر و غربت کا یہ عالم ہے کہ اکثر انسان جانوروں سے بدتر زندگی گزار رہے ہیں۔ دوسری طرف پیسے کی اتنی فراوانی ہے کہ کوئی عیش نہیں جو میسر نہ ہو۔ لیکن غریب

ہوں یا امیر' سب کی خواہش یہی ہے کہ جو نہیں ہے' وہ کسی نہ کسی طرح ملنا چاہیے' اور زیادہ سے زیادہ ملنا چاہیے۔ اس ہوس نے جہنّم کی آگ کو' جو کل عین الیقین سے دیکھی جائے گی' آج ہی ــــ دلوں کے اندر' چہروں پر' گھروں' بازاروں اور ایوانوں میں اس طرح سلگا دیا ہے کہ دیکھنے والے دیکھ سکتے ہیں۔ ارشادِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے مطابق ''برباد ہوا درہم کا بندہ' برباد ہوا دینار کا بندہ!'' زندگی ایک صحرا بن گئی ہے' جس میں شیطان نے انسان کو بھٹکا دیا ہے' اور وہ حیران و سرگرداں ہے۔

اس سنگین بحران کا سب سے سنگین حصّہ اُمت مسلمہ کے حصّہ میں آیا ہے۔ ایک ارب انسانوں پر مشتمل اور ہر قسم کے وسائل سے مالا مال' اس دسترخوان پر دنیا کی قومیں بھوکوں کی طرح ٹوٹ پڑ رہی ہیں' گویا کہ وہ سب کے لیے ایک تر نوالہ بن گئی ہے۔

کشمیر' بوسنیا' فلسطین' چیچنیا' صومالیہ' اراکان (برما-میانمار)' مورولینڈ (فلپائن)' سراپا درد ہیں۔ حسرت بھری ہے داستاں میری۔ ذلت و مسکنت سروں پر مسلط ہے۔ افتراق و انتشار کی آگ بھڑک رہی ہے۔ غربت' جہالت اور پس ماندگی مقدر بن گئی ہیں۔ سب کشتی میں چھید کرنے میں مصروف ہیں' اُوپر والے بھی اور نیچے والے بھی۔ حکمراں اپنی اور غیروں کی خواہشات کے آگے سجدہ ریز ہیں اور عام آدمی خوف و حزن کا شکار اور تمناؤں کے سراب میں گم۔

ملّی زوال کا سبب

فساد کے اس غلبے کی اصل وجہ کیا ہے؟ اس کا علاج کیا ہے' کیسے ہو سکتا ہے؟

تاریخ انسانی پر اندھی بہری قوتوں کی کارفرمائی نہیں ہے۔ زمان ہو یا مکان' کائنات ہو یا تاریخ' حکمرانی اسی کی ہے' جو کچھ ہے اور جو کچھ ہو رہا ہے' اسی کی مشیت و تدبیر سے ہے اور ہو رہا ہے' جو سب کچھ سنتا اور دیکھتا ہے' ہر چیز کا علم رکھتا ہے۔ رحمت اور عدل سے حکم کر رہا ہے کہ وہ رحمٰن و رحیم ہے اور قائماً بالقسط ہے۔

وَمَا يَعْزُبُ عَنْ رَّبِّكَ مِنْ مِّثْقَالِ ذَرَّةٍ فِي الْاَرْضِ وَلَا فِي السَّمَآءِ وَلَآ اَصْغَرَ مِنْ ذٰلِكَ وَلَآ اَكْبَرَ اِلَّا فِيْ كِتٰبٍ مُّبِيْنٍ ○ (یونس ۱۰:۶۱)

کوئی ذرہ برابر چیز آسمان اور زمین میں ایسی نہیں ہے' نہ چھوٹی نہ بڑی' جو تیرے رب کی نظر سے پوشیدہ ہو' اور ایک صاف دفتر میں درج نہ ہو۔

اس لیے اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ دنیا میں جس کے ساتھ جو کچھ ہو رہا ہے' سنت الٰہی کے مطابق ہو رہا ہے' اور اس میں ظلم کے شائبہ کا بھی امکان نہیں:

اِنَّ اللّٰهَ لَا يَظْلِمُ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ (النساء ۴:۴۰)

بے شک اللہ (کسی پر) ذرہ برابر بھی ظلم نہیں کرتا۔

یہ سنت الٰہی کیا ہے؟

قرآن کا فیصلہ

جہاں تک انسان کا تعلق ہے' اس کو دنیا میں نعمت بھی ملتی ہے اور مصیبت بھی۔ لیکن ان کا انحصار اس کے اعمال پر نہیں۔ نہ بڑی سے بڑی دنیاوی نعمت کی کوئی قیمت ہے کہ اس کا ملنا بھلائی میں شمار ہو' نہ تکلیف کی کہ وہ اس کے حق میں برائی ہو۔ یہ دونوں بھلائی اور برائی کمانے کے مواقع اور ذرائع ہیں۔ اور یہ فرد پر منحصر ہے کہ وہ اپنے ایمان و عمل سے جس کو چاہے اپنے حق میں ابدی نعمت میں تبدیل کر لے' جس کو چاہے عذاب میں ڈھال لے۔ دنیا کا آرام ہو یا تکلیف' گزر جانے والی چیزیں ہیں' باقی رہنے والے صرف ایمان و عمل ہی ہیں۔ اسی لیے دنیا کے ملنے کا کوئی ایسا حساب اور معلوم ضابطہ بھی نہیں جیسا اعمال کا' کہ رزق بغیر حساب ملتا ہے۔

لیکن' اجتماع انسانی کا معاملہ بالکل مختلف ہے۔ کوئی اس لیے نہیں مرتا' جوان اور بوڑھا نہیں ہوتا' راحت یا مصیبت میں نہیں پڑتا کہ وہ نیک یا بد ہے۔ نہ اس کو موت کے بعد زندگی

واپس مل سکتی ہے نہ بڑھاپے کے بعد جوانی۔ مگر قوموں اور تہذیبوں کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے دوسرا ہی قانون بیان فرمایا ہے کہ وہ اپنے اعمال کی وجہ سے مرتی ہیں۔

فَكُلًّا اَخَذْنَا بِذَنْۢبِهٖ (العنکبوت ۲۹: ۴۰)

پس ہم نے ہر ایک کو اس کے گناہوں کی وجہ سے پکڑا۔

وَتِلْكَ الْقُرٰٓى اَهْلَكْنٰهُمْ لَمَّا ظَلَمُوْا (الکہف ۱۸: ۵۹)

یہ عذاب رسیدہ بستیاں تمھارے سامنے موجود ہیں۔ انھوں نے جب ظلم کیا تو ہم نے انھیں ہلاک کر دیا۔

ایک قوم ہلاکت کے کنارے پہنچ کر واپس بھی آسکتی ہے‘ جیسا قومِ یونس کے معاملے میں ہوا۔ وہ موت کے بعد پھر زندہ ہوسکتی ہے‘ جیسا بنی اسرائیل کے ساتھ ہوا۔ فرد کے ایمان و تقویٰ کے ساتھ دنیا کی نعمتیں وابستہ نہیں کی گئیں‘ لیکن قوموں سے وعدہ کیا گیا ہے:

اگر بستیوں کے لوگ ایمان لاتے اور تقویٰ کی روش اختیار کرتے تو ہم ان پر آسمان اور زمین سے برکتوں کے دروازے کھول دیتے (الاعراف ۷:۹۶)

(اور اگر تم راہِ استغفار پر گامزن ہو تو) وہ تم پر آسمان سے خوب بارشیں برسائے گا‘ تمھیں مال اور اولاد سے نوازے گا‘ تمھارے لیے باغ پیدا کرے گا اور تمھارے لیے نہریں جاری کردے گا۔ (نوح ۷۱:۱۱-۱۲)

اُمت مسلمہ کے معاملے میں بھی یہی قانون لاگو ہے۔

اگر جنگل کا سب سے کانٹے دار حصہ اس کا مقدر بنا ہے تو کوئی تعجب کی بات نہیں۔ اس کو اپنے اعمال کے بقدر ہی نہیں‘ دوسروں کے اعمال میں سے بھی حصہ مل رہا ہے۔ اس لیے کہ یہی تو اس کے لیے ذمہ داری بنائی گئی تھی کہ وہ اس دنیا کو گلزار بنائے اور سب ''اپنے'' لیے جیتے ہیں اور جیتے ہیں‘ مگر یہ اُمت تمام انسانیت کے لیے بنائی گئی تھی (كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ۔ اٰل عمرٰن ۳:۱۱۰) اس کا جینا اسی مقصد سے وابستہ کیا گیا تھا کہ وہ دین و شریعت اور عقل و فطرت

کے نزدیک جانی پہچانی اور مسلمہ نیکیوں کی ہدایت کرے اور برائیوں سے روکے۔ (تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ۔ اٰل عمرٰن ۳:۱۱۰)' خود ایمان باللہ کی حامل بھی ہو اور دوسروں کے لیے اس کا نمونہ اور گواہی بھی (وَتُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ ۔ ۳:۱۱۰)' اور بھلائی کی طرف بلانے والی ہو (يَّدْعُوْنَ اِلَى الْخَيْرِ ۔ ۳:۱۰۴)۔ جب اُمت مسلمہ ہی اپنے مقصد وجود کو فراموش کر کے دوسرے راستوں پر نکل گئی' تو یہ دنیا جنگل بن گئی اور پھر مشیت الٰہی نے سب سے زیادہ کانٹوں والا جنگل اس اُمت کے حصے میں اُگایا۔

زوال سے بچاؤ

دنیا کا فساد ہو یا اُمت مسلمہ کے مسائل' ان کا کوئی حل اس کے علاوہ ممکن نہیں کہ اوّل' اُمت یہ جانے کہ اس کا مقصد اور مشن سارے انسانوں کو خیر کی طرف بلانا' اور حق و تسلط کو قائم کر کے ان کے سامنے اس پر گواہ بننا ہے۔ دوسرے' وہ یہ جانے کہ اس مقصد کی تکمیل کے لیے وہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ ایک عہد اور میثاق میں بندھی ہوئی ہے۔ یہی میثاق اس کی تشکیل کی بنیاد ہے۔ اسی خالق کائنات سے وفا پر اس کی بقا اور ترقی کا انحصار ہے۔ آج تک دنیا میں اسے جو کچھ ملا ہے' اسی کی وجہ سے ملا ہے۔ وہ خدا کی آخری ہدایت و وحی کی امین ہے' اس کے دین و شریعت کی نعمت سے سرفراز ہے' انسانیت کا ضمیر اور "نفس لوامہ" ہے اور اس کے دین کی حقیقت احتساب کائنات ہے۔ جب وہ ہر نفس خود اپنے عمل کا حساب کرنے لگے' تب ہی دست قضا میں شمشیر بن کر فساد ارضی کا خاتمہ کر سکے گی۔

ہماری اُمت کی یہ حقیقت اور مقام بالکل واضح ہے۔ اس کا نام اسی کا اعلان ہے۔ هُوَ سَمّٰكُمُ الْمُسْلِمِيْنَ [الحج ۲۲:۷۸]۔ اس نے تمھیں "مسلم" کا نام دیا ہے۔ اُمت مسلمہ کا نام نسل پر مبنی ہے اور نہ رنگ' زبان' علاقہ اور مادی مفادات' معاشی ترقی کے معیار پر۔ یہ تو ایمان و عمل کا مظہر ہے۔ اللہ کو اپنا رب مان لینا' اس کے آگے جھک جانا' صرف اس کا بن جانا'

اور اس کی تابع داری کے لیے ہر وقت دست بستہ کھڑے رہنا' اس کے علاوہ مسلمہ کے کوئی معنی نہیں۔

اس کی تاریخ اور روایات بھی یہی بتارہی ہیں: مِلَّةَ اَبِيكُمْ اِبْرَاهِيمَ، اپنے باپ' ابراہیم علیہ السلام کی ملّت! جہاد اور شہادتِ حق کی راہ پر گامزن ملّت! وہ ملّت جو بے خطر آتشِ نمرود میں کود پڑے۔ گھربار اور وطن ترک کر دے' دشت و بیابان میں اپنا گھر بنائے' اپنے اکلوتے بیٹے کے گلے پر چھری رکھنے سے دریغ نہ کرے۔ جب پکارا جائے تو کہے'لبیک' میں حاضر ہوں۔ قرآن نے سیدنا ابراہیم خلیل اللہ کے مادی کمالات کی نہیں' عشق و قربانی کی داستان سنائی ہے' اور بتایا ہے کہ اسی کے صلے میں ان کو امامِ عالم بنایا۔

قرآن کی روشنی

قرآن کی آیات یہی ابدی اور ہمہ گیر روشنی دے رہی ہیں:

- تمھیں اُمت وسط بنایا ہے تاکہ تم دنیا کے لوگوں کے سامنے گواہ بنو (البقرہ)
- اللہ کی راہ میں جہاد کرو تاکہ لوگوں کے سامنے گواہ بنو (الحج)
- رسول' کتاب' اور میزان اس لیے اتارے کہ لوگ انصاف پر قائم ہو جائیں' اب دیکھیں کون اللہ اور اس کے رسول کی نصرت کے لیے کھڑا ہوتا ہے (الحدید)
- انصاف کے قائم کرنے والے بنو' لوگوں کے سامنے گواہ ہو' صرف اللہ کے لیے (النساء ۴:۱۲۵' المائدہ ۵:۸)

ان کے ساتھ ہی اس نے علو و غلبہ' تمکین و حکومت اور استخلاف کا وعدہ مشروط فرمایا۔

رسول رحمت صلی اللہ علیہ وسلم کا اسوہ اسی حقیقت پر گواہ ہے۔ ''اے نبیؐ، ہم نے تمھیں گواہ' اور بشارت دینے والا اور آگاہ کرنے والا' اور اللہ کی طرف بلانے والا اس کی اجازت

سے اور روشن چراغ بنا کر بھیجا ہے''۔ کہلوایا گیا کہ ''اللہ سے محبت کرتے ہو تو میری راہ چلو' میرے پیچھے پیچھے ہو لو''۔ حرا سے اُتر کر اس وقت تک' جب رفیق اعلیٰ کے پاس تشریف لے گئے' ہر دم اور ہر سانس آپ صلی اللہ علیہ وسلم کس راہ پر چلتے رہے' کس مشن کی تکمیل کے لیے کوشاں رہے؟ یہی مشن اُمت کی حقیقت اور مقام ہے' اسی میں اس کے لیے عزت و سربلندی ہے' اسی میں انسانیت کے لیے آج کے عالم گیر فساد سے نجات کی راہ ہے۔

اس مشن کی تکمیل کا عہد و میثاق ہوا تو اُمت مسلمہ وجود میں آئی:

وَاذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَمِيْثَاقَهُ الَّذِىْ وَاثَقَكُمْ بِهٖٓ اِذْ قُلْتُمْ سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا (المائدہ ۵:۷) اور یاد کرو (ہدایت کی) اس نعمت کو جو اللہ نے تمھیں دی ہے' اور (یاد رکھو) اس پختہ عہد و پیمان کو جو اس نے تم سے لیا ہے' یعنی تمھارا یہ عہد کہ ''ہم سنیں گے اور مانیں گے''۔

رسول اور کتابِ ہدایت کی نعمت کا تقاضا کیا ہے' اور اُمت سے بحیثیت مجموعی سننے اور ماننے کا میثاق کس چیز کے لیے ہے۔ یہ بھی ساتھ ہی ساتھ بتا دیا گیا:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْا قَوّٰمِيْنَ لِلّٰهِ شُهَدَآءَ بِالْقِسْطِ (المائدہ ۵:۸) اے ایمان والو! اللہ کی خاطر راستی پر قائم رہنے والے اور انصاف کی گواہی دینے والے بنو۔

اور بنی اسرائیل کے حوالے سے' ہمارے اس میثاق کو بالکل کھول کر بیان کر دیا:

وَقَالَ اللّٰهُ اِنِّىْ مَعَكُمْ ؕ لَئِنْ اَقَمْتُمُ الصَّلٰوةَ وَاٰتَيْتُمُ الزَّكٰوةَ وَاٰمَنْتُمْ بِرُسُلِىْ وَعَزَّرْتُمُوْهُمْ وَاَقْرَضْتُمُ اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا (المائدہ ۵:۱۲) اور اللہ نے کہا تھا: ''میں تمھارے ساتھ ہوں' اگر تم نے نماز قائم رکھی' اور زکوٰۃ دی' اور میرے رسولوں کو مانا' اور ان کی مدد کی' اور اپنے خدا کو اچھا قرض دیتے رہے''۔

عہدِ وفا

کہا جا سکتا ہے کہ ''ہمیں تو یاد نہیں کہ ہم نے کوئی ایسا میثاق کیا ہو''۔ لیکن ہر عہد لکھ پڑھ کر اور قول و قرار کر کے نہیں ہوتا۔ جب بچہ گھر میں پیدا ہوتا ہے اور پرورش پاتا ہے' تو بہر حال ماں باپ کی اطاعت' ان سے حسنِ سلوک' اور گھر کی روایات وضوابط کی پابندی کے عہد میں بندھ جاتا ہے۔ جب آدمی کسی کے دسترخوان پر مسلسل کھاتا ہے تو اخلاقاً وفاداری اور نمک حرامی سے اجتناب کا پابند ہو جاتا ہے۔ جب وہ کسی کی ملازمت شروع کر دیتا ہے اور تنخواہ وصول کر لیتا ہے' تو کوئی رسمی اعلان کیے بغیر وہ شرائط ملازمت پوری کرنے کا عہد کر لیتا ہے۔

یہی معاملہ مسلمان کا ہے۔ بحیثیت انسان کے وہ مسلسل ربِ کائنات کے دسترخوان پر کھا رہا ہے' اور اس سے ہر لمحہ اپنی تنخواہ لے رہا ہے۔ وہ اس سے عہد بندگی کا اور نمک حلالی کا پابند ہے۔ بحیثیت مومن کے وہ کلمہ پڑھتا ہے (جو قول و قرار ہے) اور قرآن کو کتاب الٰہی تسلیم کرتا ہے۔ اس کے آباؤاجداد پر آسمان و زمین سے برکتوں کے دروازے کھلے رہے۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے میثاق کو یاد رکھنے سے پہلے اس کی یہ نعمتیں یاد کرنے کی ہدایت کی' تاکہ وہ سبیلِ راہ بنیں۔

اس میثاق پر مہر تصدیق اس وقت لگی' جب بدر کے میدان میں [۲ ہجری] نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے رب کے سامنے بہ چشم تر عرض کیا: اگر یہ مٹھی بھر گروہ ہلاک ہو گیا' تو زمین پر تیری عبادت نہ کی جائے گی' یہ ایک ناز بھری التجا ہی نہ تھی' یہ پوری اُمت کی طرف سے امام اُمت کا عہد و میثاق بھی تھا۔

اگر تو نے آج اس میدان میں اس مٹھی بھر گروہ کو فتح اور زندگی عطا کی' تو رہتی دنیا تک یہ اُمت زمین پر تیری بندگی قائم کرنے کی پابند ہو گی۔ بدر کی فتح ہی نے اُمت مسلمہ کے لیے' اور اس کے ذریعے انسانیت کے لیے' زندگی اور فتوحات کے دروازے کھول دیے' تاکہ اللہ کی یہ بات پوری ہو:

جسے ہلاک ہونا ہے وہ روشن دلیل کے ساتھ ہلاک ہو' اور جسے زندہ رہنا ہے وہ روشن دلیل کے ساتھ زندہ رہے۔ (الانفال ۸:۴۲)

عہد کی اہمیّت

عہد کی پابندی پر زمین و آسمان قائم ہیں' پوری انسانی زندگی قائم ہے۔ خاندان' سیاست اور معیشت قائم ہیں۔ اسی لیے قرآن مجید بار بار ایفائے عہد کی تاکید کرتا ہے۔ عہد شکنی' اور زبان و دل اور قول و عمل کے تضاد کو نفاق قرار دیتا ہے۔ حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ [م ۹۳ھ/۷۱۲ء] کہتے ہیں کہ کم ہی ایسا ہوتا کہ حضورؐ تقریر فرماتے ہوں اور یہ نہ کہتے ہوں:

لا دين لمن لا عهد له ولا ايمان لمن لا امانة له (حدیث)

جس کو عہد کا پاس نہیں اس کا کوئی دین نہیں' اور جس کو امانت کا پاس نہیں اس کا کوئی ایمان نہیں۔

جس سورہ المائدہ میں آیت میثاق درج ہے' جو اس تاکید کے ساتھ شروع ہوئی کہ اُوفوا بالعقود۔ اسی میں کھول کر بیان کر دیا گیا ہے کہ عہد شکنی کیا ہوتی ہے' اور کس انجام تک ہوتی ہے۔ بنی اسرائیل' ہم سے پہلے اُمت مسلمہ تھے۔ ان کے حوالے سے بیان کیا گیا ہے:

- ان کا حال یہ ہے کہ الفاظ کا اُلٹ پھیر کر کے' بات کو کہیں سے کہیں لے جاتے ہیں۔ جو تعلیم انھیں دی گئی تھی اس کا بڑا حصّہ بھول چکے ہیں۔ اور آئے دن تمھیں ان کی کسی نہ کسی خیانت کا پتا چلتا رہتا ہے۔ ان میں سے بہت کم لوگ اس عیب سے بچے ہوئے ہیں۔ (المائدہ ۵:۱۳)
- تم دیکھتے ہو کہ ان میں سے بکثرت لوگ گناہ اور ظلم و زیادتی کے کاموں میں دوڑ دھوپ کرتے پھرتے ہیں' اور حرام کے مال کھاتے ہیں۔ بہت بری حرکات ہیں جو یہ کر رہے ہیں۔ کیوں ان کے علما اور مشائخ انھیں گناہ پر زبان کھولنے اور حرام

کھانے سے نہیں روکتے؟ یقیناً بہت ہی برا کارنامۂ زندگی ہے جو وہ تیار کر رہے ہیں۔ (المائدہ ۵: ۶۲-۶۳)

- اے اہل کتاب، تم ہرگز کسی اصل پر نہیں ہو جب تک کہ تورات اور انجیل اور ان دوسری کتابوں کو قائم نہ کرو جو تمھاری طرف تمھارے رب کی طرف سے نازل کی گئی ہیں۔ (المائدہ ۵: ۶۸)
- کہو، اے اہلِ کتاب، اپنے دین میں ناحق غلو نہ کرو اور ان لوگوں کے تخیلات کی پیروی نہ کرو جو تم سے پہلے خود گمراہ ہوئے اور بہتوں کو گمراہ کیا اور ''سواء السبیل'' سے بھٹک گئے۔ بنی اسرائیل میں سے جن لوگوں نے کفر کی راہ اختیار کی ان پر داؤدؑ اور عیسیٰ ابن مریم کی زبان سے لعنت کی گئی، کیونکہ وہ سرکش ہو گئے تھے اور زیادتیاں کرنے لگے تھے، انھوں نے ایک دوسرے کو برے افعال کے ارتکاب سے روکنا چھوڑ دیا تھا۔ برا طرزِ عمل تھا جو انھوں نے اختیار کیا۔ (المائدہ ۵: ۷۷-۷۹)
- یہ ان کا اپنے عہد کو توڑ ڈالنا تھا، جس کی وجہ سے ہم نے ان کو اپنی رحمت سے دُور پھینک دیا، اور ان کے دل سخت کر دیے۔ (المائدہ ۵: ۱۳)

کامیابی کی راہ

ہم اس آئینے میں اپنی تصویر نہ دیکھ سکیں، مگر آج خلا سے کوئی ایسی مخلوق زمین پر آئے جو نہ ہماری کتابیں پڑھ سکتی ہو، نہ تقریریں سمجھ سکتی ہو، اور اس کے جاننے کا ذریعہ صرف آنکھیں ہوں، تو اسے ہماری تصویر دیکھنے میں کوئی دقت نہ ہوگی۔ واشنگٹن، لندن، پیرس ہو یا جکارتا، کراچی، ریاض ہو یا قاہرہ، اسے انسانوں میں کوئی فرق نظر نہ آئے گا۔ دونوں کے مقاصد زندگی ایک، دونوں کی تگ و دو ایک، دونوں کے ادارے اور ارادے ایک۔ کوئی فرق نظر آئے گا تو وہ یہ کہ عام انسانی اخلاق کے لحاظ سے اور تہذیب کی ظاہری چمک دمک کے لحاظ سے وہ ہم سے

بہت آگے ہیں۔ وہ اگر یہ رائے قائم کرے کہ آج کے مسلمانوں کا عمومی طرزِ عمل ظلم و زیادتی کی' بے ایمانی اور دھوکا دہی کی' رشوت اور بدعنوانی کی' ہوسِ زر اور تنگ دلی و تندخوئی کی تعلیم دیتا ہے' تو کچھ بے جا نہ ہوگا۔

یہ لعنت اور دل کی سختی نہیں تو کیا ہے کہ: بھائی بھائی کا خون بہا رہا ہے' ظلم و بے رحمی اور غیر انسانی سلوک کے ریکارڈ توڑے جا رہے ہیں۔ ملک و ملت کو دونوں ہاتھوں سے لوٹے جا رہے ہیں' ہوس و اقتدار اور باہمی ضد و عناد میں وطن کے استحکام' ترقی اور مستقبل کو داؤ پر لگا رہے ہیں۔ اپنے تخت کی حفاظت کے لیے اپنے ہی جوانوں کو تختہ دار پر کھینچ رہے ہیں۔ ساتھ ہی وعظ و نصیحت' نماز و قرآن کا سلسلہ بھی جاری ہے' مگر دل نرم نہیں پڑتے' رویوں میں نرمی نہیں آتی اور اخلاق و عمل میں تبدیلی نہیں پیدا ہوتی۔

ہم چاہیں کہ اللہ سے اپنے میثاق کی تجدید اور اس کے وفا کرنے کی جستجو و کاوش کے بغیر ہمارے مسائل حل ہو جائیں' ہمیں سیاسی استحکام نصیب ہو' معاشی ترقی حاصل ہو' یگانگت اور اتحاد پیدا ہو' عزت و سربلندی ملے' تو ایسا ہرگز نہیں ہوگا۔

بیماری کا علاج بیماری نہیں

آج ہماری تمناؤں اور آرزوؤں کی معراج کیا ہے؟

ہم ''ان'' جیسے بن جائیں' ہمیں ان کا قرب حاصل ہو' ہم ان کی داد و تحسین کے مستحق ٹھیریں' جو ترقی یافتہ اور مہذب کہلاتے ہیں ـــــ حالانکہ انھوں نے ہی زمین کو فساد اور ظلم و جور سے بھر دیا ہے' اور انھی کی وجہ سے ہم اپنے مقصد سے محرومی' اپنی ثقافت سے بے گانگی' اور ذلت و نکبت کے امراض میں مبتلا ہیں۔ یا پھر ان کی سطح پر پرواز کے لیے کوئی مقام ہی پالیں' 'ایشیائی ٹائیگر' کے لقب ہی سے کوئی ہمیں پکار دے۔ ''مدینہ'' کی صف نہ سہی' کوریا اور تائیوان کی صف میں ہمارا شمار ضرور ہو جائے۔

جب ہمارے بقراط [م: ۳۷۷ ق م] اور جالینوس [م: ۱۹۹ء] ہمارا علاج تجویز کرتے ہیں تو ان میں سے کوئی کہتا ہے: ''بچوں کو پہلی جماعت سے انگریزی پڑھاؤ''۔ کوئی کہتا ہے: ''سائنس اور ٹکنالوجی کی تعلیم عام کرو''۔ کوئی کہتا ہے: ''صنعتی پیداوار بڑھاؤ''۔ کوئی کہتا ہے: ''لندن اور پیرس کی طرح بن جاؤ''۔ لیکن جو ان ساری چیزوں میں ہم سے کوسوں آگے ہیں' جو مادی ترقی کے ان سارے میدانوں میں لیڈر ہیں اور اس ترقی کی اعلیٰ ترین منزلیں چھو چکے ہیں۔ جن کے ''چہرے'' ایسے روشن ہیں کہ نگاہیں خیرہ ہو جائیں' کیا یہ وہی نہیں ہیں جن کا اندرون چنگیز سے تاریک تر ہے' جو خود انتشار کا شکار ہیں' جہاں بے یقینی و یاس نے اور بدامنی اور بے گانگی نے اپنے تاریک سائے ڈال دیے ہیں۔

کارخانوں کی بڑھتی ہوئی تعداد' صاف شفاف سڑکیں' قومی پیداوار میں چند پوائنٹ کا اضافہ' اسٹاک ایکسچینج کا اُوپر اٹھنا' فی کس ٹیلی فون لائنوں کا بڑھ جانا' فی کس آمدنی میں اضافہ ـــــ یہ تو وہ کھلونے ہیں جو مغرب کے بالغ نظر استاد نے ہمارے ہاتھوں میں تھما دیے ہیں' تاکہ ہم اپنے اصل مقام سے غافل' ان سے دل بہلاتے رہیں' اگرچہ سونے کا ہمالہ ہو تو مٹی کا ہے اک ڈھیر' بقول اقبال ؎

عصرِ حاضر ملک الموت ہے تیرا' جس نے
قبض کی روح تری' دے کے تجھے فکرِ معاش

ہمیں یہ کہنے میں کوئی تامل نہیں کہ معاشی ترقی کے دیوتا کی طرف مسابقت کی دوڑ ایک ایسی دوڑ ہے جس میں بالآخر تہذیبی لحاظ ہی سے نہیں' معاشی لحاظ سے بھی' پس ماندہ رہنا ہمارا مقدر ہے۔ ہمارا مطلب یہ ہرگز نہیں' اور یہ غلط فہمی بالکل نہ ہونی چاہیے کہ مسلمان فقر و غربت ہی میں جینے کے لیے پیدا ہوا ہے' اور اسے معاشی ترقی کے لیے کوشش نہیں کرنا چاہیے' یا دنیاوی ترقی مطلوب نہیں' کارخانے اور سڑکیں نہیں بننا چاہییں۔

نہیں' ہمارا مدعا یہ اور صرف یہ ہے کہ ان کو مقصدِ زندگی نہ بننا چاہیے۔ جب یہ مقصود

بن جاتے ہیں تو ''بت'' بن جاتے ہیں۔ پھر نہ خدا ملتا ہے اور نہ وصالِ صنم۔ پھر ہر جگہ چوری اور بدعنوانی کے سوراخ ہو جاتے ہیں۔ پھر ہر ایک بہتی گنگا میں ہاتھ دھونے کے لیے اُتر پڑتا ہے۔ پھر ایک اُمت مسلمہ کا حشر وہی ہوتا ہے جو بنی اسرائیل کا سامری کے بچھڑے کی پرستش کر کے ہوا۔ پھر اُمت کے ٹکڑے ٹکڑے ہو جاتے ہیں:

حکمتِ مغرب سے ملت کی یہ کیفیت ہوئی
ٹکڑے ٹکڑے جس طرح سونے کو کر دیتا ہے گاز

مستقبل کے لیے

بیسویں صدی کے ساتویں عشرے میں' ماہنامہ چراغ راہ کراچی کے تحریکِ اسلامی نمبر میں' مستقبل کے سب سے بڑے مسئلے کے سلسلے میں ہم نے جو کچھ لکھا تھا' اسے یہاں دہرا دینا مفید سمجھتے ہیں۔

- قیامِ پاکستان کے بعد ہی سے آہستہ آہستہ اور مارشل لا لگنے کے بعد بڑی شدت سے' نہ صرف یہ کہ ہماری قوم کو اس کے اصل' اور فطری نصب العین سے مایوس کیا گیا' اور اس سے رشتہ کاٹا گیا' بلکہ بدترین ظلم یہ کیا گیا کہ ایک سوچے سمجھے انداز میں اس کے لیے ایک دوسرے نصب العین کا سنہری دام بچھایا گیا' جو نہ اس کے معتقدات کے مطابق تھا اور نہ اس کے ساتھ اس کی ثقافتی و دینی روایات رواج پاسکتی تھیں۔ یہ نصب العین ہے' ''معاشی ترقی'' اور ''معیارِ زندگی کی بہتری'' کا۔ انگریز کی طویل غلامی سے نکل کر یہ مردِ بیمار ابھی اپنے پاؤں پر کھڑا بھی نہ ہوا تھا کہ ہمارے لیڈروں اور ہمارے نشر و اشاعت کے تمام ذرائع نے اس مقصد کی زہریلی خوراکیں اس کے حلق سے نیچے اتارنا شروع کر دیں۔
- یہ ایک ایسا نصب العین ہے جس کے ساتھ نہ اسلام کا نباہ ہو سکتا ہے' نہ اخلاق کا' نہ

اس میں روحانیت کا کوئی سوال باقی رہتا ہے نہ پاکیزگی اور ایثار کا۔ اس نے ہمیں چند جسمانی مظاہر اور چند ٹکڑوں کے عوض اپنی قیمتی متاع بھی فروخت کر ڈالنے پر تیار کر دیا۔ اس نے ہمارے نوجوانوں کے عزائم کو پست اور ان کی اُمنگوں کو سرد کر دیا۔ اس نے ہمیں خودغرضی اور نفس پرستی کا درس دیا۔ اس نے ہماری ملّی وحدت کو پارہ پارہ کر دیا۔ اس نے اس قوم کو جو کبھی لا الٰہ الا اللہ جیسے روحانی مقصد کے لیے دیوانہ وار مصروف جدوجہد ہو گئی تھی، محض فیکٹریاں بنانے اور کھیتوں کی پیداوار بڑھانے کے مقاصد کے ساتھ باندھ کر پستی میں دھکیل دیا۔ اس نے معاشی لوٹ کھسوٹ، اخلاقی اباحیت، غلامی، بین الاقوامی گدائی، بے یقینی، احساسِ کمتری، بے حیائی اور منافقت کے ناپاک رجحانات کو جنم دیا، یا تقویت پہنچائی۔ یہ اس کے زہریلے پھل ہیں، جو آج ہم کھا رہے ہیں اور مستقبل میں بھی کھائیں گے۔ اگر اُمت مسلمہ کا آئیڈیل یہی ہونا تھا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کفارِ قریش کی حکومت، دولت اور حسن کی پیش کش کو کبھی رد نہ فرماتے۔

- دین جس راستے پر لے جانا چاہتا ہے، معاشی انصاف اور خوش حالی اس کے لازمی نشان ہائے منزل ہیں۔ لیکن اگر معاشی ترقی نصب العین بن جائے، تو دونوں کے راستے مخالف سمت میں جاتے ہیں۔ بڑے عیار ہیں وہ لوگ، جو یہ کہہ کر آنکھوں میں دھول جھونکنا چاہتے ہیں کہ ہم اسلام بھی چاہتے ہیں، اور مادی ترقی بھی۔ حالانکہ ان کی تمام جدوجہد، ان کی پوری زندگی، معاشی ترقی کی دیوی کے لیے خالص ہو کر رہ گئی ہے۔
- تحریکِ اسلامی کیونکہ اسلامی مقاصد اور آخرت کے نصب العین کی دعوت کو لے کر کام کر رہی ہے، اس لیے اسے مستقبل میں باطل کے اس خطرناک اوتار کے خلاف جہادِ اکبر کرنا ہوگا۔ اسے ایک طرف اس نصب العین کی ان جڑوں کو کھودنا ہوگا، جو

آہستہ آہستہ ہمارے جسم کے اندر پھیلتی جارہی ہیں۔ دوسری طرف ملک کے نوجوانوں کو اس بات کا یقین دلانا ہوگا کہ اگر دونوں مقاصد کا نعرہ لگایا تو اسلام کا دامن ہاتھ سے چھوٹنا تو یقینی ہے ہی' لیکن باوجود تمام قوتیں لگا دینے کے' مادی خوش حالی کی چڑیا بھی ہاتھ نہ آئے گی۔ اس حقیقت پر ہماری پوری تاریخ شاہد ہے۔ اس کے برعکس اگر ہم نے دعوتِ اسلامی کے لیے اپنی جدوجہد کو خالص کر لیا تو خوش حالی اور مادی ترقی بھی لازمی ہے اور آخرت کی بھلائی بھی: (ترجمہ) کاش انھوں نے تورات اور انجیل اور ان دوسری کتابوں کو قائم کیا ہوتا جو اِن کے رب کی طرف سے ان کے پاس بھیجی گئی تھیں۔ ایسا کرتے تو ان کے لیے اُوپر سے رزق برستا اور نیچے سے اُبلتا۔ (المائدہ ۵:۶۶)

- یہ آیندہ دور کا سب سے بڑا مسئلہ ہے۔ یہ کرنے کا سب سے بڑا کام ہے اور موجودہ تہذیب کے غلبے کی وجہ سے اس کام کو کرنا بال سے زیادہ باریک اور تلوار سے زیادہ تیز راستے پر سفر کرنے کے مترادف ہے۔[۱]

آج اُمت کے لیے عصرِ حاضر کے چیلنج کا مقابلہ کرنے کا ایک ہی طریقہ ہے' انسانیت کی نجات بھی اسی میں ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی اس پکار پر کان دھرے اور لبیک کہے:

اے لوگو! جو ایمان لائے ہو' اللہ اور اس کے رسول کی پکار پر لبیک کہو' جب کہ رسول تمھیں اس چیز کی طرف بلائیں جو تمھیں زندگی بخشنے والی ہے......

اور بچو اس فتنہ سے جس کی شامت مخصوص طور پر صرف انھی لوگوں تک محدود نہ رہے گی' جنھوں نے تم میں سے گناہ کیا ہو......

اے لوگو! جو ایمان لائے ہو' جانتے بوجھتے اللہ اور اس کے رسولؐ کے ساتھ خیانت

۱- خرم مراد: مسائل افکار' ص ۱۴-۱۶

نہ کرو اپنی امانتوں میں غداری کے مرتکب نہ ہو۔ (الانفال ۸: ۲۴-۲۷)

شکر ہے کہ آج اُمت میں اللہ اور رسولؐ کی پکار ہر طرف سے اُٹھ رہی ہے۔ مرد' عورت' بوڑھے' نوجوان' بچے سب اس پر لبیک کہہ رہے ہیں۔ اسلامی تحریکات نے جدوجہد کا دیا جلا دیا ہے۔ ابھی اس کو چراغ اور آفتاب بننے وقت لگے گا۔ اس راہ میں سنگ ہائے گراں حائل ہیں' لیکن اس پر لبیک کہنا ہی زندگی اور ترقی کا ضامن ہے۔ یہ ہر مسلمان کا کام ہے کہ وہ اپنے عمل کا حساب کرے اور دیکھے کہ وہ اپنے عہد و امانت کی پاس داری کے لیے کیا کر رہا ہے۔ [فروری ۱۹۹۴ء]

❑❑❑

دنیا کا مستقبل - اسلام

آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے لب پہ آ سکتا نہیں
محو حیرت ہوں کہ دنیا کیا سے کیا ہو جائے گی
شب گریزاں ہوگی آخر جلوۂ خورشید سے
یہ چمن معمور ہوگا نغمۂ توحید سے

عالم کا مستقبل آج اسلام کا ہے!

اگر کل یہ ایک خواب تھا' تو آج یہ بات عیاں ہے کہ اس خواب کے حقیقت بن جانے کی گھڑی بہت قریب آ گئی ہے۔ کب؟ اس کا علم تو اسی وحدۂ لاشریک کے پاس ہے جس کے دستِ قدرت میں آسمان سے زمین تک ہر امر کی باگ ہے: قُلْ إِنَّمَا عِلْمُهَا عِندَ اللّٰهِ (الاعراف ۷:۱۸۷)، "کہو اس کا علم تو صرف اللہ کو ہے"۔ لیکن جس کی نگاہیں تاریخ کے باطن میں جھانک سکتی ہیں' اور جو نبوت محمدی کا مزاج آشنا ہے' وہ جانتا ہے کہ یہ گھڑی: ثَقُلَتْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ (الاعراف ۷:۱۸۷)' آسمان اور زمین اس سے بوجھل ہیں' کا مصداق بن چکی ہے۔

امید کا راستہ

اس لیے کہ یہ نبوت محمدیؐ کا ناگزیر تقاضا ہے' اور اس کا ظہور پذیر ہونا اٹل ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم جمیع انسانوں کی طرف' سارے عالموں کے لیے' اور رہتی دنیا تک کے لیے رسول' نذیر اور رحمت ہیں۔ اور ''اللہ تعالیٰ نے یہ لکھ دیا ہے کہ میں اور میرے رسول غالب ہو کر رہیں گے''۔ وقت لگ سکتا ہے' مگر نوشتۂ الٰہی ٹل نہیں سکتا۔

اس لیے بھی کہ نبوت محمدیؐ کا مشن روزِ اوّل ہی سے عالمی انقلاب کی منزل رہا ہے۔ ہجرتِ مدینہ کے پُرخطر سفر کی بے سروسامانی کے عالم میں سراقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو کسریٰ [اقتدار کا خاتمہ: ۶۵۱ء] کے کنگنوں کی بشارت ہو' یا غزوۂ احزاب [۵ ہجری] کے لیے خندق کھودتے ہوئے روم و ایران اور شام و یمن کی فتوحات کی نوید' شاہانِ عالم کی طرف قبولِ اسلام کے دعوت نامے ہوں' یا سلطنت روما سے جنگ کے لیے [۹ ہجری میں] تبوک کا سفر ــــــ یہ سب اسی مشن کی آرزو' جستجو اور تکمیل کے مظاہر ہیں۔

اس لیے بھی کہ' حضورؐ کے بعد' آپؐ کے مشن کی امانت' آپؐ کی اُمت کے سپرد ہے۔ اسی لیے اس اُمت کو اپنے لیے نہیں' بلکہ ساری انسانیت کے لیے بنایا گیا ہے (اُخْـرِجَـتْ لِلنَّاسِ)' بہترین اُمت (خَيْرَ اُمَّةٍ) قرار دیا گیا ہے۔ رسولؐ کے بعد رسولؐ کی طرح' انسانوں کے سامنے گواہ بنایا گیا ہے (لِتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ - البقرہ ۲:۱۴۳) اور اللہ کی خاطر قسط و عدل قائم کرنے (قَوّٰمِيْنَ بِالْقِسْطِ - النساء ۴:۱۳۵) کا حکم دیا گیا ہے۔ لہٰذا عصرِ حاضر میں کارِ رسالتؐ' اُمت مسلمہ کے ہاتھوں ہی انجام پانا ہے۔ وہ لوگ انجام دیں جن پر آج اُمت مشتمل ہے' یا اللہ تعالیٰ اُمت میں نیا خون داخل کرے' اور ان کی جگہ دوسرے لوگوں کو لے آئے' یہ کام بہرحال انجام پانا ہے۔

ادھر خود عصرِ حاضر کی روح مضطرب اور بے تاب ہے کہ شرع پیغمبرؐ آشکارا اور غالب ہو۔ مغرب نے انسان کی بلوغت اور خودمختاری کا اعلان کیا' اس کو کسی بھی بالاتر' اور بالخصوص

خدائی ہدایت سے مستغنی قرار دیا' خدا کو عام انسانی زندگی سے بے دخل کیا ــــ گویا انسان کو انسان کا خدا بنا دیا ــــ اور بڑی محنت سے ایک نیا عالم تشکیل دیا۔ لیکن دو صدیاں بھی نہیں گزرنے پائی ہیں کہ آج وہ عالم پیر مر رہا ہے' اور انسان بے چینی سے ایک جہانِ نو کی پیدائش کا انتظار کر رہا ہے۔

خدا سے بے تعلق ہو جانے کے بعد' انسان نے اپنی زندگی کو اور خدا کی زمین کو فساد اور خوں ریزی سے بھر دیا ہے۔ روز نت نئی خواہشات کی طلب ہے' ہر طلب میں روز بروز اضافہ ہے' ہر چیز کو زیادہ سے زیادہ ہونا چاہیے' اور جو کچھ چاہیے وہ جلد از جلد ملنا چاہیے۔ انسان ہوں یا ٹکنالوجی' زمین ہو یا کائنات' ہر چیز صرف خواہشات پوری کرنے کا ذریعہ بن گئی ہے۔ ہر سینے میں لالچ و حسد کی آگ جل رہی ہے۔ خدا کو بھول کر انسان خود اپنی بھلائی سے غافل ہو گیا ہے۔

زمین کے فاصلے سکڑتے جا رہے ہیں' مگر انسانوں کے درمیان نفرت اور لاتعلقی کی ناقابلِ عبور خلیجیں بڑھتی جا رہی ہیں۔ بیسویں صدی انسانی تاریخ کی سب سے زیادہ خونیں صدی ہے۔ پہلی جنگِ عظیم میں ۸۵ لاکھ' دوسری جنگِ عظیم میں پانچ کروڑ سے زیادہ' کوریا اور ویت نام [میں ۱۴ لاکھ] جیسی مقامی جنگوں میں' انسانی جبر و استبداد کے ہاتھوں اور رنگ و نسل کے خداؤں کی چوکھٹ پر' ان سے بھی کہیں زیادہ انسان موت کے گھاٹ اُتارے گئے ہیں۔ ان سے کئی گنا زیادہ تعداد اپاہج بنائی گئی ہے۔

سماجی بحران

انسان تاریخ میں پہلی دفعہ ایسے ہتھیاروں سے لیس ہے کہ ایک بٹن دبا کر پوری نسلِ انسانی کو چشمِ زدن میں ہلاک کر سکتا ہے۔ خاندانی زندگی اس طرح ٹوٹ پھوٹ گئی ہے کہ صرف برطانیہ میں ایک تہائی بچے شادی کے بغیر ناجائز پیدا ہو رہے ہیں' ۲۰ فی صد بچوں کا خاندانوں میں کوئی باپ نہیں ہے' آدھی عورتیں شادی سے پہلے اپنے شوہروں سے جنسی

تعلقات قائم کر چکی ہوتی ہیں' ہر دوسری شادی کا انجام طلاق ہوتا ہے۔ بچوں اور نوجوانوں میں سنگین جرائم میں روز بروز اضافہ ہو رہا ہے۔

جدید بنک کاری کا نظام' جس کے بل پر معاشی ترقی قائم ہے' ایک بلبلے کی طرح ہے: آج جس بنک کے دروازے پر بھی سارے کھاتے دار اپنی رقم واپس مانگنے پہنچ جائیں' اس بنک کا دیوالیہ نکل جائے گا۔ بظاہر انتہائی مضبوط سیاسی اور ریاستی نظاموں میں بھی' سیاسی لیڈروں سے ایک عام مایوسی اور بد اعتمادی پیدا ہو چکی ہے۔ اپنی خواہشات کی بے لگام تکمیل کی دھن میں دنیا کے ماحول کو ایسا زبردست نقصان پہنچ رہا ہے' جو عین ممکن ہے ناقابلِ تلافی اور تباہ کن ثابت ہو۔

دورِ جدید کے انسان کے اُوپر ایسے بے شمار مسائل کا اتنا بھاری بوجھ ہے کہ کوئی تنکا بھی اس کی کمر توڑ سکتا ہے۔ ان مسائل کی جڑ خدا بیزار تہذیب ہے' اور انسانی زندگی میں جب خدا کا خانہ خالی ہوتا ہے تو اس میں بے شمار جھوٹے خدا براجمان ہو جاتے ہیں۔ پہلے یہ جھوٹے خدا بھی مافوق الانسانی صفات کے حامل سمجھے جاتے تھے' اور خدائے واحد کی قربت کا ذریعہ بھی۔ اب انسان نے اتفاق (chance)' قانونِ قدرت' ذرائع پیداوار' جنس' سوسائٹی' کلچر' ٹکنالوجی' نسل' رنگ' قوم اور وطن جیسے بہرے' گونگے' بے جان بتانِ نو کو اپنے مقدر کا مالک سمجھ لیا ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ روز بروز وہ تباہی کے گہرے سے گہرے گڑھے میں گرتا جا رہا ہے۔

اس سے نجات کی راہ صرف خدائے واحد ہی کو خدا اور رب ماننے کے علاوہ اور کچھ نہیں۔ اسی سے وحدت انسان اور امن و سلامتی کی نعمتیں اس کو نصیب ہوں گی۔ اس لیے یہ کہنا بالکل بجا ہو گا کہ اب غلبۂ اسلام کے بغیر عالم کا کوئی مستقبل نہیں۔

جہانِ نو کا ایک پہلو

جادو وہ جو سر چڑھ کر بولے۔ خود مغرب' جو اس دورِ جدید کا معمار ہے' اس حقیقت کو

اچھی طرح جانتا ہے کہ اس کا دور اب عالمِ پیری بن کر موت کے کنارے پہنچ چکا ہے' اور انسانیت ایک جہانِ نو کی تعمیر کے بغیر بچ نہیں سکتی۔ بڑے زور و شور سے ''نیو ورلڈ آرڈر'' (نئے عالمی نظام) کا نعرہ' مغرب کے اس اعتراف کے مترادف نہیں تو اور کیا ہے۔

۱۱ ستمبر' ۱۹۹۰ء کو امریکی کانگرس سے خطاب کرتے ہوئے امریکا کے صدر جارج بش نے کہا تھا: ''ہم آج ایک منفرد اور غیر معمولی تاریخی لمحے کی دہلیز پر کھڑے ہیں۔ خلیج کا بحران بلاشبہہ بہت خطرناک اور گمبھیر بحران ہے' لیکن اس کے ساتھ ساتھ یہ ایک نادر موقع بھی فراہم کر رہا ہے...... ان آفت زدہ ایام کے غبار سے ہمارا پانچواں مقصد برآمد ہو سکتا ہے ــــــ یعنی ایک نیا عالمی نظام......'' اور ۶ مارچ' ۱۹۹۱ء کو یک طرفہ خلیجی جنگ میں کامیابی کے فوراً بعد امریکا کے صدر بش نے دعویٰ کیا تھا: ''اب ہم ایک نئی دنیا کو اپنی آنکھوں کے سامنے اُبھرتا دیکھ رہے ہیں''۔ اگست ۱۹۹۰ء سے مارچ ۱۹۹۱ء تک' صدر جارج بش نے ۴۲ بار اپنے بیانات اور تقاریر میں پورے زور و شور سے اس جہانِ نو کی ''تعمیر'' کو مستقبل کی امریکی پالیسی کی اساس قرار دیا۔

مغرب اس نئی دنیا کی تعبیر بڑے خوش نما الفاظ میں کر رہا ہے۔ امریکی صدر کے الفاظ میں: ''ایک ایسا نیا دور' جو طاقت کے استعمال کے خطرات سے پاک ہو' جو انصاف کے قیام کے لیے قوی اور توانا ہو' اور جس میں امن و سلامتی کا حصول زیادہ ممکن ہو''۔ بظاہر تو مغربی لیڈر اور دانش ور کہتے ہیں کہ یہ نئی دنیا اس لیے ناگزیر ہو گئی ہے کہ یورپ نے اقوامِ عالم کے درمیان تعلقات کا جو نظام بنایا تھا' وہ ٹوٹ پھوٹ چکا ہے' نظریاتی کش مکش بھی ختم ہو چکی ہے' قومی ریاست بھی مائل بہ زوال ہے' کمیونزم بھی شکست کھا چکا ہے۔ ایٹمی اسلحہ اور عسکری طاقت کے استعمال کا رجحان بڑھ رہا ہے اور اس طرح امنِ عالم مسلسل تہ و بالا ہونے کے خطرے کی زد میں ہے۔

لیکن مغرب خوب جانتا ہے کہ اصل بات یہ نہیں' بلکہ انسان جہانِ نو کا ضرورت مند اس لیے ہے' کہ مغرب کی بے خدا تہذیب اور اس کی عالمی قیادت اندر سے کھوکھلی ہو چکی ہے' اور اس کی کوکھ سے اب انسان کے لیے دکھ' الم اور تباہی کے علاوہ اور کچھ برآمد ہونے والا

نہیں۔ اگر ۱۹۱۴ء سے امنِ عالم بار بار تہہ و بالا ہو رہا ہے' تو وہ بھی اسی تہذیب کی وجہ سے۔ چنانچہ اب انسان کو امن و انصاف حاصل ہو سکتا ہے تو صرف ایک ایسی تہذیب ہی سے جو خدائے واحد کی بندگی پر قائم ہو۔

ہفت روزہ اکانومسٹ کے الفاظ میں:

مستقبل میں اگر کوئی تاریخ ساز واقعہ رونما ہوگا' تو غالباً ان امور کے گرد جو غیب میں ہیں' اور جن کے علم بردار اسلامی بنیاد پرست ہیں۔[1]

اس لیے جہانِ نو کی تعمیر و قیادت کے لیے اصل کش مکش مغرب اور اسلام کی اس خدا پرستانہ تہذیب کے درمیان ہوگی' جو ہزار سال تک دنیا پر غالب رہی اور تہذیبوں کے اس تصادم میں مغرب کی عالمی قیادت داؤ پر لگی ہوگی۔ ہمیں اتفاق اس بات سے ہے کہ مغرب کی لبرل ڈیموکریسی کی تاریخ ختم ہونے پر آگئی ہے' لیکن اب تاریخ کا ایک نیا دور ہوگا' جو اسلام کا دور ہوگا۔

مغرب کے سیاست دان اور دانش ور مستقبل کے پردے میں پنہاں اس تہذیبی کش مکش کے امکان سے خوب آگاہ ہیں' اور اس کے لیے پوری تیاری کر رہے ہیں۔

مغربی ذہن کا خودساختہ خوف

ایک طرف اس کا اظہار بعض دانش وروں کی حالیہ کتابوں اور مضامین کے انتہاپسند عنوانات سے ہوتا ہے: • اسلام کی تلوار • اسلام کا خنجر • جارحیت پسند اسلام • اسلام کا غیظ و غضب • مسلمان آرہے ہیں • ساتویں صدی کے بعد اسلام پھر یلغار کر رہا ہے' وغیرہ وغیرہ

دوسری طرف سیاست دانوں اور لکھنے والوں کے اعلانات یہ ہیں:

۱- ہفت روزہ اکانومسٹ' لندن' ۶ اگست ۱۹۹۴ء

بخانن (Buchanan) لکھتا ہے:

ہزار سال تک، انسانیت کے مستقبل کے لیے کش مکش اسلام اور عیسائیت کے درمیان رہی ہے۔ اکیسویں صدی میں پھر یہی ہو سکتا ہے۔[۲]

مرفی (Murphy) کے الفاظ میں:

سرد جنگ کے بعد، اگر مسلم دنیا تصادم کی نئی سرحد بنتی جارہی ہے، تو بات یہ نہیں کہ ان سے کسی جنگ یا دہشت گردی کا خطرہ ہے، بلکہ ان کا چیلنج کہیں زیادہ بنیادی ہے۔ وہ روز بروز بڑھتی ہوئی سماجی اور سیاسی قوت ہیں، جو مغرب کے مسلمہ تصورات پر حملہ آور ہیں: مثلاً ترقی کے معنی، خدا اور انسان کا تعلق اور انسانی زندگی میں ٹکنالوجی، صنعت کاری اور اخلاق کا مقام۔[۳]

مشہور یہودی مستشرق برنارڈ لیوس (Lewis) کی رائے میں:

یہ اب واضح ہونا چاہیے کہ ہمیں ایک ایسی تحریک اور رویہ کا سامنا ہے، جو مسائل اور ان پر کاربند حکومتوں کے ساتھ اختلاف کی سطح سے آگے جا چکا ہے۔ اب تو تہذیبوں کے تصادم سے کم کوئی چیز سامنے نہیں! یہ ایک دیرینہ حریف کا تاریخی ردعمل ہے، ہمارے یہودی/عیسائی ماضی کے، ہمارے لادینی حال کے، اور دونوں کی عالمی توسیع کے خلاف۔[۴]

سیاست دان بھی کم صاف گو نہیں۔ سابق امریکی صدر، رچرڈ ایم نکسن [م: ۲۲ اپریل ۱۹۹۴ء] نے اپنے مضمون میں کہا تھا:

۲- نیو ہیمپ شائر سنڈے نیوز، ۲۰ اگست ۱۹۸۹ء

۳- لاس اینجلز ٹائم، ۲ اپریل ۱۹۹۲ء

۴- ماہنامہ دی اتلانٹک، اکتوبر ۱۹۹۱ء

روس اور امریکا کو اپنے تمام اختلافات کے باوجود اسلامی بنیاد پرستی کا مقابلہ کرنے کے لیے باہمی تعاون کرنا چاہیے۔[5]

سابق نائب صدر ڈان کوئیل نے اسلامی بنیاد پرستی کے خطرے کو نازی ازم اور کمیونزم کے خطرے کے برابر قرار دیا۔ سابق امریکی صدر [۸۹-۱۹۸۱ء] رونالڈ ریگن [م: ۱۷ جون ۲۰۰۴ء] نے اپنی خودنوشت میں لکھا ہے:

اسلامی بنیاد پرستی' جو لبرل سیکولر حکومتوں کی دشمن ہے' دراصل اسلامی نظام کی علم بردار ہے ـــــ وہ اپنے پیروکاروں کو یہ سکھاتی ہے کہ وہ مخالف قوتوں سے لڑتے ہوئے مارے گئے تو شہید ہوں گے' اور سیدھے باغ عدن میں جائیں گے ـــــ اگر اسلامی بنیاد پرستی کو عروج نصیب ہوگیا تو دنیا صدیوں پرانی رجعت پسندی سے دوچار ہو جائے گی۔ خصوصاً اگر ایٹمی اور کیمیائی اسلحہ ان مشتعل مزاج عناصر کے ہاتھ لگ گیا' اور انھوں نے اسے اپنے دشمنوں کے خلاف استعمال کرنا سیکھ لیا۔[6]

''نئے عالمی نظام'' کی حسین امریکی تصویر کے پیچھے اس کے اصل خدوخال بھی کوئی ڈھکے چھپے نہیں:

۱- دنیا کے تمام ملکوں کو تسلیم کرنا پڑے گا کہ امریکا دنیا کی واحد عالمی طاقت ہے۔ امریکا کا یہ ہدف ہوگا کہ وہ اپنے اس مقام کو برقرار رکھ سکے۔

۲- مغرب کے لبرل ڈیموکریسی اور منڈی کی معیشت جیسے تہذیبی تصورات کی حتمی فتح کے بعد' تاریخ نے اپنی منزل پالی ہے۔ اب دنیا کے ہر ملک کو انھی کو اختیار کرنا ہوگا۔

۵- فارن افیئرز' ۱۹۸۵ء

۶- رونالڈ ریگن: An American Life

۳۔ اب کسی بھی ملک کو، خصوصاً کسی مسلمان ملک کو، یہ موقع نہیں ملنا چاہیے کہ وہ بالاتر سیاسی قوت کی حیثیت سے اُبھر سکے۔

۴۔ تیسری دنیا میں، خصوصاً خلیج فارس میں، امریکی مفادات کا ہر قیمت پر تحفظ کیا جائے گا۔

۵۔ پوری دنیا میں احیائے اسلام کی تحریکوں کی مخالفت کی جائے گی۔

بظاہر وقت کا دھارا جس رخ پہ بہہ رہا ہے، اسے دیکھ کر یہ کہنے میں کوئی تعجب نہیں کہ آنے والی اکیسویں صدی کا نام ''امریکی صدی'' (American Century) رکھا جا رہا ہے۔ ایک برطانوی مقالہ نگار ڈیوڈ مارکوانڈ (Marquand) کے الفاظ میں: ''جس نئے عالمی نظام کی دھوم ہے، وہ صرف امریکی نظام (Pan American) ہی ہوتا نظر آ رہا ہے۔ (روزنامہ گارجین، لندن)۔ اور ایک امریکن مقالہ نگار بڑے فخر سے کہتا ہے: ''اس نظام میں امریکا کی حیثیت وہی ہوگی، جو قرونِ وسطیٰ کے جاگیردارانہ معاشرے میں بادشاہ کی ہوتی تھی'' (نیشنل ریویو)۔

مسلم دنیا کی حالت زار

بظاہر، اُمت مسلمہ اور مسلمان ملکوں کا ترقی یافتہ مغرب اور امریکا سے کیا مقابلہ! نہ عسکری قوت اور اسلحہ میں دونوں میں کوئی تناسب اور مقابلہ ہے، نہ دولت اور معیشت میں، نہ علم اور تحقیق میں، نہ سائنس اور ٹکنالوجی میں، نہ دنیا چلانے کی مہارت وصلاحیت میں۔ ہمارے اوپر ان کا غلبہ مکمل ہے۔ ہمارے حکمرانوں کو وہ اٹھاتے بٹھاتے ہیں، ہماری فوجیں اسلحہ کے لیے مکمل طور پر ان کی دستِ نگر ہیں۔ ہماری حکومتیں اور ان کے معاشی ترقی کے پروگرام ان کے قرضوں سے چلتے ہیں۔ معاشی ترقی کے تصورات اور ماڈل، اور اس کو جانچنے کے پیمانے بھی انھی کے بتائے ہوئے اصولوں پر چلتے ہیں، کیونکہ ہم نے ان سے قرض لیے ہیں۔ ہمارے بچے ان کی

وضع کردہ تعلیم حاصل کرتے ہیں' بلکہ بکثرت انھی کی زبان میں کرتے ہیں۔ ہمارا میڈیا ان کی فراہم کردہ خبریں اور پروگرام نشر کرتا ہے۔ ہمارے ادارے' دستور' پارلیمنٹ' بنک' مارکیٹ' کارخانے' اسکول' یونی ورسٹیاں' سب ان کے تصورات اور نقشے کے مطابق بنے ہیں۔ یہاں تک کہ پینے کے لیے ہر جگہ ان کے کوکا کولا' پیپسی کولا اور پہناوے میں جین کا ہی غلبہ ہے۔

دوسری طرف ہم اندر سے بے انتہا کمزور ہیں۔ دل مقصد' آرزو و جستجو' ذوقِ عمل اور نشاطِ کار سے خالی ہیں۔ اخلاق و کردار پست ہو چکے ہیں۔ اُمت کا جسد تفرقہ اور انتشار کا شکار ہے۔ سماجی بندھن ڈھیلے ہو رہے ہیں۔ رشوت اور بدعنوانی دیمک کی طرح چاٹ گئی ہے۔ ہم اپنا سیاسی نظام چلانے سے' اور بحسن و خوبی اپنے ملک کا انتظام و انصرام کرنے سے عاجز ہیں۔ ہمارے حکمران پیرتسمہ پا کی طرح ہماری گردنوں پر مسلط ہیں۔ نہ ہم ان کی گرفت سے اپنے کو چھڑا سکتے ہیں' نہ انھیں ہمارے علاوہ کوئی ملتا ہے' جس کے اوپر وہ اپنا شوق فرماں روائی پورا کریں۔ عام مسلمان عزت و شرف کے تحفظ سے' بنیادی حقوق سے' امن و چین سے محروم ہیں۔ ان کی' اللہ کی بخشی ہوئی' صلاحیتیں ضائع جا رہی ہیں۔

دیکھنا ہو تو اپنے ملک عزیز پاکستان ہی کو دیکھ لیجیے۔

نصف صدی سے ہمیں سیاسی استحکام نصیب نہیں۔ سیاسی لیڈر بالعموم نہ صرف نااہل ہیں' بلکہ بکاؤ مال بھی۔ ہماری فوجیں دشمن کو فتح کرنے کے بجائے اپنے ملک ہی کو مفتوح بناتی رہتی ہیں۔ ملک کا بال بال قرض میں جکڑا ہوا ہے۔ جو بچہ پیدا ہوتا ہے ۸۷ ہزار روپے کا مقروض ہوتا ہے' اور ملک کا ۴۲ فی صد بجٹ سود اور اصل چکانے کی نذر ہو جاتا ہے۔ فوج اور انتظامیہ کو ۳۶ اور ۱۱ فی صد دینے کے بعد' صرف گیارہ فی صد رقم قوم کی فلاح و بہبود کے لیے بچتی ہے۔ نظامِ تعلیم نے قوم کو دو حصوں میں بانٹ دیا ہے۔ دفتروں میں' اور عدالتوں میں عوام کے معاملات اس زبان میں نبٹائے جاتے ہیں جس کو وہ سمجھ ہی نہیں سکتے۔

تیسری طرف امریکا ہماری رہی سہی قوت کو ختم کرنے کے منصوبے کو عملی جامہ پہنانے

میں تیزی سے مشغول ہے۔ مشرق وسطیٰ کا بندوبست وہ کر چکا ہے۔ کیمپ ڈیوڈ کے ذریعہ مصر کا بندوبست کیا' ایران/عراق جنگ سے ایران کو کنارے لگایا' عراق کو کویت سے لڑایا' اسی بہانے سعودی عرب اور کویت کی دولت کو اپنے پاس رہن کرلیا۔ (۱۹۹۱ء کی خلیجی جنگ میں عربوں کے اخراجات کا اندازہ ۶۵۰ ارب ڈالر ہے) یاسر عرفات کو اسرائیل کے دوش بدوش کھڑا کیا۔ اب اُردن' شام اور دیگر عرب ممالک بھی یہی کرنے والے ہیں۔ ترکی پہلے ہی دام میں ہے۔ پاکستان کو بھی چارا ڈالا جاتا ہے۔ ایران اور سوڈان کے گرد بھی جال بُنا گیا۔ وسطی ایشیا کے مسلم ملکوں کو سنبھلنے ہی نہیں دیا جا رہا۔

کمزور اُمت سے خوف کیوں؟

جب اُمت مسلمہ کا حال اتنا زبوں ہے' تو پھر ہماری بربادی کے مشورے اتنے زوروشور سے ان کے ایوانوں میں کیوں ہیں؟

گربہ کشتن روزِ اوّل کی پالیسی بھی ایک وجہ ہے۔ لیکن جو خطرہ مغرب کے کارفرماؤں کو یقین دلا رہا ہے: مستقبل کا "فتنہ" فتنۂ اسلام ہے جس کی آج ہی سے سرکوبی ضروری ہے' اور اس کی محرک احیائے اسلام کی عالمی لہر ہے ___ دنیا کا ہر پانچواں آدمی مسلمان ہے' اور دنیا کے گوشے گوشے میں اسلامی تحریکات اس انبوہ عظیم کو اسی راستے کی طرف دوبارہ لے جا رہی ہیں' جس میں اس کی زندگی کا سامان ہے (دَعَاكُمْ لِمَا يُحْيِيكُمْ۔ الانفال ۸:۲۴) ___ وہ "خطرہ" خود مغرب کے قلب میں اُمت کی روز بروز بڑھتی ہوئی طاقت ہے۔

مغرب کے پنجے سے نکلنے کا راستہ کیسے بنے گا؟ بظاہر مغرب کا تسلط مکمل ہے اور ان کی چالیں کامیاب۔ لیکن مغرب کی کشتی خود بھنور میں پھنسی ہوئی ہے' اور مغرب کو اس کا پورا احساس ہے۔ وَمَكَرُوا وَمَكَرَ اللّٰهُ (انھوں نے اپنی تدبیریں کیں' اللہ نے اپنی۔ آل عمران ۳:۵۴) کا وعدہ پورا ہونے کا جب وقت آئے گا' تو ان شاء اللہ اسی بھنور میں سے جہانِ نو کی

پیدائش کا سامان ہوگا ؎

ہوائیں ان کی' فضائیں ان کی' سمندر ان کے' جہاز ان کے
گرہ بھنور کی کھلے تو کیوں کر؟ بھنور ہے تقدیر کا بہانہ

پہلا چیلنج

یہ ہے کہ کیا ہم آج کے ''منفرد اور غیر معمولی تاریخی لمحے'' کے چیلنج کا ادراک رکھتے ہیں' اور اس سے عہدہ برآ ہونے کی سعی کر رہے ہیں؟

ہماری رائے میں' اس چیلنج کے چند اہم پہلوؤں کا ذکر یہاں ضروری ہے۔

مسلم اُمت اور اسلامی تحریکات کے سامنے سب سے بڑا چیلنج یہ ہے' کہ وہ انسانوں کی زیادہ سے زیادہ تعداد کو' جو بحد استطاعت صالحیت و صلاحیت کے حامل ہوں' مستقبل کے لیے جدوجہد کی خاطر کھڑا کر دیں۔ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ کی نصرت و ہدایت کے بعد' کامیابی کے لیے سب سے زیادہ ضرورت انسانوں کی ہے۔ لیکن ہمارے خیال میں مسلمان اور اسلامی تحریکات انسانوں تک پہنچنے میں' ان کو اپنے ساتھ لے کر چلنے میں' ساتھ چلنے والوں کا تزکیہ اور ان کو باصلاحیت بنانے میں تاحال کامیاب نہیں ہوسکیں۔ وہ عام انسانوں کی تعلیم و تربیت کرنے اور ان میں شریعت کا بار اٹھانے کی استعداد پیدا کرنے میں' اُمت مسلمہ میں ہی سے نہیں ہر انسانی معاشرہ میں سے صلاح و خیر کی وہ آخری رمق حاصل کر لینے میں' جو ظلم و فساد ختم کر کے نظامِ حق و قسط قائم کرنے کے کام آسکے' اور دستیاب انسانی وسائل کا صحیح اور بھرپور استعمال کرنے میں کماحقہ' کامیاب نہیں ہیں۔ اس اہم ترین چیلنج کے بارے میں بہت کچھ سوچنا اور بہت کچھ کرنا ضروری ہے۔

اس چیلنج کا جواب دیے بغیر' حکمت عملی اور تدبیر کار کے بارے میں اکثر بحثیں ثانوی حیثیت رکھتی ہیں' گھوڑے کے آگے گاڑی باندھنے کے مترادف ہیں: انقلاب یا اصلاح' پہلے

معاشرہ یا پہلے سیاسی جدوجہد' انتخابات یا جدوجہد وغیرہ وغیرہ۔ جو حکمتِ عملی بھی اختیار کریں' انسان درکار ہوں گے' ان کا صحیح اور بھرپور استعمال ضروری ہوگا۔ ووٹ دینا ہوگا تو انسان دیں گے' سڑکوں پر آنا ہوگا تو انسان آئیں گے اور لڑنا ہوگا تو انسان لڑیں گے۔ کیونکہ ہم انسانوں کی مطلوبہ تعداد کو ساتھ لے کر چلنے میں کامیاب نہیں' اس لیے ان لاحاصل بحثوں سے دل بہلاتے رہتے ہیں۔ ایک دفعہ انسان فراہم ہو جائیں گے' تو جو تدبیر اختیار کریں گے اس کے لیے درکار دیگر وسائل بھی فراہم ہو جائیں گے۔ تدبیر وہی اختیار کرنا ہوگی جو زمانے میں رائج ہو' الا یہ کہ حکمِ الٰہی کے خلاف ہو' یا یہ کہ ہم اجتہاد سے نئی راہیں کھولیں۔

یہ تصور بھی صحیح نہیں کہ انبیا علیہم السلام کا کوئی لگا بندھا طریق کار رہا ہے۔ اگر کوئی لگا بندھا طریق کار رہا ہے' تو وہ بس دعوت و تبلیغ اور تعلیم و تزکیہ کے ذریعے لوگوں کے دل اور زندگی بدلنے اور جدوجہد کرنے کا رہا ہے۔ دعوت و تبلیغ' تعلیم و تزکیہ اور جدوجہد کے لیے موزوں تدابیر' وہ بھی اپنے حالات کے لحاظ سے اختیار کرتے رہے' ہم بھی کر سکتے ہیں۔

یہ تصور بھی صحیح نہیں کہ آج کوئی دور بالکل مکی یا مدنی دور کی طرح ہو سکتا ہے: ہر دور منفرد بھی ہوتا ہے' اور متشابہ بھی۔ یہ انسانی عقل کا امتحان ہے کہ وہ اپنے دور کو سمجھے' اپنے معاشرے کو سمجھے' اور قرآن مجید' اسوۂ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم اور اسوۂ انبیا علیہم السلام کی روشنی میں اپنے لیے راہِ عمل متعین کرے' لیکن ہر راہِ عمل کا مقصد انسانوں کو جمع کرنا' ان کو قوت بنانا اور ان کے ذریعہ جدوجہد کرنا ہی ہونا چاہیے۔

انسانوں کو ساتھ لینا ہو تو چند اصول ملحوظ رکھنا ناگزیر ہے:

۱- یہ یقین ضروری ہے کہ ہر انسان بدل سکتا ہے' ہر بدکار' نیکوکار بن سکتا ہے' ہر کافر مسلمان ہو سکتا ہے' ہر مخالف ساتھ آ سکتا ہے۔ جب تک کوئی' اتمامِ حجت ہونے کے بعد (جس کا تعین کرنا بہت مشکل ہے) انکار نہ کر دے' اس کی اصلاح سے مایوس ہونا جائز نہیں۔

۲- یہ کہ ہر انسان کو خالق نے اپنے ہاتھ سے بنایا ہے' اس میں روح پھونکی ہے' اس کے اندر بے پناہ صلاحیتیں اور ترقی کے بے پناہ امکانات رکھے ہیں۔ انسان کو حقیر نہ سمجھنا' اس کی کمزوریوں سے زیادہ اس کی خوبیوں پر نظر رکھنا' اس کی قدر کرنا' یہ اس راہ میں مطلوب ہے۔

۳- یہ کہ جو انسان بدلیں گے اور ساتھ آئیں گے' وہ کبھی سرتاپا ہمارے کلاسیکی پیمانوں پر پورا نہیں اتریں گے' نہ وہ ہماری ساری توقعات ہی پوری کریں گے۔ جو مزاج اور خیال کا اختلاف برداشت نہیں کرسکتے' یا انسانوں کے ضعف' کوتاہیوں' گناہوں اور لغزشوں کا سامنا کرنے کے لیے تیار نہیں' ان کے لیے انسانوں کو ساتھ لے کر چلنا بہت مشکل ہے۔ انسان سب ایک خیال کے نہیں ہوسکتے' سب کسی ایک معیار پر پورے نہیں اترسکتے۔ جو جتنا آئے' جتنا کرے' اسے قبول کرکے اس کو بہتر سے بہتر بنانا ہی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا اسوہ رہا ہے۔

۴- یہ کہ انسان کی زندگی کی کنجی اس کا دل ہے۔ دل کے قفل کھل جائیں گے' اصلاح کے راستے کھل جائیں گے۔ دل دیکھنے لگے گا' آنکھیں دیکھنے لگیں گی۔ دل کا مرض شفایاب ہوگا' اخلاق واعمال اور معاشرے صحت مند ہوجائیں گے۔

۵- یہ کہ بہت تھوڑے انسانوں کے دل نظریہ' تقریر' یا کتاب سے جیتے اور فتح کیے جاسکتے ہیں۔ اصل فاتح عالم محبّت ہے' دل کی نرمی ہے' گفتگو کرنے کی شیرینی ہے' اخلاق کا حُسن و جمال ہے' فیاضی اور سخاوت ہے' عفوو درگزر ہے' غصہ' حسد اور کینہ وغیرہ سے پاک دل ہے۔

انسانوں کو ساتھ لینے اور ساتھ رکھنے کے لیے دین کے چند اور بنیادی اصول سیکھ کر ان پر کاربند رہنا بھی ضروری ہے۔ دین یسر ہے: آسان دین کو مشکل اور تنگ نہ بنانا' طبیعتوں کو دین کی طرف مائل کرنا' متنفر نہ کرنا' ضعیف انسان کے اُوپر بوجھ ہلکے کرنا' اس پر استعداد

سے زیادہ بوجھ نہ رکھنا' مطالبات دین پیش کرنے میں تدریج اختیار کرنا' غلو' تشدد اور تعمق سے اجتناب کرنا کہ ان سے انحراف پیدا ہوتا ہے ــــ یہ تیسیر دین کے چند پہلو ہیں۔ اعمال کو ان کے اصل مدارج پر قائم رکھنا' فرض کو فرض کی جگہ اور مباح کو مباح کی جگہ رکھنا۔ مباح اور حلال کو حرام نہ کرنا' نفل کو فرض کا درجہ نہ دینا' اپنے اجتہاد کو اور فہم کو منشاے الٰہی یا نصوص کا درجہ نہ دینا' ایک کام کرنے کے دو طریقے ہوں تو آسان طریقہ اختیار کرنا ــــ یہ بھی اس زمرے میں آتے ہیں۔

وسیع پیمانے پر عامۃ المسلمین کی دینی اور اخلاقی تعلیم اور تربیت کے بغیر معاشرے میں یہ استعداد نہ پیدا ہوگی کہ اس پر احکامِ الٰہی نافذ کیے جاسکیں' اور نہ عام لوگ دین کی نصرت میں اپنا حصہ ڈالنے کے لیے آگے بڑھیں گے۔ چنانچہ اس تعلیم و تربیت کے لیے کثرت سے مؤثر اقدامات کرنا ضروری ہیں۔

دوسرا چیلنج

یہ کہ ہمیں مستقبل اپنا بنانے کے لیے' اس انتہائی تیز رفتاری سے بدلتے ہوئے زمانے پر اپنی گرفت قائم کرنا ہے۔ اس تبدیلی کی باگ ڈور بھی ہمارے ہاتھ میں نہیں' مغرب کے ہاتھ میں ہے۔ جیٹ' ڈش انٹینا' کیبل اور انٹرنیٹ کے ذریعے روز بروز سکڑتے ہوئے فاصلوں کی دنیا میں' ہر تبدیلی ــــ وہ ٹکنالوجی کی ہو' فکر و اخلاق کی ہو' فیشن کی ہو ــــ آناً فاناً دنیا کے ایک کونے سے دوسرے کونے تک پھیل جاتی ہے۔ ہر تبدیلی کے آگے بند باندھنا بہت مشکل ہے' مگر ان کی جہت بدلی جاسکتی ہے۔ ان حالات میں زمانے کی باگ ہاتھ میں لینا اور مستقبل کی نقشہ گری کرنا ہر پہلو سے زبردست مجتہدانہ صلاحیت کا تقاضا کرتا ہے۔ ایسی مجتہدانہ صلاحیت کے بغیر نہ ایک تہذیبِ نو کی تعمیر ہوسکتی ہے' نہ امامتِ عالم حاصل ہوسکتی ہے۔

تیسرا چیلنج

یہ چیلنج عورت اور نوجوان کے حوالے سے ہے۔

ان تبدیلیوں سے دونوں سب سے بڑھ کر متاثر ہو رہے ہیں۔ عورت مستقبل کا ہراول دستہ ہے' وہی ہمارے دین کی آخری پناہ گاہ ہے' وہ ہماری اُمت کا نصف حصّہ بھی ہے۔ اس کو دین کی حدود میں' معاشرے میں اس کا صحیح مقام دیے بغیر' کیا ہم صرف ایک پہیہ سے مستقبل کی منزل پر پہنچ سکتے ہیں؟

یہی معاملہ نوجوانوں کا ہے' جو فطرتاً ہر نئی چیز کو قبول کرنے کے لیے آمادہ رہتے ہیں۔ جس کے بن جائیں' اس کے لیے سر دھڑ کی بازی لگا دیتے ہیں' آسمان سے تارے نوچ لاتے ہیں' پاتال میں اُتر جاتے ہیں۔ خوش قسمتی سے اُمت مسلمہ میں ۳۰ سال سے کم عمر کے نوجوان ۶۰ فی صد ہیں' جب کہ ۱۶ سال سے کم عمر بچوں کی تعداد ۵۰ فی صد ہے۔

چوتھا چیلنج

یہ چیلنج مغرب میں اسلام اور مسلمان کا ہے' مغرب کے اندر سے صلاح و خیر کی تمام ممکن قوتوں کو جمع کر کے ان کا وزن اسلام کے پلڑے میں ڈالنے کا ہے۔

مستقبل میں اسلام اور مغرب کی اصل جنگ' زمینی سرحدوں پر علاقے جیتنے سے پہلے' انسانی سرحدوں پر دل اور دماغ جیتنے کے لیے ہوگی۔ اس جنگ میں کامیابی ہی پر آنے والے معرکوں کے نتائج کا انحصار ہوگا۔ مغربی تہذیب کے اگلے مورچے عرصے سے مسلم دنیا کے قلب میں یعنی جکارتا' کراچی' ریاض سے لے کر رباط تک قائم ہیں۔ خوش آیند بات یہ ہے کہ گذشتہ نصف صدی میں اب اسلام کی آخری سرحد بھی ایک دفعہ پھر عین مغرب کے قلب میں پہنچ گئی ہے۔ مشرقی یورپ میں مسلمانوں کی بڑی آبادیاں موجود تھیں' لیکن اب لندن سے لے کر لاس اینجلز تک بھی ان کی بڑی بڑی آبادیاں وجود میں آچکی ہیں۔ کئی ممالک میں اسلام دوسرا بڑا

مذہب بن گیا ہے یا بننے والا ہے۔ اسپین میں مسلمانوں کی آمد کے بعد اور پھر مشرقی یورپ میں عثمانی خلافت کے بعد' چودہ سو سال میں یہ تیسرا تاریخی لمحہ ہے' جو اسلام کو مغرب تک پہنچانے کے بھرپور امکانات کا حامل ہے۔

اگرچہ اب مسلمانوں کی پشت پر اسپین کی خیرہ کن تہذیب نہیں' عثمانیوں کی لرزہ براندام کرنے والی فوجی و بحری قوت بھی نہیں' لیکن وہ غیر مسلم سوسائٹی کی غالب اکثریت کے پڑوسی ہیں' ان کے ساتھ پڑھتے اور پڑھاتے ہیں' کام کاج اور کاروبار کرتے ہیں' جو شہری ہیں وہ ووٹ بھی دیتے ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ وہ وہاں اسلام کے سفیر بن کر نہیں گئے' نہ اچھے سفیر کے فرائض انجام دے رہے ہیں۔ لیکن کوئی تصور نہ کر سکتا تھا کہ نصف صدی میں برطانیہ' امریکا اور یورپ میں بے شمار مساجد موجود ہوں گی' تعلیم قرآن کے مدارس ہوں گے' بعض مقامات پر سڑکوں پر اذان بھی سنی جاسکے گی' اور بے شمار حلقوں کے انتخابات میں ان کا ووٹ فیصلہ کن بن جائے گا۔ یہ صرف مشیتِ الٰہی ہی سے ممکن ہوا ہے۔

مغربی مسلمانوں کا چیلنج

مغرب کے مسلمان اکثر باہر سے آئے ہیں' لیکن اب خود اندر سے مقامی لوگوں کے ملت اسلامیہ میں شامل ہونے کی رفتار برابر بڑھ رہی ہے۔ ان میں عام لوگ بھی ہیں اور نمایاں شخصیتیں بھی' مرد بھی ہیں اور ان سے دگنی تعداد میں عورتیں بھی (اس پروپیگنڈہ کے باوجود کہ اسلام عورت کو پست مقام دیتا ہے اور گھر اور حجاب میں قید کر دیتا ہے)۔

مسلمانوں کی اس بڑھتی ہوئی تعداد نے اہلِ مغرب کو' تہذیب و رواداری' انصاف و حریت' اور انسان دوستی کے سارے نقاب چاک کر کے اصل چہرہ دکھانے پر مجبور کر دیا ہے۔ برطانوی وزیر داخلہ کا اصرار ہے کہ مسلمان' بائبل' اور شیکسپیئر [م: ۱۶۱۶ء۔ برطانوی ڈراما نگار] کو بھی اپنائیں۔ فرانسیسی وزیر داخلہ' طالبات کو اسکولوں میں سر پر اسکارف باندھنے کی اجازت

دینے کے لیے تیار نہیں ہے[۷] برطانیہ میں مسلمان طالبات کو شلوار پہننے کی اجازت دینے پر اسکولوں کے باہر مظاہرے ہوتے ہیں' مسجدوں میں سور کے سر بھی پھینکے جاتے ہیں۔ جرمنی میں مسلمانوں کو گھروں میں زندہ جلا دیا جاتا ہے۔ بوسنیا [کوسووا' چیچنیا] کا حشر بھی سامنے ہے۔

یہ ایک تاریخی موقع ہے' اور اُمت مسلمہ کو اپنی اس آخری سرحد پر' جو مغرب کے قلب میں واقع ہے' دلوں اور دماغوں کے لیے برپا جنگ جیتنے' تعصب اور نفرت کی دیواریں ڈھانے اور قرآن اور نبوت کا پیغام پھیلانے کے لیے تمام ممکن اقدامات کرنے کے منصوبے بنانے چاہییں۔ اکثر لوگ اسلام سے ناواقف ہیں اور یہی تعصب و نفرت کی بڑی وجہ ہے ___ ان کی ناواقفیت دُور کرنے کے لیے ہر ممکن کوشش کرنا چاہیے۔ لوگوں کے ذہنوں میں جو غلط تصاویر بٹھا دی گئی ہیں' ان کو صاف کرنا چاہیے۔

یہی معاملہ بھارت' چین' جاپان اور دیگر ممالک کا ہے' جہاں مسلمان بڑی تعداد میں موجود ہیں' یا جہاں اسلام سے صرف ناواقفیت ہے۔ تعصب' نفرت اور دشمنی نہیں۔ یہاں بھی اگر اسلام کا پیغام پہنچے گا' تو ممکن نہیں کہ دلوں کو مسخر نہ کرے۔

جو ممالک مسلمانوں اور اسلام سے نبرد آزما ہیں' ان کے بارے میں بہت سوچ سمجھ کر مناسب حکمت عملی اختیار کرنے کی ضرورت ہے۔ عداوت کا دائرہ پھیلنے نہ پائے: حکومت اور ملک' حکمرانوں اور عوام کے درمیان امتیاز رکھا جائے۔ خود ان ممالک کی رائے عامہ کو اپنے حکمرانوں کے خلاف کھڑا کیا جائے۔ جب تک ہم معرکہ جیتنے کی پوزیشن میں نہ ہوں' معرکہ برپا نہ کیا جائے' نہ مقابلے میں غیر مطلوب شدت پیدا کی جائے۔ ہمارے اہداف ہماری نظروں میں واضح ہوں' اور ہم صبر سے ان کے لیے کام کرتے رہیں' جذبات میں اِدھر اُدھر نہ نکل جائیں۔

۷- جولائی ۲۰۰۲ء میں جرمنی کی اعلیٰ ترین وفاقی عدالت نے سرکاری اسکولوں کی خاتون اساتذہ سے سر پر اسکارف پہننے کا اختیار سلب کر لیا (اے ایف پی/ نوائے وقت' ۶ جولائی ۲۰۰۲ء) دوسری جانب ۲۰۰۳ء میں فرانس نے قانون سازی کر کے مسلم طالبات کو اسکارف لینے سے روک دیا۔

مستقبل' اسلام کا

جو تھا نہیں ہے' جو ہے نہ ہوگا' یہی ہے اک حرفِ محرمانہ
قریب تر ہے نمود جس کی' اسی کا مشتاق ہے زمانہ

مستقبل یقیناً اسلام کا ہے' اور ہم بلاشبہہ آج "ایک منفرد اور غیرمعمولی تاریخی لمحے کی دہلیز پر کھڑے ہیں"۔ لیکن تقدیر کے اس فیصلے نے اُمت مسلمہ اور اسلامی تحریکات کو ایک عظیم امتحان سے دوچار کر دیا ہے۔ اس لیے کہ مستقبل' من وسلویٰ کی طرح' کسی قوم کی گود میں نہیں ٹپک پڑتا۔ ارادے اور اس جدوجہد سے حاصل ہوتا ہے' جو ایمان ویقین' عزم وجزم' حکمت و تدبر' کردار وعمل اور ہمت وحوصلہ سے کی جائے۔

اس جدوجہد کے لیے قوت کا سرچشمہ اعتصام باللہ کے سوا کچھ نہیں۔ ضروری ہے کہ جدوجہد کرنے والے اپنے اندر' جتنی ممکن ہو' گہری للّٰہیت پیدا کریں: وہ جو کام کریں صرف اللہ کے لیے کریں' اُٹھتے بیٹھتے اللہ کو یاد رکھیں' ان کے دل اللہ اور رسولؐ کی محبّت سے سرشار ہوں' ان کے ہر حکم پر لبیک کہیں' وہ دل و جان سے ان کے وفادار ہوں' صرف اللہ کو فاعل حقیقی اور کارساز سمجھیں' اور ہر وقت اس سے ملاقات کی تیاری کرتے رہیں اور اسی کی خاطر' مسلمانوں سے محبت کریں' ان کے حقوق ملحوظ رکھیں' اور آپس میں بنیان مرصوص بن جائیں۔

اتنا ہی ضروری یہ بھی ہے کہ وہ وسیع پیمانے پر اُمت مسلمہ اور ساری انسانیت کے اندر بھی گہری للّٰہیت پیدا کرنے کو اپنا کام سمجھیں۔ ان کو صحیح تعلیم دیں' ان کا تعلق اللہ کے ساتھ جوڑا جائے۔ ان کے دلوں میں اللہ اور اس کے رسولؐ کی محبّت پیدا کریں۔ انھیں اطاعت الٰہی کے لیے تیار کریں۔ ان کے دلوں میں اللہ کی طرف بھاگنے کی تڑپ پیدا کریں' اور جس جنت کی وسعت میں زمین وآسمان سما جائیں اسی کی طرف دوڑ بھاگ اور مسابقت کا جذبہ غالب کریں۔

جنت کے راہی

جنت اگر مطلوب ہے' تو جنت کی وسعت کے لحاظ ہی سے' دلوں میں وسعت' خیالات میں وسعت' نگاہوں میں وسعت' مقاصد میں وسعت' رویوں میں وسعت' اور اللہ کے لیے زیادہ سے زیادہ لٹانے اور مٹانے میں وسعت ___ یہ وسعت دُنیا اور آخرت میں اپنے مقصود کے حصول کے لیے ناگزیر ہے' جدوجہد کرنے والوں میں بھی' تمام مسلمانوں میں بھی۔

آج دنیا میں ہر پانچواں آدمی مسلمان ہے۔ ہم بہترین انسانی اور مادی ذخائر کے مالک ہیں۔ ہمیں اللہ تعالیٰ نے بہترین دل و دماغ اور صلاحیتیں بخشی ہیں' ہماری زمینیں سونا اُگلتی ہیں' اور ہر قسم کی معدنیات سے مالا مال ہیں۔ تمام بری اور بحری راستے ہمارے علاقوں سے گزرتے ہیں۔ ایک دفعہ اگر اس اُمت کے جسد میں نبوت محمدیؐ کے مشن کی روح پیدا ہو جائے' تو وہ انسانیت کو اپنے لیے منتظر پائے گی۔ مگر اُمت کا حال یہ ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا نام زبان پر ہے' دل اور زندگیاں ان سے وفاداری سے خالی ہیں۔ انسانیت کی غالب اکثریت نے تو یہ نام سنا ہی نہیں' یا سنا ہے تو سننے کا حق نہیں ادا ہوا ہے۔ بقول اقبال' مسلمان کا راستہ بالکل واضح ہے ؎

بے خبر! تو جوہرِ آئینہ ایام ہے
تو زمانے میں خدا کا آخری پیغام ہے
قوت عشق سے ہر پست کو بالا کر دے
دہر میں اسمِ محمدؐ سے اُجالا کر دے
کی محمدؐ سے وفا تو نے تو ہم تیرے ہیں
یہ جہاں چیز ہے کیا لوح و قلم تیرے ہیں

ان شاء اللہ العزیز اس کا وعدہ علو و استخلاف پورا ہو کر رہے گا۔

اقول قولی هذا وافوض امری الی الله

[جنوری ۱۹۹۴ء]

□□□

اشاریہ

القرآن الکریم

خرم مراد (۱۹۳۲ء — ۱۹۹۶ء) عالم اسلام کے معروف دانش وراور تحریک اسلامی کے ایک ممتاز رہنما تھے۔ ۱۹۵۳ء میں انھوں نے این ای ڈی انجینئر نگ کالج، کراچی سے سول انجینئر نگ میں بی ای، اور ۱۹۵۸ء میں یونی ورسٹی آف مینی سوٹا، امریکا سے ایم ایس کی ڈگریاں اعلیٰ اعزاز کے ساتھ حاصل کیں۔ بعد ازاں ۱۹۵۵ء تا ۱۹۵۷ء این ای ڈی انجینئر نگ کالج میں لیکچرار رہے۔ وہ ملک کے ایک ممتاز انجینئر تھے، اور مشہور مشاورتی فرم، ایسوسی ایٹڈ کنسلٹنگ انجینئر ز (ACE) میں بطور چیف انجینئر اور ڈائریکٹر ڈھاکہ، ایران اور سعودی عرب میں پیشہ ورانہ خدمات انجام دیتے رہے۔ اس ضمن میں انھوں نے برق و آب کے بڑے منصوبوں کے علاوہ، مکہ مکرمہ میں مسجد حرام کی تعمیر نو میں حصہ لیا۔

سعودی عرب سے برطانیہ منتقل ہونے کے بعد ۱۹۷۷ء سے ۱۹۸۷ء تک وہ معروف علمی و تحقیقی ادارے دی اسلامک فاؤنڈیشن کے ڈائریکٹر جنرل کے طور پر خدمات انجام دیتے رہے۔ ان کی رہنمائی میں علمی ریسرچ کے کئی منصوبوں کے علاوہ ۱۰۰ سے زیادہ کتابوں کی اشاعت کا کام ہوا۔ اردو میں ان کی ۱۱۷ اور انگریزی میں ۴۰ چھوٹی بڑی کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ وہ برطانیہ سے شائع ہونے والے سہ ماہی جریدے دی مسلم ورلڈ بک ریویو اور ماہنامہ ترجمان القرآن، لاہور کے ایڈیٹر بھی رہے۔